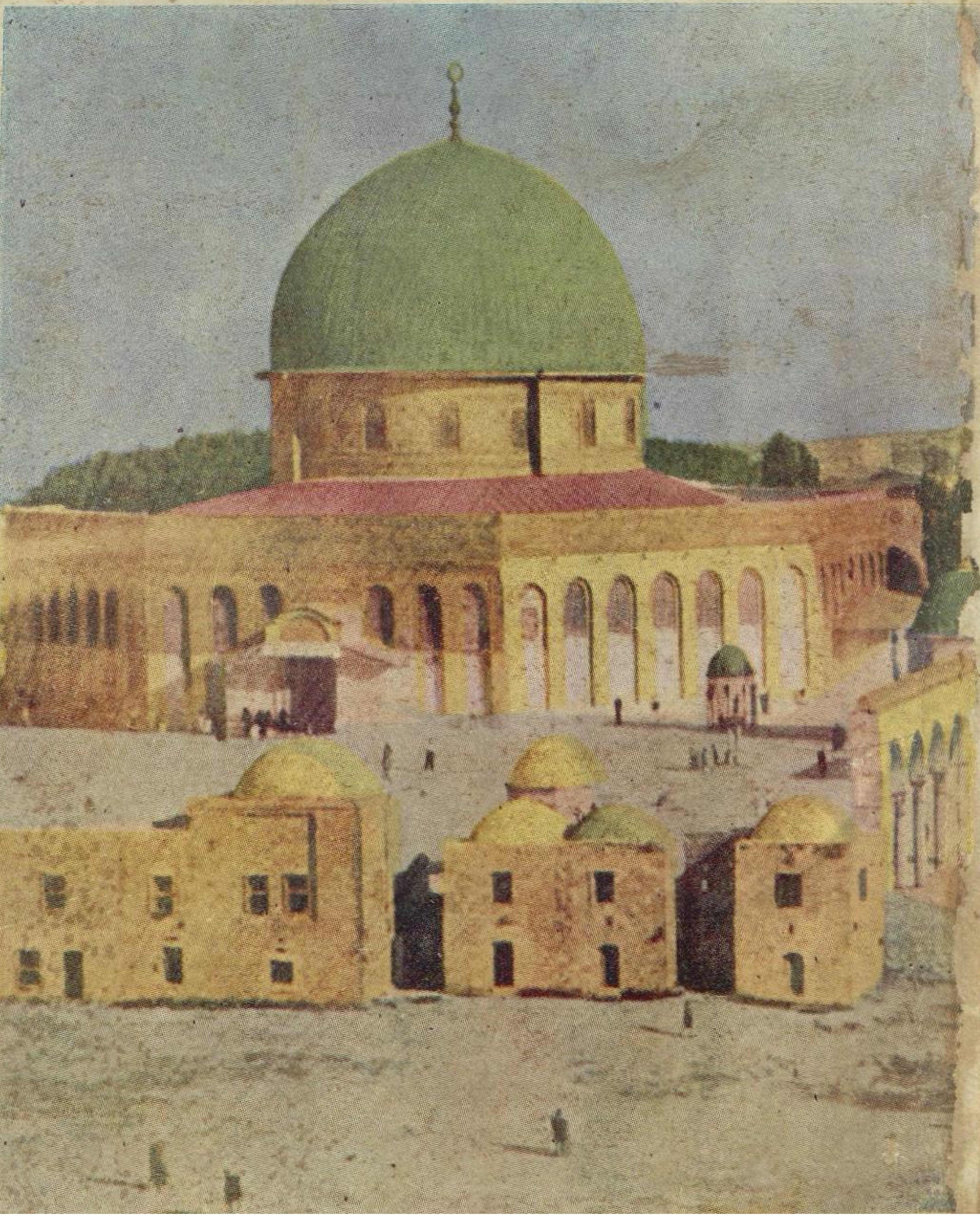
جامعہ

فلسطین نمبر

اکتوبر --- نومبر

۱۹۶۷ء



محکمہ تعلیم سے بحوالہ M.NO: 10883/G-31-3-53 سکولوں اور کالجوں کیلئے منظور شدہ

پاکستان میں اسلامی نظامِ تعلیم کا اوّلین ترجمان

تعلیمی، معیشی اور عمرانی مسائل کا آئینہ دار

(قلمی تحریر: جناب آغا شورش کاشمیری کی خدمت عالیہ میں)

الجامعہ

جلد ۱۹ — شمارہ ۱۰، ۱۱

اکتوبر، نومبر ۱۹۶۷ء — رجب، شعبان ۱۳۸۷ھ

قضیۂ فلسطین پر خصوصی اشاعت

نگران: مولانا محمد ذاکر — مدیر: ممتاز لیاقت

ناشر: مخدوم عبدالحق صادق جامعی — طابع: ثنائی برقی پریس، سرگودھا

سالانہ چندہ	قیمت اشاعت خاصی	قیمت فی پرچہ
۶ روپے	۳ روپے	آٹھ آنے

مقامِ اشاعت

دفتر: جامعہ محمدی شریف ضلع جھنگ (پاکستان)

"ہم بیت المقدس کو اسرائیل کے حوالے نہیں کر سکتے، ہم جان دیدیں گے۔ لیکن بیت المقدس سے دستبردار نہیں ہوں گے، ہمیں اس متبرک شہر کا ایک ایک ذرہ عزیز ہے اور ہم اپنے محبوب وطن کے ایک چپہ سے بھی دستبردار نہ ہونے کا عہد کر چکے ہیں۔ بیت المقدس تمام عربوں اور مسلمانوں کے لئے ایک مقدس شہر ہے۔ صدیوں سے عرب اس مقدس شہر کی حفاظت کرتے آئے ہیں اور ہم اس کے محافظ رہنے کے لیئے اپنی جانیں قربان کرنے سے دریغ نہیں کریں گے۔ گذشتہ ماہ جون کی جنگ میں عربوں کو جس ناکامی کا سامنا کرنا پڑا وہ عارضی ہے اور یہ جنگ ایک درخشاں مستقبل کے لیئے ہماری طویل جدوجہد کا آغاز تھی عرب عوام صبر و تحمل کے ساتھ اس وقت کا انتظار کر رہے ہیں جب ان کی نجات کا راستہ کھلے گا ..... عرب ممالک ماضی کی غلطیوں کا جائزہ لیں تاکہ آئندہ ان غلطیوں سے بچ سکیں۔ دنیا کے تمام عرب اور مسلم عوام فلسطین میں حق و انصاف کا پرچم بلند کرنے کے لیئے متحد ہو کر ایک دوسرے سے پر خلوص تعاون کریں۔ ہم تمام عربوں اور مسلمانوں کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں اور ان سے تعاون کی درخواست کرتے ہیں۔"

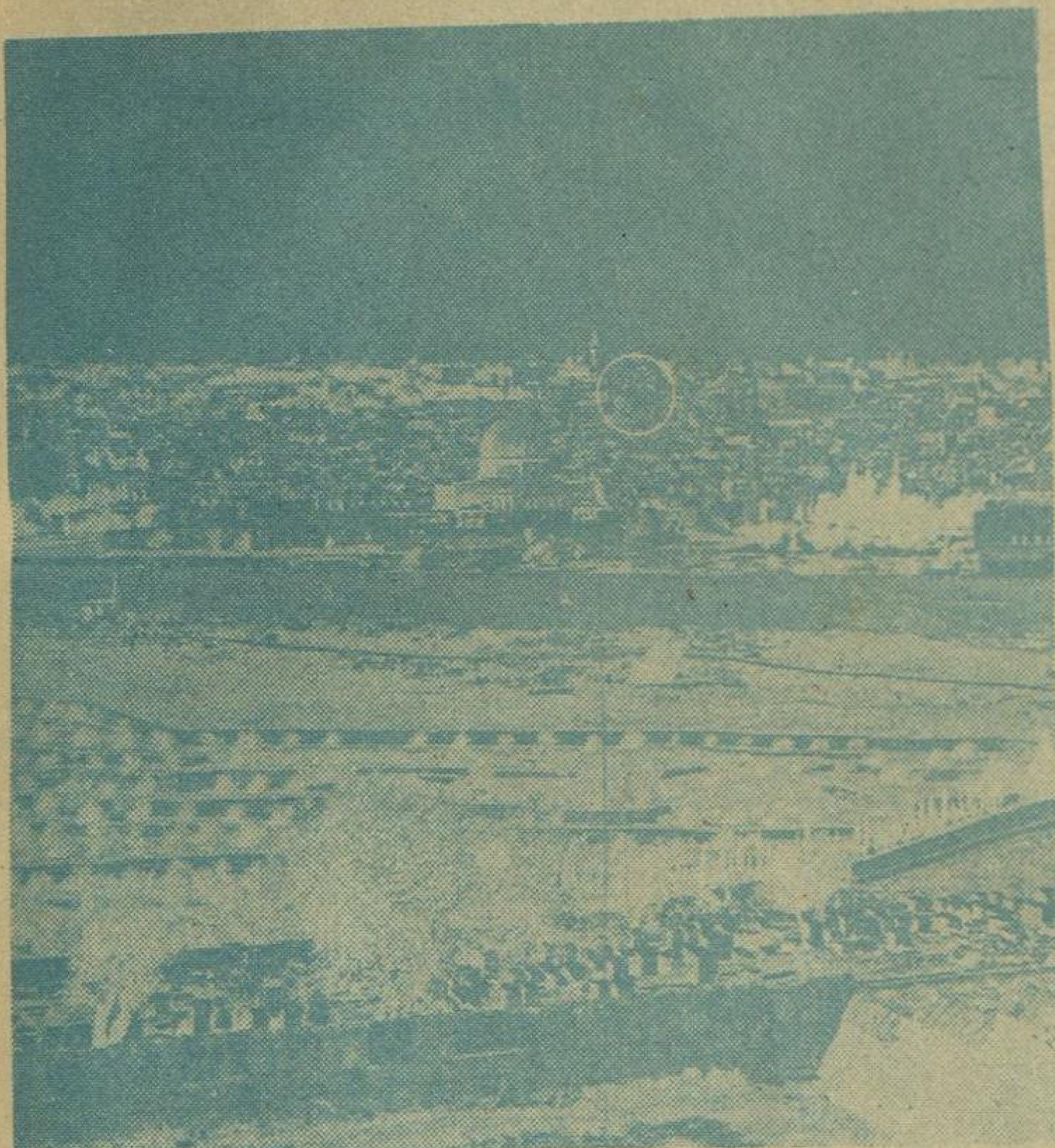
شاہ حسین والئ اردن

ترتیب

منظومات



دنیائے اسلام کا قبلہ اوّل **مسجد اقصیٰ** جس کے در و دیوار آج پھر کسی صلاح الدینؒ کے منتظر ہیں



شہر انبیاء

بیت المقدس کا

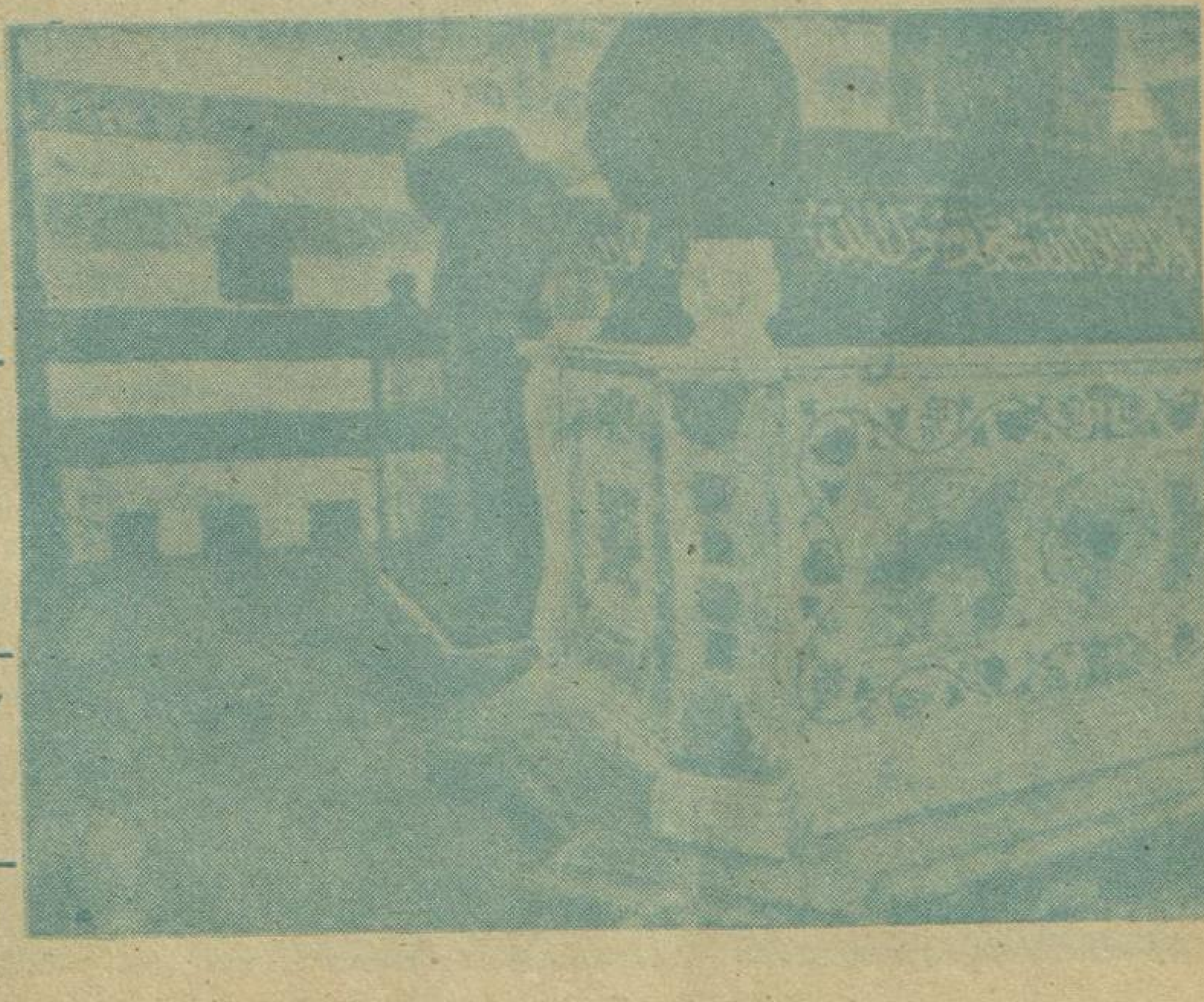
ایک عام منظر

گول دائرہ

میں

مسجدِ اقصیٰ کا

گنبد ہے

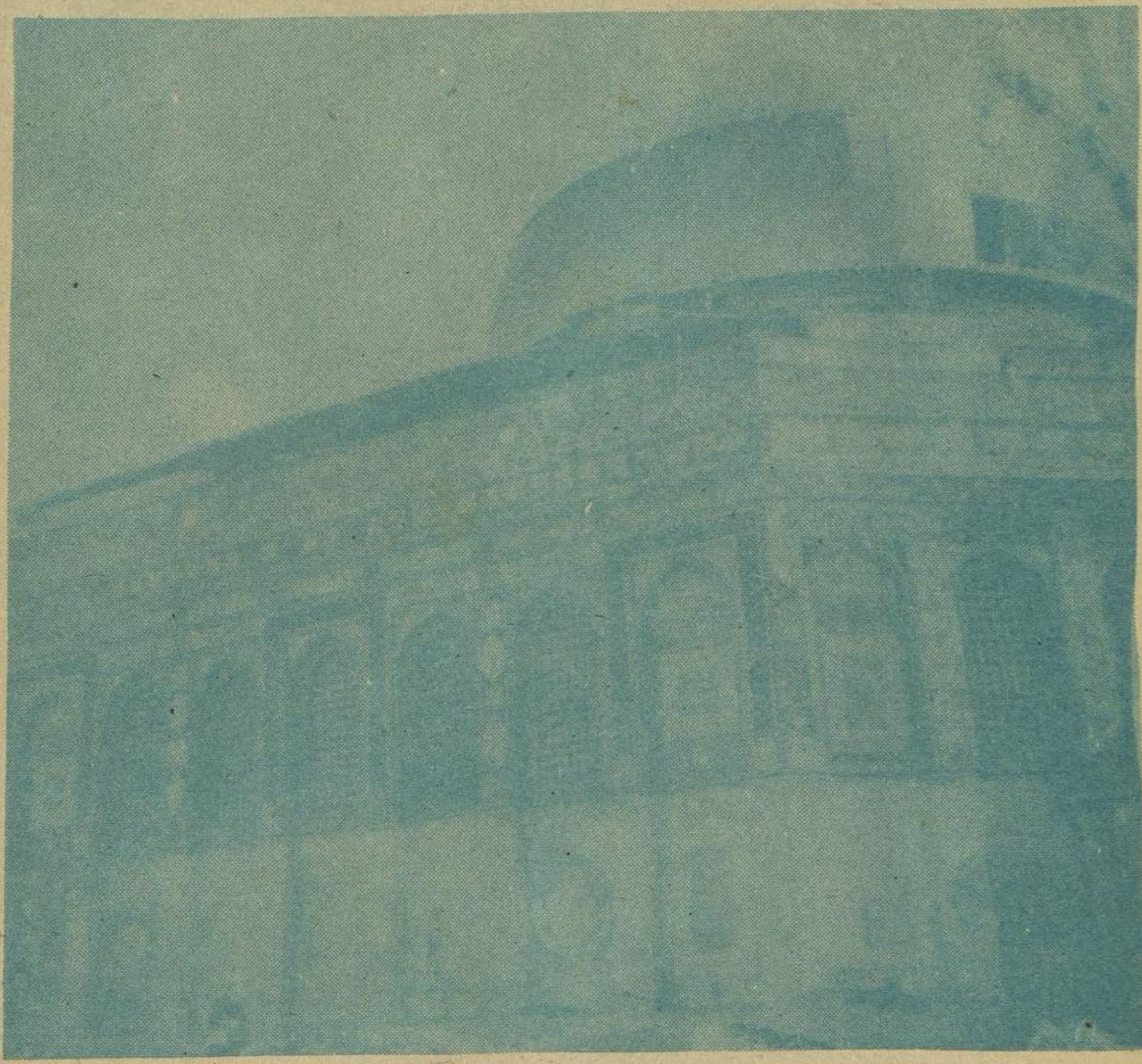


فاتح بیت المقدس

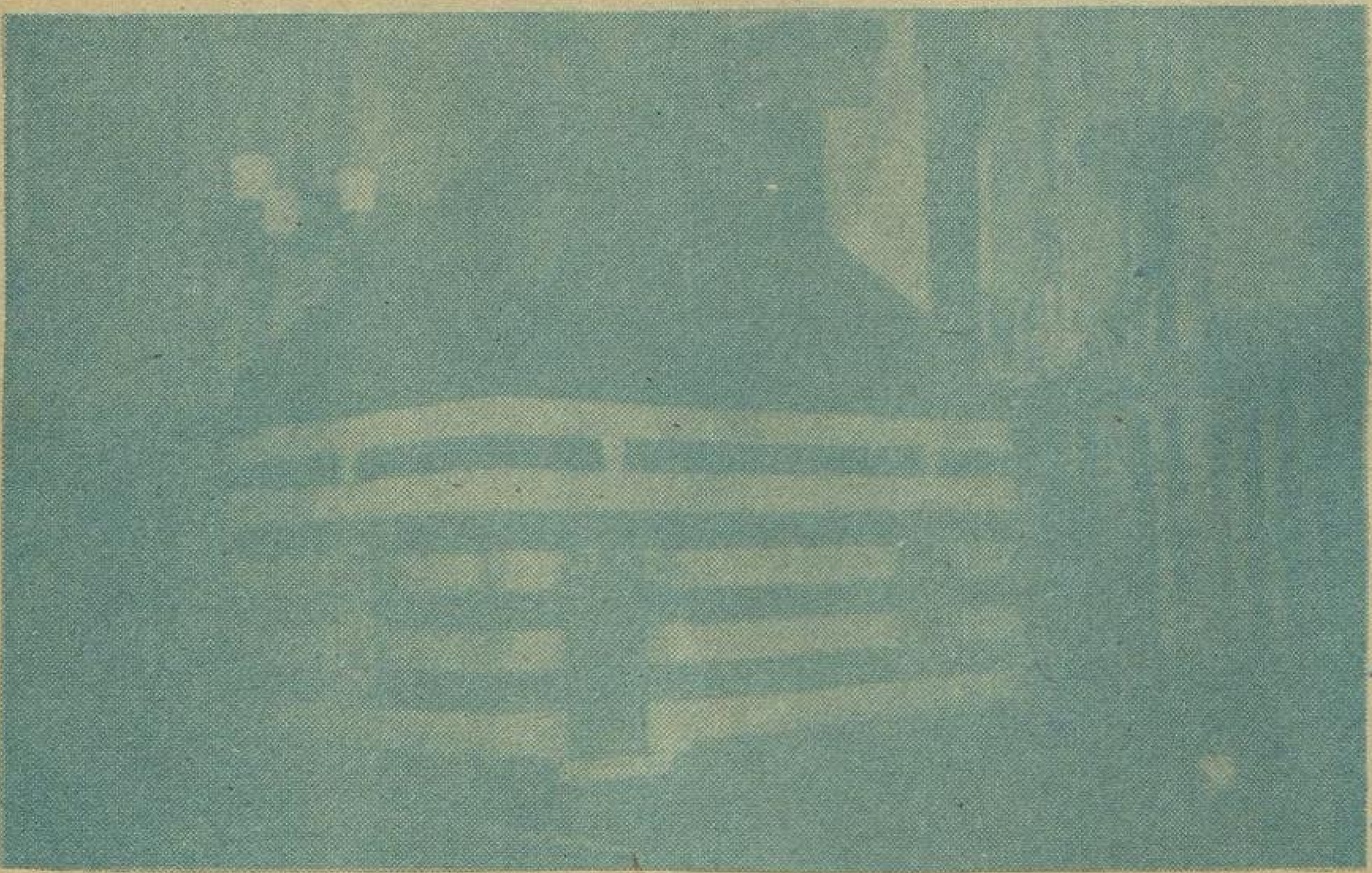
غازی صلاح الدین

ایوبی رح

کی آخری آرامگاہ



مسجد صخرہ کا ایک اندرونی منظر



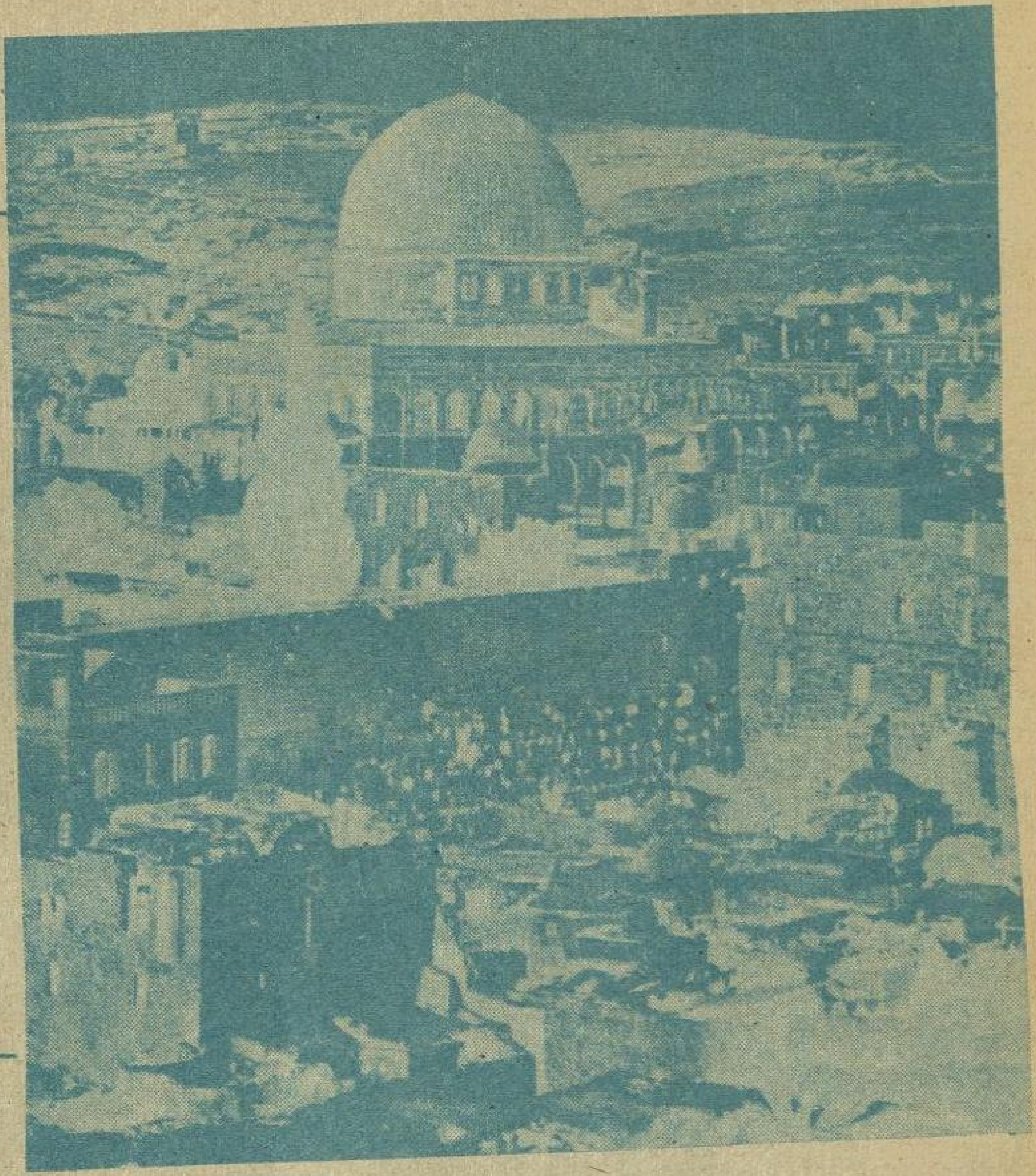
حضرت
اسحاق
علیہ السلام
کا
مزار



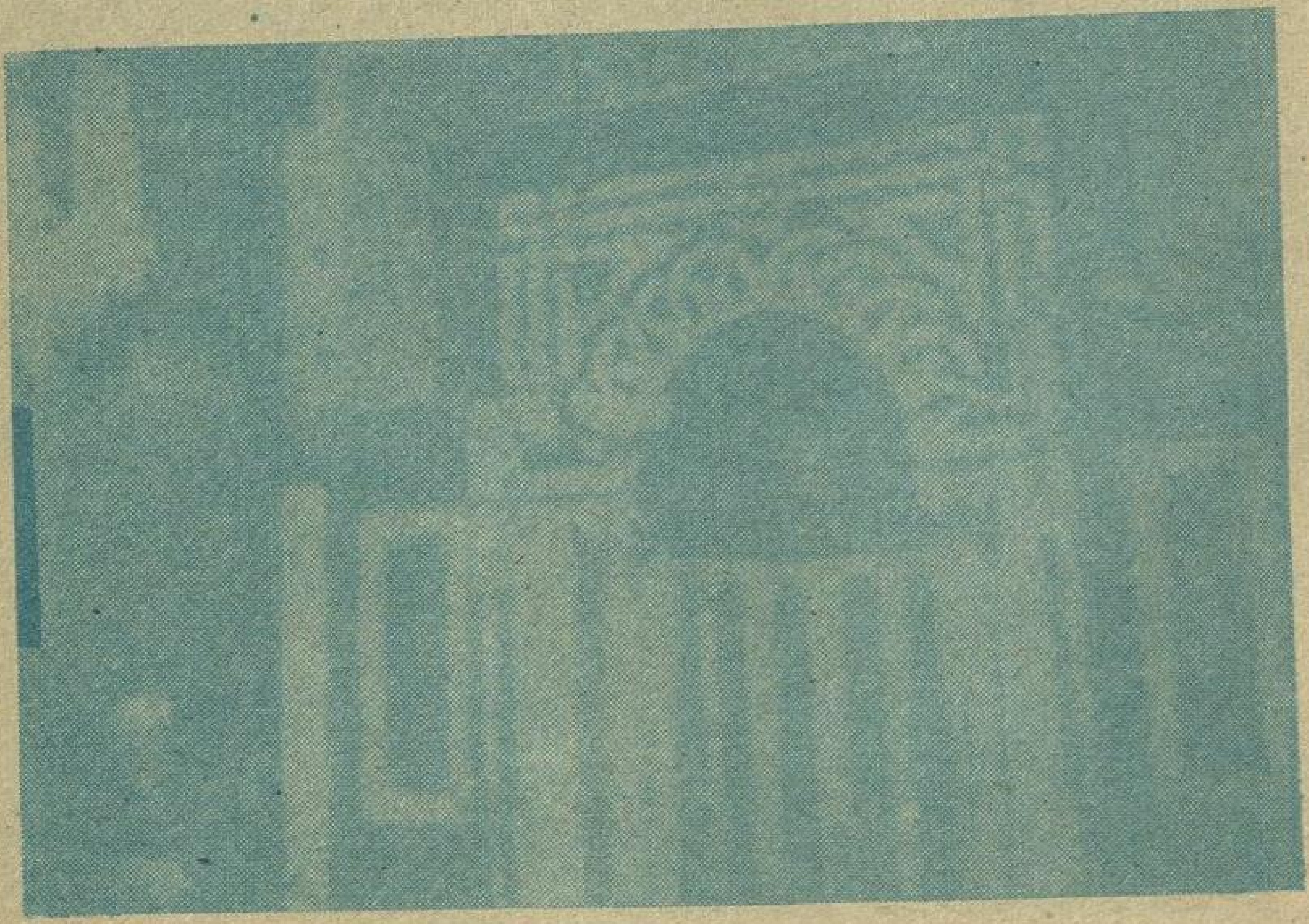
مسجد صخرہ - غار کا دہانہ ، روایت کے مطابق یہاں رسولؐ اللہ نے شب معراج کو
دو رکعت نفل پڑھے اور پھر سیر ملکوت کے لئے تشریف لے گئے



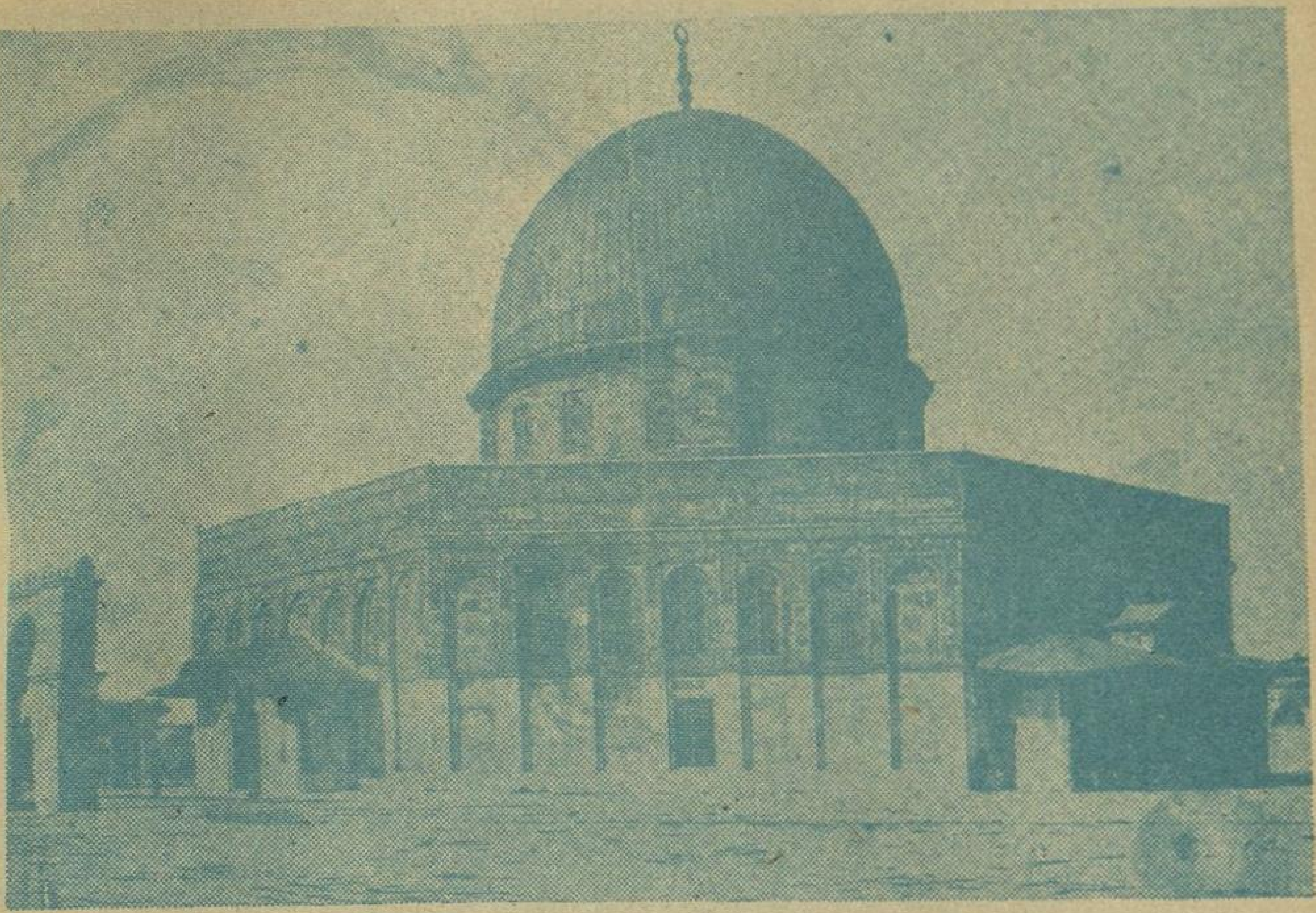
بیت المقدس
کا
سنہری دروازہ
اس کے اندر
مسجد اقصیٰ
واقعہ ہے



مسجد صخرہ کا ایک منظر



بیت المقدس میں مسجد خلیلؑ جس کے اندر حضرت ابراہیمؑ اور متعدد دیگر انبیاء کے مزارات ہیں



بیت المقدس ـــــ مسجد عمر رض



مسجد اقصیٰ
کا
ایک
اندرونی
منظر

بیت المقدس ——— قبۃ الصخرہ



یہیں آنحضرتؐ نے انبیاءؑ کی امامت کی، اور صلاح الدین ایوبیؒ اسی کے لئے صلیبیوں سے نبرد آزما رہا، لیکن آج اس پر یہودیوں کا قبضہ ہے۔ اس المیہ پر دل سے خون اور آنکھوں سے آنسو رواں ہیں، اور صلاح الدین ایوبیؒ کی روح اخلاف کو پکار رہی ہے کہ حریت اسلام پر کٹ مرنے والو، تمہیں کیا ہوا، تمہاری غیرت کدھر گئی۔ مسجد اقصیٰ کے در و دیوار تمہیں آوازیں دے رہے ہیں تم ان آوازوں کو کیوں نہیں سنتے

اداریہ

کیف وکم

تاریخ عالم قوموں کے عروج وزوال کی داستانوں سے بھری ہوئی ہے، بلندی اور پستی کا یہ چکر امتِ مسلمہ کے ساتھ بھی چلتا رہا ہے، لیکن جب اس چکر پر ہم اس نقطہ نگاہ سے نظر ڈالتے ہیں کہ یہ امت وہ ہے جس کے سر پر قیامت تک کے لیے امامت وقیادت کا تاج رکھا گیا ہے تو جہاں عروج وزوال کے متعدد طبعی اسباب سامنے آتے ہیں وہاں ایک اور سبب بھی نمایاں ہوکر سامنے آجاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس امت کی تخلیق، تشکیل جس مقصد کے لیے ہوئی ہے جب تک وہ اسے اپنا نصب العین بنائے رکھتی ہے کتاب وسُنت کے مطابق امامت وقیادت کے فکری تقاضوں کو پورا کرتی رہتی ہے تب تک اسے عروج حاصل رہتا ہے لیکن جہاں یہ اپنے نصب العین سے ہٹ جاتی ہے کتاب وسُنت سے گریز کا رویہ اپنا لیتی ہے، وہیں سے اس کے زوال کی سرحد شروع ہو جاتی ہے پھر کوئی مادی سہارا خواہ وہ کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو اس کے زوال کی راہ میں مستقل رکاوٹ نہیں بن سکتا

عباسی دور میں جب بغداد ایشیا کا "پیرس" بن گیا تھا اور کتاب وسنت کے وارث آپس میں معمولی معمولی باتوں پر لڑتے اور کفر وشرک کے فتوے لگاتے تھے، تاتاریوں نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور ان کا دکھاوے کا جلاہ وجلال تاتاری سیلاب کے آگے بند نہ باندھ سکا لیکن اسی دور میں امام ابن تیمیہ کی پرشکوہ للکار نے جس میں کتاب وسنت کی پوری روح جلوہ گر تھی۔ بڑھتے ہوئے سیلاب کا رخ توڑ دیا اور یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ امتِ رسول ہاشمی ایک خاص امتیاز رکھتی ہے۔ یہی امتیاز اسے دوسری ملتوں سے ممتاز کرتا ہے اور اسی کے باعث اسے دوسری ملتوں پر قیاس نہیں کیا جاسکتا اس کا یہ امتیازی وصف اس کی کتاب وسنت سے وابستگی ہے، یہی وصف اس کے وجود کی بنیاد ہے اور جب اس بنیاد میں کمزوری آتی ہے تو طاقت کا سوتا سوکھ جاتا ہے۔

ماضی میں جب تاتاری یلغار مشرق وسطیٰ کو اپنے سیلاب میں بہالے جانا چاہتی تھی، قدم قدم پر اسے کامیابی ہو رہی تھی۔ اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو اسی وقت روکا جاسکا، جب کتاب و سنت کی روح سے سرشار ایک گروہ نے آگے بڑھ کر اسے للکارا اور اس طرح وہ طوفان جو شمع توحید کو بجھانے کے لیے اٹھایا گیا تھا آگے چل کر حرم کی پاسبانی کرنے لگا۔

موجودہ صیہونی فتنہ بھی ماضی کے تاتاری فتنہ کی مثال بلکہ اس سے شدید تر ہے، اور پورے مشرقِ وسطیٰ کو نگل لینا چاہتا ہے۔ حال اور ماضی کے ان دو فتنوں میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ ہے کہ تاتاری فتنہ اپنے وجود میں مستقل تھا اور عہد حاضر کا صیہونی فتنہ استعماری طاقتوں کا ایک بہروپ ہے، چہرہ دیکھئے تو اسرائیل لیکن اس کے اندر دل و دماغ، اعضاء و جوارح، ارادے اور عزائم سب استعماری طاقتوں کے ہیں۔ اس بونے دیو میں ساری توانائی استعماری طاقتوں کی ہے اور انہی طاقتوں کے مصالح و مفاد کے لیے یہ دیو گاہے بگاہے حرکت میں آتا ہے۔ اس کا جسم ایک لیکن جانیں صد ہزار ہیں اور یہی حقیقت اس کی فتنہ سامانی کو بڑھاتی ہے۔ مشرق وسطیٰ کا آج اسی فتنہ سے پالا ہے، اس کے عزائم خطرناک اور اس کی جڑیں دنیا کی تمام استعمار پسند طاقتوں سے ملی ہوئی ہیں۔

اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اسرائیل کے قیام کا مقصد یہودیوں کو وطن دلانا نہیں بلکہ عرب ممالک میں ایک نئی یورپی طاقت کے قیام کے ذریعہ ان ممالک کو ہمیشہ دبا کر رکھنا ہے اسی غرض سے سامراج ہمیشہ اسرائیل کی حمایت کرتا اور اسے مستحکم بناتا رہا ہے نیز ہر طرح کی امداد سے اسے وسط ایشیا اور افریقہ میں مغربی طاقتوں کے لیے ایک زبردست معاون اور مددگار بنایا جا رہا ہے۔ اس لیے مشرق وسطیٰ نے اگر اس فتنہ کا مقابلہ نہ کیا تو اس کا اپنا وجود ختم ہو جائے گا اور اسے اپنی زندگی کے لیے اس فتنہ کا ہر حالت میں مقابلہ کرنا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مشرق وسطیٰ اس فتنہ کی سرکوبی کس طرح کر سکتا ہے؟ کیا اقوام متحدہ سے اس سلسلے میں کسی مثبت کارروائی کی توقع کی جاسکتی ہے۔ نہیں اور ہرگز نہیں۔ یہ ادارہ ان بڑی طاقتوں کے ہاتھوں میں کھلونا ہے جو اسرائیل کے وجود کا سبب بنیں اور یہ عالمی ادارہ ان کے مصالح و

مفادات کے سامنے بے بس ہے ۔ اس ادارہ کی بے بسی کا اعتراف اس کے جنرل سیکرٹری نے جنرل اسمبلی کے ۲۲ ویں سالانہ اجلاس کے ابتدا میں اپنی رپورٹ پیش کرتے ہوئے خود کیا ہے اور پھر دنیا کی ایک عظیم اور ستر کروڑ کی قوم کو اب تک اس عالمی ادارہ سے باہر رکھنا بجائے خود اس کی بے بسی کا ثبوت ہے اس ادارے نے اس سلسلے میں اب تک جو کچھ کیا ہے اس سے بھی عالمی ادارے کی بے بضاعتی کھل کر سامنے آجاتی ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ادارہ اگر صحیح معنوں میں دنیا کی قوموں کا نمائندہ ادارہ ہوتا تو عرب بھی اس سے انصاف کی توقع کر سکتے تھے ۔ لیکن یہ شروع ہی سے عالمی ادارہ کی روح سے خالی رہا اور دنیا کی چند بڑی قوموں نے اسے اپنے مفاد کے لیے آلہ کار بنایا ۔ اس کی اب تک کی کارروائیوں پر غور کرنے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اس ادارے میں عدل و انصاف کے دو پیمانے استعمال ہوتے ہیں ۔ اگر کوئی مسئلہ ایسا ہو جس کا تعلق روس، امریکہ، برطانیہ وغیرہ سے براہ راست ہو تو اس کے لیے اور پیمانے استعمال کیے جاتے ہیں، لیکن اگر اس نوعیت کا مسئلہ افریقہ یا ایشیا کی قوموں کا ہو تو اس کے لیے پیمانے بدل جاتے ہیں ۔

مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کی جارحیت کوئی نظری مسئلہ نہیں سر کی آنکھوں سے اسے دیکھا جا سکتا ہے ۔ لیکن یہ عالمی ادارہ اس کھلی ہوئی جارحیت کو مٹانے کے لیے کوئی مؤثر کارروائی کر سکے گا؟ یہ امید بجائے خود فریبی ہے ۔ جو ادارہ اب تک اسرائیلی جارحیت کی مذمت کے لیے آمادہ نہ ہو سکا، جو اب تک اپنی پاس کردہ قراردادوں پر عمل کرانے کے لیے اسرائیل کو مجبور نہ کر سکا، اس سے کسی مؤثر کارروائی کی توقع عبث ہے، لیکن یہی معاملہ اگر امریکہ، روس یا برطانیہ کے ساتھ پیش آیا ہوتا تو کیا اس وقت بھی اس ادارے کا رویہ یہی ہوتا؟ اور کیا اس وقت بھی یہ ادارہ ظالم و مظلوم کو ایک ہی صف میں کھڑا کر کے یہ کہتا کہ ایک میز پر بیٹھ کر اپنے اختلافات طے کر لو، کوریا سے لیکر ویتنام تک کے حالات کو سامنے رکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ادارہ اس وقت بھی یہی رویہ اپناتا؟

یہ ادارہ صرف یہی نہیں کہ جارحیت کے اثرات کو مٹانے کے سلسلے میں لیت و لعل کر رہا ہے بلکہ در پردہ اسرائیل اور اس کے حامیوں کے موقف کو تقویت پہنچا رہا ہے کہ عرب ممالک اپنی شکست

تسلیم کرلیں۔ نہر سویز اور خلیج عقبہ کو استعمال کرنے کا تمام قوموں اور اسرائیل کو پورا پورا حق ہو، دوسرے معنوں میں مصر اس کی ملکیت سے دستبردار ہو جائے، غازہ اور دریائے اردن کا مغربی علاقہ اسرائیل اپنی سلطنت میں شامل کرلے، اسی طرح شام کے مفتوحہ علاقے اور جزیرہ نمائے سینائی سے جس قدر وہ چاہے اسے دے دیا جائے۔ نیز بیت المقدس کو اسرائیلی شہر بنا دیا جائے۔ اسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے اسرائیل نے حالیہ جنگ میں وہ وہ وحشیانہ حرکتیں کیں جن کی مثال اٹیلا اور ہلاکو کی تباہ کن داستانوں میں مل سکے تو ممکن ہے لیکن موجودہ مہذب دنیا کی تاریخ میں ہرگز نہیں مل سکتی۔ نئے اور پرانے شہر کی درمیانی دیوار کو بارود سے اڑا دیا گیا۔ شہر کی قدیم عرب آبادی کو گلی گلی اور کوچہ کوچہ سے قتل و غارتگری کا نشانہ بنا کر اجاڑا گیا۔ عمارتوں کو تاخت و تاراج کیا اور اس مقدس خطہ ارضی کو جہاں دنیا کے لوگ ہزاروں برس سے ادب اور تعظیم کے ساتھ سر جھکا کر داخل ہوتے آئے ہیں، درندہ صفت اسرائیلیوں نے ناپاک بوٹوں سے روندا اور اپنی قبیح حرکتوں سے ناپاک کیا جب اسرائیلی وحشت القدس اور عرب مقبوضات میں ننگا ناچ ناچ چکی اور امن و سلامتی کی علمبردار طاقتوں اور امن عالم کا ذمہ دار ادارہ خاموش تماشائی بنا رہا تو اسے شہ ہوئی اس نے بیت المقدس پر غاصبانہ قبضہ کو گم شدہ شہر کی ”واپسی“ قرار دیتے ہوئے اسے یروشلم میں شامل کر لیا۔ اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر کا اعلان کیا۔ اس پر اقوام متحدہ نے ایک متفقہ قرارداد کے ذریعہ القدس، اردن کو واپس کرنے کا مطالبہ کیا۔ لیکن اسرائیل سے اس فیصلے پر عمل کرانے کی بجائے عالمی ادارہ کی ”سرپرست“ طاقتوں نے ایک نئی تحریک کو جنم دیا کہ بیت المقدس کو بین الاقوامی انتظام میں دے دیا جائے۔ اور یوں ایک مرتبہ پھر اسرائیل کی آڑ میں کارفرما استعماری طاقتوں نے اس عالمی ادارہ کی بے بسی کا ثبوت فراہم کر دیا۔

اقوام متحدہ کا رویہ ثابت کرتا ہے کہ وہ لیت و لعل سے کام لے کر اصل مسئلہ کو نگاہوں سے اوجھل کر دینا چاہتی ہے۔ اقوام متحدہ بڑی طاقتوں کی کٹھ پتلی ہے۔ اور بڑی طاقتیں یہ کوشش کر رہی ہیں کہ عرب اسرائیل کے خلاف نہ صرف حالت جنگ ختم کر دیں بلکہ خلیج عقبہ اور نہر سویز کو عالمی آبی گذرگاہ قرار دے دیں اور جب وہ یہ کہتی ہیں، ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اہل خانہ گھر میں زبردستی گھس آنے والے کو ”حق بجانب“ تسلیم کر کے کنبہ کا فرد تسلیم کرلیں۔ نیز امریکہ اور دوسری استعماری طاقتیں

آبی گذرگاہوں کو بین الاقوامی قرار دینے کے مسئلہ کو اس وقت فراموش کر جاتی ہیں جب امریکہ کے پڑوس میں کیوبا سے ملی ہوئی خلیج "فاین سیکا" میں روسی آبدوزیں ابھرتی ہیں - یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ کسی ملک کے ساحل سے ۱۲ میل دور تک کا بحری علاقہ اس ملک کی حدود میں شمار ہوتا ہے - خلیج عقبہ صرف نو میل چوڑی ہے جو عرب ملکوں کے گھیرے میں ہے لیکن اس کے باوجود یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ اسے بین الاقوامی آبی راہ قرار دیا جائے تاکہ استعماری طاقتوں کا لخت جگر اسرائیل اس سے فائدہ اٹھا سکے - اس کے مقابلہ میں فرانس سے ملی ہوئی خلیج ... کی چوڑائی سترہ میل ہے، لیکن یہی طاقتیں اسے بین الاقوامی قرار دینے کی بجائے فرانس کی خلیج تسلیم کرتی ہیں - کینیڈا کی آبنائے ہڈسن پچاس میل چوڑی ہے اور اس پر کینیڈا کا قبضہ و تسلط تسلیم کیا جاتا ہے - اس لیے اقوام متحدہ کے سایہ میں خلیج عقبہ اور نہر سویز کو بین الاقوامی گذرگاہ قرار دینے کی تو کوشش کی جا رہی ہے اور جس طرح عربوں سے اس معاملہ میں روس اور چیکوسلواکیہ کے ذریعہ "سودا بازی" ہو رہی ہے - اس کے بعد اس بات کا کیا امکان رہ جاتا ہے کہ ادارہ اقوام متحدہ سے عربوں کو انصاف مل سکے گا -

---

ان حالات میں اس عالمی ادارے کے رویہ کو کسی طور عدل و انصاف پر مبنی قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ استعماری طاقتوں کے عزائم کو آئینی لباس دینے کی کوشش کی جا رہی ہے اور جو ادارہ ظلم کو عدل کے روپ میں پیش کرنے لگے، اس سے انصاف کی توقع عبث ہے - اس رویہ کے باعث صرف عرب ہی اقوام متحدہ سے مایوس نہیں بلکہ چھوٹی قومیں یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ یہ ادارہ انہیں جارحیت ظلم اور زیادتی سے بچانے کے لیے وجود میں نہیں لایا گیا بلکہ اسے استعماری طاقتوں نے اپنے مکروہ عزائم کو چھپانے کے لیے "آرائش محل" کے روپ میں قائم کیا ہے اور اقوام متحدہ بھیڑ کے روپ میں بھیڑیا ہے -

عالمی ادارہ اگر استعماری طاقتوں کی گرفت سے آزاد ہو، امریکہ، برطانیہ، روس اور دوسری طاقتیں حق و صداقت کا ساتھ دیتی ہوں، تو نہ صرف یہ کہ مشرق وسطیٰ کے تمام مسائل سلجھ جائیں - اسرائیل کی روح ختم ہو جائے اور اس کا وجود ایک دن کے لیے بھی باقی نہ رہے بلکہ بہت سے دوسرے مسائل جو امن عالم کے لیے خطرہ بنے ہوئے ہیں جن میں کشمیر اور قبرص کے مسائل سر فہرست ہیں ایک دن میں حل ہو جائیں اور بہت سی قوموں کو استعمار سے آزادی مل جائے -

حالات کے اس پس منظر میں صرف عرب ملکوں کے لیے ہی نہیں بلکہ تمام ترقی پذیر ممالک کے لئے یہ مسئلہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ وہ اپنے اوپر ظلم و زیادتی کو کیسے روکیں، کیا وہ ان بڑی طاقتوں اور اس ادارہ کے سہارے وقار کی زندگی حاصل کر سکتے ہیں؟ حالات بتاتے ہیں کہ یہ آرزو تو ہو سکتی ہے لیکن واقعہ نہیں ہو سکتا۔ انہیں اگر ظلم و زیادتی سے خود کو محفوظ رکھنا ہے تو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا پڑے گا۔ عربوں کے لیے تو اس سلسلہ میں اور بھی آسانی ہے۔ اسلام کے روپ میں ان کے پاس ایک بہترین نظام زندگی ہے یہی رشتہ انہیں ۷۰ کروڑ انسانی برادری کا اٹوٹ انگ بنا دیتا ہے، قدرت نے تپتے ہوئے صحرا میں انہیں معدنی دولت سے مالا مال کیا ہے اگر اجتماعیت کا یہ وسیع تصور اپنا کر وسائل و ذرائع کو کام میں لایا جائے تو آج کی کمزوری کو کل کی طاقت میں بدلنا کچھ زیادہ دشوار نہ ہوگا اور جب یہ خود طاقت ور اور مضبوط ہوں گے تو دنیا ان کے ساتھ انصاف کرنے پر مجبور ہوگی۔ اور اس وقت وہ ظلم کے سوتے کو بند بھی کر سکیں گے، ورنہ یہ ادارہ انہیں انصاف نہیں دلا سکے گا۔

یہاں بعض پہلوؤں سے اس مسئلہ کا مطالعہ بے موقعہ نہیں ہوگا۔ انسانی نقطہ نظر سے یہ جنگ بلکہ اسرائیل کا وجود عالمی انسانی مسئلہ ہے، جمہوریت اور انصاف کے دعوے ایک طرف رہے تمام بڑے ممالک خواہ وہ مغربی بلاک سے متعلق ہوں یا روس کے ہمنوا۔ اسرائیل کے "ظالمانہ" اور "غیر قانونی" وجود کو تسلیم کرتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ جنہوں نے اسرائیل کو تسلیم نہیں کیا، وہ بھی تسلیم کر لیں۔ مغربی ممالک ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ بھی چاہتے ہیں کہ اسرائیل کی سرحدیں وسیع تر ہوتی چلی جائیں اور سازش یا طاقت سے جس طرح بھی ہو اس کا قبضہ مستحکم ہو جائے۔ اسی صورت حال نے دنیا میں پھر سے ہتھیاروں کی دوڑ شروع کر دی ہے، ہر ملک خوف زدہ ہو کر اسلحہ کی خریداری کے لیے بھاگ رہا ہے نتیجتاً غیر جانبداری اور بقائے باہمی کے اصول ختم ہو کر رہ گئے ہیں۔ دنیا کے لئے یہ کوئی چھوٹا حادثہ نہیں کہ اس کے باشندوں کا جمہوریت اور اقوام متحدہ کے اصولوں سے اعتماد اٹھ جائے اور دو بڑی جنگوں کے بعد کسی تیسرے بڑے معرکے کے لیے میدان منتخب کیا جانے لگے۔

اس مسئلہ کے ایشیائی اور مشرقی پہلو کا تقاضا یہ ہے کہ مغربی ایشیا میں امن قائم ہو اور ان ملکوں کی

رفتار تمتی متاثر نہ ہونے پائے ، موجودہ صورت حال میں ان کی ترقی ہی متاثر نہیں ہوئی اور ان کی اقتصادیات و حیثیت کے تباہ ہونے کا خدشہ ہی پیدا نہیں ہوا بلکہ ان کی آزادی بھی خطرہ میں پڑ گئی ہے۔ اگر یہی شب و روز رہے تو اسرائیل کے روپ میں جو نازی تحریک جنم لے رہی ہے اور اس کی موجودہ ہٹ دھرمی سے "ظلم و ناانصافی" اور "طاقت" کو اصول مان کر جس طرح توسیع پسندی کے عزائم کو شہ دی جا رہی ہے اس کے نتیجہ میں ایک دن سارے ایشیا، افریقہ بلکہ دنیا کے تمام کمزور ممالک کی آزادی ختم ہو جائے گی۔

ہمارے لئے اس مسئلہ کا سب سے اہم پہلو اسلامی اور مذہبی ہے اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں کسی بھی مسلم ملک کے کسی علاقے پر اگر غیر کا قبضہ ہو جائے، اور مسلم ملک اپنی حفاظت کا حق ادا نہ کر سکے تو دنیا کی پوری مسلم آبادی کے لیے لازمی ہو جاتا ہے کہ وہ اس علاقے کی بازیابی کے لیے کوشش کرے، یہ کوشش ہتھیار اٹھانے سے لے کر بائیکاٹ کرنے تک متعدد قسم کی ہو سکتی ہے۔ بہرحال تمام عالم کے مسلمانوں پر لازم ہو گیا ہے کہ وہ سوچیں ان کی ذمہ داری کیا ہے۔ اور وہ کیا کر سکتے ہیں؟

بیت المقدس ہمارا قبلۂ اوّل ہے اور ہماری نسل کی بڑی بدقسمتی ہے کہ اسے قبلۂ اوّل کے چھن جانے کے حادثے سے دوچار ہونا پڑا ہے لیکن ہم مایوس نہیں بلکہ پوری طرح پر امید ہیں کہ جو سرزمین ہزاروں شہیدوں کے خون سے سیراب ہوئی ہے اور جس کی ناموس پر مر مٹنے کے لیے لاکھوں کروڑوں انسان بے چین ہیں اسے کوئی بھی ظالم و جابر طاقت اپنے قبضے میں نہیں رکھ سکتی۔ اردن، شام اور مصر کے ہزاروں مربع میل اور اہم فوجی مقامات پر اسرائیل کا قبضہ کسی المیہ سے کم نہیں لیکن سب سے المناک سانحہ قبلۂ اوّل کا چھن جانا ہے۔ اس کا تعلق دنیا کے ایک ایک مسلمان سے ہے خواہ کوئی زبان بولتا ہو اور کہیں کا رہنے والا ہو۔ دنیا کو سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ آگ اس وقت تک بھڑکتی رہے گی جب تک یہ مقدس علاقے واپس نہ مل جائیں۔

اس لیے بعض عرب ممالک اشتراکی قوتوں سے جس طرح یہ دریافت کر رہے ہیں کہ وہ کس حد تک ان کا ساتھ دینے کے لیے آمادہ ہیں، اسی طرح ہم عرب ممالک سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ قبلۂ اول کو آزاد کرانے کے لیے کیا زندگی کی آخری سانس اور وسائل کے آخری ذرے تک جدوجہد کے واسطے آمادہ ہیں اگر وہ اپنے آپ کو اس کے لیے تیار پاتے ہیں تو بسم اللہ آگے بڑھیں اور خدا کی مہربانیوں کے تماشے دیکھیں

دنیا کے تمام مسلمان ان کے دوش بدوش ہوں گے، لیکن اگر وہ اپنے اندر اس کی ہمت نہیں پاتے تو جرأت کے ساتھ اپنی کمزوری کا اعلان کر دیں، قبلۂ اوّل تو انشاءاللہ آزاد ہو کر رہے گا اور اللہ تعالےٰ کسی اور گروہ سے یہ خدمت لے لے گا۔

دنیا ایک میدانِ کارزار ہے یہاں پر ہر وقت حریفانہ کشمکش برپا ہے اور کشمکش میں حصہ لینے والوں کو فتح اور شکست دونوں ہی سے واسطہ پیش آتا ہے۔ ضروری نہیں کہ تلوار ہمیشہ دشمن کی گردن ہی پر چلے کبھی کبھی اپنی گردنیں بھی اس کا نشانہ بن جایا کرتی ہیں لیکن ایسی شکستوں کو شکست نہیں بلکہ فتح کا نام دیا جاتا ہے بشرطیکہ شکست کھانے والوں میں شکست کے اسباب کا پورا احساس اور انہیں دور کرنے کی پوری آمادگی ہو، یہ جنگ اسلئے ہاری گئی کہ عربوں نے قانونِ فطرت کی پیروی نہیں کی تھی، جو کسی معرکے کو سر کرنے کیلئے ضروری ہے، وہ متحد نہیں تھے، اسلئے ان کی ہوا اکھڑی ہوئی تھی۔ وہ اپنی استطاعت اور مقدور بھر جدید فنِ جنگ اور اسبابِ جنگ سے لیس نہیں تھے۔ انہوں نے بعض ملکوں کو غلط طور سے دوست سمجھ لیا تھا۔ اور بعض دشمنوں کی گہری چالوں کا پورا اندازہ نہیں کر سکے تھے۔ لیکن یہ سب تجربات ہیں جو اگلے معرکے کی تیاری کے لیے مفید ہیں اور حالات ثابت کر رہے ہیں کہ انشاء اللہ ان سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں نئی زندگی کا تقاضا ہے کہ ہمارا ہر فرد امید کا پیکر بن کر سامنے آئے اور مصیبتوں کو یہ سمجھے کہ یہ اسے خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے آئی ہیں، ایمان اور مایوسی ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے، ہمارا قبلۂ اول اور عرب کی مقدس سرزمین انشاءاللہ جلد آزاد ہوں گے اور دنیا کی بڑی طاقتوں کو جلد محسوس ہو جائے گا کہ انہوں نے اس مقدس سرزمین پر ظالموں کو مسلط کرنے کی سازش کر کے اپنی تاریخ کے بھیانک جرم اور بھیانک ترین حماقت کا ارتکاب کیا تھا ——— خدا نے مسلمانوں کو زندگی کی روشن بنیادوں سے نوازا ہے، افرادی قوت دی ہے۔ وسائل کی لاحدود دولت بخشی ہے ان حالات میں اگر کسی چیز کی ضرورت ہے، تو خود اعتمادی اور خدا پر بھروسے کی ہے آگے بڑھنے کیلئے جو وسائل چاہئیں، وہ موجود ہیں صرف ضرورت ہے انہیں منظم کرنے اور ان سے کام لینے کی، اگر اپنے وسائل و ذرائع کو بروئے کار نہ لایا گیا تو دوسروں کے سہارے اپنی آزادی کی لڑائی نہیں لڑی جا سکتی۔ پھر ان تمام تیاریوں کے ساتھ اس روح کو بھی بیدار کرنے کی ضرورت ہے جو کتاب و سنت کے تقاضوں کو پورا کرے، یہی روح اس امت کے وجود کی بنیاد ہے اور یہی انہیں سیسہ پلائی ہوئی ایسی دیوار بنا سکتی ہے کہ ایک نہیں ہزار اسرائیل ۔ لاکھ استعمار اس سے ٹکرائیں، اپنا سر پھوڑنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکیں گے۔

یہودیوں کی اصلیت

حضرت یعقوبؑ جنہیں اسرائیل بھی کہا جاتا تھا، کے بارہ بیٹے تھے۔ ان کے ایک بیٹے حضرت یوسفؑ مصر میں وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز ہوئے تو حضرت یعقوبؑ اپنے بیٹے اور پوتوں کے ساتھ مصر ہجرت کر گئے، بعد ازاں بنی اسرائیل پر فراعین مصر نے زبردست ظلم و تشدد کیا۔ بالآخر حضرت موسیٰؑ نے انہیں ۱۲۲۵ ق م میں اس ظلم سے نجات دلائی۔ اور مصر سے نکال لائے۔ لیکن بنی اسرائیل نے اپنے پیغمبر کی نافرمانی کی، اور چالیس برس تک سینائی کے صحرا میں بھٹکتے رہے۔ آخر کار جوشوا کی قیادت میں وہ ملک فلسطین پر حملہ آور ہوئے اور حضرت داؤدؑ نے سلطنت یہود کو فلسطین کی آخری سرحدوں تک پھیلا دیا، جو صرف حضرت سلیمانؑ کے انتقال ۹۳۰ ق م تک متحد رہ سکی۔ لیکن حضرت سلیمانؑ کی وفات کے بعد شمالی قبائل نے سماریہ کو دارالحکومت قرار دیتے ہوئے اسرائیل کی بادشاہت کے نام سے نئی سلطنت قائم کا ۵۸۶ ق م میں بخت نصر نے خاتمہ کرتے ہوئے بیت المقدس اور ہیکل سلیمانی کو تباہ کر دیا اور تمام یہودیوں کو غلام بنا کر بابل لے گیا، نصف صدی بعد ان یہودیوں کو واپس فلسطین جانے کی اجازت ملی ۱۵۰ ق م میں یہودیوں نے نئی سلطنت قائم کر لی، جو کر لی۔ اور یہودا کی سلطنت جنوبی پہاڑی علاقے تک محدود ہو کر رہ گئی، بیت المقدس اسی علاقہ میں تھا ۷۲۱ ق م میں اسرائیل کی بادشاہت حملہ آوروں کی تاب نہ لاتے ہوئے ختم ہو گئی۔ جبکہ یہودا کی بادشاہت ۶۳ ق م میں رومیوں کی باجگزار بن گئی۔ اسی دور میں ہیرود کے عہد ۳۷ ق م سے ۴ ق م تک میں دوبارہ ہیکل کی تعمیر ہوئی، لیکن یہودیوں کی شرارتوں سے تنگ آکر رومی بادشاہ ٹیٹوس نے ۷۰ء میں بیت المقدس اور ہیکل کو تباہ کر دیا۔ ۱۳۲ء میں رومی بادشاہ ہڈریان کے حکم سے بیت المقدس دوبارہ تعمیر ہوا۔ لیکن اس میں یہودیوں کی سکونت پر پابندی لگا دی گئی۔ چنانچہ اسی وقت سے فلسطین میں کوئی یہودی آباد نہ ہو سکا۔

صدیوں قبل اسرائیل کے اسلاف نے فلسطین سے ترک سکونت شروع کر دی تھی۔ اور حضرت عیسیٰؑ کے ظہور کے وقت فلسطین میں یہودیوں کا صرف ایک قبیلہ موجود تھا۔ اور حضرت عیسیٰؑ نے "اسرائیل کے گمشدہ قبیلوں" کا ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ قبیلہ بھی ۱۳۵ء میں فلسطین سے نکال دیا گیا۔

ان منتشر قبیلوں کا نسلی اتحاد بھی اس وقت ختم ہو گیا جب انہوں نے یورپ میں بہت سے لوگوں کو یہودی بنایا، اس طرح موجودہ یورپی یہودیوں کو بنی اسرائیل قرار نہیں دیا جا سکتا اگرچہ وہ خود بنی اسرائیل ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

دنیا کی یہودی آبادی

امریکہ		ہالینڈ	۲۴۰۰۰	الجزائر	۳۵۰۰
روس	۵۶۶۰۰۰۰	پولینڈ	۲۰۰۰۰	متحدہ عرب جمہوریہ (مصر)	۳۵۰۰
فرانس	۳۰۰۰۰۰۰	سوئٹزرلینڈ	۱۹۰۰۰	کیوبا	۲۰۰۰
ارجنٹائن	۵۰۰۰۰۰	چیکوسلواکیہ	۱۴۰۰۰	پناما	۲۰۰۰
برطانیہ	۴۷۵۰۰۰	جلشہ	۱۵۰۰۰	فن لینڈ	۱۷۰۰
کناڈا	۴۵۰۰۰	بھارت	۱۴۴۵۰	کاسٹاریکا	۱۵۰۰
برازیل	۲۷۰۰۰۰	سویڈن	۱۳۰۰۰	گوئٹے مالا	۱۵۰۰
جنوبی افریقہ	۱۲۵۰۰	لکسمبرگ	۱۲۰۰۰	پیراگوے	۱۵۰۰
رومانیہ	۱۱۶۰۰۰	وینزویلا	۱۱۰۰۰	ایکویڈور	۱۲۰۰
	۱۰۰۰۰۰	کولمبیا	۱۱۰۰۰	ناروے	۱۰۰۰
ہنگری	۸۰۰۰۰	یوگوسلاویہ	۶۵۰۰	جمیکا	۸۰۰
آسٹریلیا	۶۲۰۰۰	یونان	۶۰۰۰	جاپان	۸۰۰
یوراگوے	۵۰۰۰۰	بلغاریہ	۶۰۰۰	جبل الطارق	۶۵۰
مراکش	۵۰۰۰۰	عراق	۶۰۰۰	پاکستان	۵۰۰
ترکی	۴۴۰۰۰	لبنان	۵۵۰۰	ڈومی نیکن	۵۰۰
بلجیم	۳۵۰۰۰	اسپین	۵۰۰۰	سنگاپور	۵۰۰
چلی	۳۵۰۰۰	نیوزی لینڈ	۵۰۰۰	مشرقی جرمنی	۴۵۰
اٹلی	۳۵۰۰۰	لیبیا	۴۲۰۰	شام	۵۰۰۰
میکسیکو	۳۰۰۰۰	آئرلینڈ	۵۰۰۰	سان سلویدار	۳۰۰
مغربی جرمنی	۲۵۸۰۰	بولیویا	۴۰۰۰	فلپائن	۲۵۰
تیونس	۲۵۰۰۰				

تحریر: مفتی اعظم فلسطین
ترجمہ: محمد بدر منیر

قضیہ فلسطین
۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۷ء تک

(۱)

فلسطین گذشتہ چودہ سو سال سے ایک عرب ملک ہے۔ اسلامی فتح سے پہلے اور اس کے بعد اس پر متواتر عربوں ہی کا قبضہ رہا ہے۔ اس کی عربی اہمیت مسلّم ہے اور ملک بھر میں خاندانوں، قبائل شعوب اور مقامات کے نام اب تک اسکے شاہد ہیں جیسا کہ نقشے سے ظاہر ہوتا ہے فلسطین کی سرحدیں عرب ممالک ہی سے ملی اور گھری ہوئی ہیں۔ اتحادی قبضہ کے وقت ۱۸-۱۹۱۷ء میں یہودی آبادی بمشکل پچاس ہزار یعنی مجموعی آبادی کا ۷ فی صد تھی بقیہ ۹۳ فی صدی آبادی جس میں مسلمان اور عیسائی دونوں شامل تھے خالص عرب تھی۔

(۲)

فلسطین عرب قومی تحریک میں اس کے آغاز ہی سے اوائل بیسویں صدی میں شامل ہو گیا اور دستور ترکیہ کے اعلان کے بعد تو فلسطین نے عرب تحریک میں نہایت نمایاں حصہ لیا۔ اس قومی تحریک کا مقصد سلطنت عثمانیہ میں شامل عرب ممالک کے لئے آزادی کا حصول اور وحدت عربیہ کی حفاظت تھا۔ فلسطین کا یہ اقدام اس حقیقت کے باوجود تھا کہ اہل فلسطین کو سلطنت عثمانیہ میں دوسرے عربوں کے ساتھ سلطنت کے نظم ونسق اور دوسری ولایات میں اعلیٰ فوجی اور ملکی مناصب پر سرفرازی حاصل تھی۔ قسطنطنیہ کی پارلیمنٹ اور وزارت عثمانیہ میں عربوں کے نمائندے موجود تھے۔ تاہم عرب آزادی کے طالب تھے۔

(۳)

نہ عالمگیر جنگ اوّل کے وقت نہ اس سے کبھی پہلے فلسطین بجائے خود کوئی علیحدہ ملک تھا۔ اس کا ایک حصہ تو ولائیت بیروت میں شامل تھا (بیروت اب لبنان کا دارالحکومت ہے۔) اور دوسرا حصہ ضلع یروشلم کہلاتا تھا۔ اس زمانے میں فلسطین کا نام تک نہ لیا جاتا تھا۔ اور یہ علاقہ شام ہی کا ایک حصہ متصور ہوتا تھا۔ اور نہ کوئی قدرتی حد فاصل اسے شام سے علیحدہ کرتی ہے۔ شامی، لبنانی اور فلسطینی سبھی زبان

مفادات، روایات، خون اور مذہب کے مقدس اور محکم رشتوں سے باہم دگر پیوستہ ہیں باہمی مستقل صنعتی زراعتی اور تجارتی تعلقات اس پر مستزاد ہیں۔

(۴)

۱۹۱۵ء جب شریف مکہ اور مصر کے برطانوی ہائی کمشنر میں وہ خط و کتابت ہوئی جس میں وہ تجاویز اور خفیہ ہدایات تو تجویز کی تھیں جو عرب خفیہ مجالس تک پہنچائی گئیں تو فلسطینیوں نے عربوں کی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لیا۔

اس وقت فلسطین ان عرب ممالک کی حدود میں شامل تھا جو شریف حسین نے تجویز کیں اور جنہیں برطانیہ نے منظور کیا۔ ان عرب ممالک کی آزادی و حدت تسلیم کرنے کا برطانیہ نے وعدہ کیا۔

شریف حسین نے اپنے مکتوب محررہ ۱۴ جولائی ۱۹۱۵ء بنام سر ہنری میک موہن برطانوی ہائی کمشنر مصر مطالبہ کیا کہ برطانیہ ان عرب ممالک کی آزادی تسلیم کرے جن کی حدود درج ذیل ہیں۔

شمال میں مرسیا ادانہ خط سے ۳۷ ڈگری شمال کے متوازی ہوگا، اور بیرجیک، عرفہ، ماردین، مدیات کے جزیروں سے ہوتے ہوئے ایرانی سرحد تک۔ مشرق میں ایرانی سرحد کے ساتھ ساتھ خلیج فارس تک۔

جنوب میں بحیرہ ہند کے ساتھ ساتھ ماسوائے عدن کے جس کی موجودہ حیثیت قائم رہے گی۔ مغرب میں بحیرہ احمر اور بحیرہ روم سے واپس مرسیا تک۔

سر ہنری میک موہن شریف حسین کے نام اپنے ۲۴ اکتوبر ۱۹۱۵ء کے مکتوب میں یوں رقمطراز ہے۔

مرسیا اور اسکندریہ کے اضلاع اور شام کے وہ حصے جو اضلاع دمشق حمص، حماہ اور حلب کے مغرب میں واقع ہیں خالصتہً عرب نہیں کہے جا سکتے اور اس بنا پر مجوزہ حدود سے خارج قرار دیئے جانے چاہئیں اس ترمیم کے ساتھ اور ان معاہدات کو لازم جانتے ہوئے جو ہمارے بعض عرب شیوخ و امراء کے درمیان ہوئے ہیں۔ ہم ان حدود کو تسلیم کرتے ہیں۔ جہاں تک ان علاقوں کا تعلق ہے جو مجوزہ سرحدوں کے اندر شامل ہیں۔ اور جن میں برطانیہ کو اپنے حلیف فرانس کے مفادات کو نقصان پہنچائے بغیر ہر قسم کی آزادی عمل حاصل ہے میں آپ کے خط کے جواب میں حکومت برطانیہ کی طرف سے آپ سے حسب ذیل مواعید اور پیمان کرنے کا مجاز قرار دیا گیا ہوں۔ مندرجہ بالا ترمیمات کے ساتھ برطانیہ ان تمام علاقوں میں جو ان سرحدات کے اندر ہیں جو شریف مکہ نے تجویز کیے ہیں۔ عربوں کی آزادی تسلیم کرنے اور اس کی حمایت کے لئے تیار ہے۔

برطانوی حکومت نے یہ کہہ کر اس مسئلے کو پیچیدہ کرنے کی کوشش کی کہ مندرجہ بالا حدود میں فلسطین شامل نہ تھا۔ برطانیہ نے کہا دمشق، حمص اور حلب کے مغرب میں جس علاقے کا اخراج مقصود تھا فلسطین اس علاقے کا ایک

جز نہ تھا۔ لیکن یہ محض غلط بیانی ہے امرِ واقعہ یہ ہے کہ لبنان اس خط کے مغرب میں واقع ہے اور اسے جیسا کہ شریف اور میک موہن کی خط وکتابت سے پتہ چلتا ہے فرانسیسی مطالبات کی بنا پر خارج کیا گیا ہے برطانیہ نے پھر یہ دعویٰ کیا کہ ولایت دمشق مشرقی اُردن سے عبارت ہے اور فلسطین کے نام سے کوئی ولایت موجود ہی نہ تھی۔ اس علاقے کا نام تو ولایت شام تھا۔ اور اگر اس سے مُراد وہی ولایت شام ہوتی تو حمص اور حما کے جو ولایت شام کے حصے تھے، نام لینے کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔

۱۹۳۹ء میں لندن میں ایک باقاعدہ عدالتی کمیٹی کے روبرو اخراج کے اس تنازعہ کے صدر لارڈ چانسلر نے اس کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق یہ رائے ظاہر کی تھی۔

لارڈ چانسلر ان بعض ثبوتوں سے جو شام کے اضلاع دمشق، حمص، حما اور حلب کے مغرب میں واقع علاقہ کے اخراج سے متعلق پیش کئے گئے بے حد متاثر ہوئے۔ "ان کی رائے ہے اس سلسلے میں عربوں کا مسئلہ جو کچھ بادی النظر میں سمجھا جاتا ہے اس سے کہیں وسیع اور وزن دار ہے"۔ اس رپورٹ کے ایک دوسرے حصے میں حکومت برطانیہ کے اعلان بالفور پر حسب ذیل رائے ظاہر کی گئی ہے "کمیٹی ان بیانات سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ملک معظم کی حکومت فلسطین میں باشندگان فلسطین کی خواہشات و مفادات مناسب طور پر محفوظ رکھے بغیر من مانی کارروائی کرنے کا حق حاصل نہ تھا۔"

مزید برآں اس خط وکتابت کے مفہوم کے نتیجے کے طور پر ان باشندوں کی طرف سے ملک معظم کی حکومت پر جو ذمہ داریاں عائد ہو سکتی ہیں ان کے تعین کے لئے ان بیانات پر صد درجہ غور وخوض لازمی ہے۔

(۵)

جب عرب شریف حسین کے زیر قیادت سلطنت عثمانیہ اور اس کے حلیفوں کے خلاف جنگِ عالمگیر اول میں اتحادی افواج میں شامل ہوئے۔ تو جو عرب افواج معرض وجود میں آئیں ان میں فلسطینی افسروں اور سپاہیوں کی خاصی تعداد تھی۔ شریف حسین ہوائی جہازوں کے ذریعے فلسطین میں اپنی اپیلیں برساتے رہتے۔ شریف حسین کی طرف سے یہ اشتہارات فلسطینی عربوں کے لئے ہوا سے پھینکے جاتے تھے۔ انہی کا ایک اشتہار بطور دستاویزی شہادت شا کمیشن کے سامنے پیش کیا گیا۔ یہ اشتہارات شاہی فوج میں جو قدیم عرب حکومت کے قیام کے لئے لڑ رہی تھی۔ شامل ہونے کے لئے ایک صلائے عام تھی۔

اس کمیشن کے روبرو شہادت دی گئی کہ ایسی اپیلوں کے جواب میں فلسطین عرب فوجوں کے آدمی جن میں افسر اور سپاہی بھی شامل تھے۔ اور جن میں فلسطینیوں کی معقول تعداد تھی۔ ترکی فوج سے بھاگ بھاگ کر اتحادیوں کی

افواج میں آن ملے۔ غرض باقاعدہ عرب افواج میں فلسطینیوں ہی کی کثرت تھی۔

۱۹۱۸ء میں امیر فیصل خلف شریف حسین کی طرف سے جو بعد میں فیصل اول کے نام سے عراق کے بادشاہ ہوئے۔ اور جو اس وقت شمالی عرب افواج کے سپہ سالار تھے۔ ایک وفد ان کے چچیرے بھائی شریف حمزہ کی قیادت میں فلسطین پہنچا۔ اس وفد کا منشا عرب فوج کے لئے رضاکار بھرتی کرنا تھا۔ جیسا کہ ۱۹۲۰ء کے فوجی کمیشن کی رپورٹ سے جو یروشلم کے ۱۹۲۰ء کے مفادات کی تحقیقات کی رپورٹ کے لئے مقرر ہوا ہوا تھا، معلوم ہوتا ہے اس وفد کی اپیل پر کثرت سے سپاہی اور افسر عرب فوج میں بھرتی ہو گئے۔ دوسرے امور کے علاوہ اس رپورٹ میں اس زبردست اثر کی جو برطانیہ اور شریف حسین کے مابین معاہدہ سے پیدا ہوا، حقیقی صورت نظر آجاتی ہے۔ یہ رپورٹ یوں رقم طراز ہے۔

"اس معاہدے کا عام نتیجہ باشندگان کے رویے میں ایک گونا انقلاب تھا۔ ترکوں سے جذبۂ ہمدردی یکایک برطانوی تصرف کے پرجوش خیر مقدم میں بدل گیا۔ بلاشبہ یہ صورت حال بڑی حد تک برطانوی پروپیگنڈے کی مرہون منت تھی۔ جس کے لئے اس وقت کی وزارت جنگ کے تمام ذرائع وقف ہو چکے تھے۔ فی الحقیقت جون ۱۹۱۹ء میں فلسطین میں شریف حسین کی اتحادی افواج کے لئے عربوں کی بھرتی پورے زوروں پر تھی۔ جو لوگ جنگ بھرتی ہوتے تھے ان کو یقین تھا کہ وہ ایک قومی مقصد اور آزادی وطن کی حمائت میں نبرد آزما ہو رہے ہیں۔ اس وقت جو شہادت ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عربوں نے یہ باور کر لیا تھا کہ برطانیہ کی حکومت ایک آزاد عرب حکومت کے قیام کی ذمہ دار بن گئی ہے اور فلسطین اس حکومت کا ایک حصّہ ہوگا۔"

مزید برآں جب شاہ فیصل شام میں داخل ہوئے تو فوج اور فلسطین کے سول حکام کی ایک کثیر تعداد نے اس عرب حکومت کے قیام اور استحکام میں مدد دی۔ جو اتحادیوں کی طرف سے گفت و شنید کے زمانے کے لئے تجویز کی گئی تھی۔

فلسطین کو سرکاری طور پر شام کی جنرل کانگرس میں جو ۱۹۲۵ء میں مجلس آئین سازی میں منتقل کر دی گئی اور شامی کابینہ میں بھی جو اس سال امیر فیصل کے اعلان بادشاہت کے فوراً بعد معرض وجود میں آئی، نمائیدگی حاصل ہوئی۔ یہ تمام واقعات اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ فلسطین اور دوسرے عربوں کے دلوں میں اس امر کے متعلق شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ باقی رہ گئی تھی کہ ان کی جدوجہد کو کامیابی نصیب ہوگی اور ان کے ملک کی آزادی اور وحدت سے متعلق ان کی تمام آرزوئیں جلد ہی بر آئیں گی۔

(۶)

عربوں کے ساتھ برطانیہ کی پہلی غداری مارچ ۱۹۱۷ء میں

شروع ہوئی جب اس نے روس اور فرانس کے دباؤ سے عرب ممالک کی تقسیم حلقہ ہائے اقتدار میں منظور کرلی۔ شام کا ساحلی علاقہ فرانس کے حصے میں آیا اور عراق کے کچھ حصے اور فلسطین کا ساحلی علاقہ برطانوی اقتدار کے ماتحت آیا۔ اس طرح خفیہ طور پر یہ طے پایا کہ اگر کبھی کوئی عرب ریاست معرض وجود میں آگئے تو وہ محض اندرون ملک تک محدود ہو اور اس ریاست کے بعض حصص فرانسیسیوں کے زیر اثر ہوں تو بعض پر انگریزوں کا اقتدار مسلط ہو۔ فلسطین کے متعلق یہ طے پایا کہ یہ بھی مقامات مقدسہ کے ساتھ ساتھ روس، برطانیہ اور فرانس کی باہمی رضامندی سے ایک خاص نظم ونسق کے ماتحت رہے اور یہی تینوں ممالک اس امر کا بھی فیصلہ کریں کہ اس نظم ونسق میں برطانیہ کو کس درجہ اقتدار حاصل ہونا چاہیئے

برطانیہ کی دوسری غداری سائیکس پائیکاٹ کے معاہدہ ۱۹۱۶ء کی رو سے اس وقت ظاہر ہوئی جب برطانیہ نے فرانس سے شام اور عراق کو خفیہ طور پر اپنے علاقہ جات قرار دے لیا۔ جیسا کہ اب عام آشکار ہو چکا ہے۔ اس معاہدہ کی رو سے فلسطین میں ایک بین الاقوامی نظام کا قیام مقصود تھا۔ جس کی تشکیل روس کے مشورے اور دوسری اتحادی حکومتوں اور شریف مکہ کے نمائندوں کے سمجھوتے سے طے پانا قرار پائی۔ حیفہ اور عکہ برطانوی سامراجی منصوبوں کی نذر ہو کر فلسطین سے علیحدہ کر دیئے گئے۔

برطانیہ کو جب یہ امید ہو چکی کہ فلسطین پر اس کا قبضہ ہو کر ہی رہے گا تو اس کے دل ودماغ میں اس مملکت پر بلا شرکت غیرے قبضہ جمانے کی سامراجی ہوس گدگدانے لگی برطانیہ نے اپنی اس ہوس کی تسکین کے لئے یہودیوں کے ایک ایسے گروہ سے اعانت طلب کی جو فلسطین میں ایک یہودی وطن کے قیام اور انجام کار فلسطین کو ایک یہودی ریاست بنا لینے کے عجیب وغریب خواب دیکھتا تھا۔

یہودیوں کے اس گروہ کے ساتھ برطانیہ کی ساز باز عربوں کے ساتھ تیسری غداری تھی جس نے اعلان بالفور کی صورت اختیار کی۔ یہ اعلان ایک مکتوب کی صورت میں تھا۔ جو لارڈ راتھ چائیلڈ کے نام لارڈ بالفور برطانوی وزیر خارجہ نے دو نومبر ۱۹۱۷ء کو لکھا اس مکتوب کی عبارت حسب ذیل تھی۔

"ملک معظم کی حکومت فلسطین میں یہودیوں کے ایک قومی وطن کے قیام کی حامی ہے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے آسانیاں بہم پہنچانے کے لئے اپنی بہترین کوششیں وقف کر دے گی۔ لیکن یہ قطعاً واضح ہو جانا چاہیئے کہ ایسی کوئی کارروائی نہ کی جائے گی جس سے فلسطین کے موجودہ غیر یہودی فرقوں کے ملکی و مذہبی حقوق پر یا کسی دوسرے ملک میں بسنے والے یہودیوں کے حقوق یا سیاسی حیثیت پر کوئی ناموافق

اثر پڑتا ہو۔" اس اعلان سے محض ایک خواہش اور اسی کی حوصلہ افزائی ہی مترشح نہیں ہوتی بلکہ اس غدارانہ کی نامعقولیت اور بدسلیقگی بالکل عریاں ہو جاتی ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ برطانیہ اس اعلان میں اس امر سے انکار کرتا ہے کہ فلسطین ایک عرب ملک ہے اور ان ممالک میں شامل ہے جن کی آزادی کا وعدہ شریف حسین سے کیا گیا تھا۔ اس ستم ظریفی کو کون نہیں سمجھ سکتا کہ برطانیہ نے اس اعلان میں عربوں کو محض "غیر یہودی" قوم قرار دیتے ہوئے یہودیوں کو اس ملک کے حقیقی باشندے قرار دینے کی مذموم کوشش کی ہے۔ لیکن یہ اعلان کوئی قانونی حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ ایک طرف تو فلسطین کبھی برطانیہ کے مقبوضات میں سے نہ تھا کہ برطانیہ اسے یوں جب چاہے کسی دوسرے کو بخش دے دوسرے لارڈ بالفور کو قطعاً کوئی بین الاقوامی حیثیت حاصل نہ تھی۔

جہاں تک باشندگانِ فلسطین کا تعلق ہے خود اعلان کے اندر ایسے تحفظات موجود ہیں جو یکسر مہمل ہیں بشرطیکہ ابتدا ہی سے دینے کا فیصلہ نہ کر لیا گیا ہو کیونکہ فلسطین میں یہودیوں کے قومی وطن کے قیام کی خواہش بجائے خود اصلی باشندوں کے حقوق کے منافی ہے خصوصاً جب یہودیوں کے داخلے کے لئے فلسطین کے دروازے کھول دیئے جائیں۔ انہیں آباد کاری اور حصول کے لئے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں اور یہودیوں کے لئے اپنی تجاویز زیرِ عمل لانے کے لئے حکومت کے قانون اور حکومت کی قوت" اشتراک اپنی پوری جانگیری اور کامل قہرمانی قوت کے ساتھ وقف ہو چکا ہو۔

(۸)

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے اعلان بالفور سے برطانیہ کا مقصد بین الاقوامی سیاست میں اپنے سامراجی منصوبوں کے لئے یہودیوں کی اعانت حاصل کرنا تھا۔ برطانیہ کی یہ ہوس پرستی اس کے حلیفوں کے ساتھ معاہدات اور عربوں سے معاہدہ کے سراسر منافی تھی۔ لہٰذا برطانیہ نے صیہونیت اور یہودیوں کی طرف رجوع کیا اور انہیں اپنے سامراجی منصوبوں کا زبردست حامی پایا۔ برطانیہ کو اس سے کچھ سروکار نہ تھا کہ ایسا طریق عمل اسے وعدہ خلافی، دغابازی اور شرمناک غلط بیانیوں کا مرتکب قرار دے گا۔

برطانیہ کو اعلان بالفور اور اسی سامراجی پالیسی کے گناہ اور کھلی ہوئی ناانصافی کا کبھی کوئی احساس نہ تھا جس کی بدولت ہمارے متعدد ممالک بالخصوص فلسطینی عربوں کے سر پر بے پناہ مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹ پڑے فی الحقیقت اس پالیسی کی بدولت پورا فلسطین ایسی درندانہ خفیہ سازشوں اور فسادات کا مرکز بن گیا جن کے اثرات دور دراز ممالک تک پھیلے ہوئے ہیں۔ برطانیہ کے پاس اس طریق عمل کے لئے کوئی جواز نہ تھا۔

(۹)

صیہونی فلسطین میں ایک یہودی سلطنت کے قیام کا جواز یہودیوں کی اس قومی و سیاسی حیثیت پر مبنی قرار دیا گیا — جو انھیں اس ملک میں دو ہزار پانچ سو سال پہلے حاصل تھی۔ یہودیوں کی نگاہ میں تو فلسطین ان کا وطن ہے جس کی طرف انھیں واپس آنا ہی چاہیئے اور جس پر تصرف کی بدولت ان کی کھوئی ہوئی سیاسی و قومی عظمت دوبارہ حاصل ہو سکے گی۔ لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ یہودی اس دعوے سے متعلق ان حقائق کی طرف سے آنکھوں پر پٹی باندھ لیتے ہیں۔ جو ان کے نظریہ کے بخیئے ادھیڑ کر رکھ دیتے ہیں۔

یہودیت آج ایک قوم و نسل کی خصوصیات سے بالکل مبرا ہے آج دنیا میں انگریز، امریکن، فرانسیسی، جرمن اور روسی یہودی اسی طرح پائے جاتے ہیں جس طرح کیتھولک، آرتھوڈاکس اور پراٹسٹنٹ عیسائی۔

دو ہزار سال پہلے دنیا کے گوشے گوشے میں پراگندہ و منتشر رہنے اور قوموں اور نسلوں سے اختلاط و ازدواج کے بعد ان کا یہ دعویٰ کہ وہ بنی اسرائیل کی اولاد ہیں حد درجہ مضحکہ خیز ہے۔ دوسری قوموں کی طرح ان میں مفاد اور زبان کا کوئی اشتراک نہیں۔ عبرانی تو محض ان کی کتب مقدسہ کی زبان ہے۔ اس وقت عبرانی کو زندہ کرنے کی کوشش قومی و نسلی محرکات کی بنا پر نہیں محض صنعتی و سیاسی ضرورت پر مبنی ہے۔

فلسطین پر یہودیوں کا دعویٰ اصل میں ایسے لوگوں کا دعویٰ ہے۔ جن میں وہ یک آہنگی جو ایک قوم کا امتیاز ہے قطعاً مفقود ہے۔ قومیت، نسل، ثقافت، زبان اور معاشرت کے اختلافات کی وسیع خلیج انسانوں کی اس بھیڑ کے درمیان حائل ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر انھیں ضروری آسانیاں بہم پہنچائی جاتیں اور یہودی ایجنسی کی دہشت انگیزی کے خلاف ان کی حفاظت کی جاتی تو ان میں سے اکثریت ان ممالک کو واپس جانے کے لئے تیار تھی جہاں سے وہ لائے گئے تھے۔ جیسا کہ اینگلو امریکن کمیشن ۱۹۴۶ء کے روبرو واضح کیا گیا

مندرجہ بالا حقیقت ان لوگوں پر جنہوں نے اسی مسئلہ کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے اچھی طرح روشن ہو چکی ہے مزید برآں یہ یہودی فلسطین کے اصل باشندے نہ تھے۔ ان یہودیوں نے تو ملک کے ایک چھوٹے سے حصے پر تھوڑے عرصے کے لئے غاصبانہ قبضہ ضرور کر لیا تھا۔ اور یہ قلیل عرصہ انکے بزرگوں نے ملک کے اصلی باشندوں کے خلاف سازشوں اور جنگوں میں ہی صرف کر ڈالا۔ ملک کے اصلی باشندے کثیر تعداد میں ملک ہی میں موجود رہے اور انہوں نے اپنے رسم و رواج مذہب اور زبان کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ یہی نہیں خود یہودیوں کی تاریخی کتابوں سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچتی ہے کہ یہودیوں نے سیاست سماج اور مذہب میں ان اصلی باشندوں سے اثرات قبول کئے۔

فلسطین سے یہودیوں کا اخراج اس طرح اور اس حد تک عمل میں آیا کہ مذہبی یا تہذیبی طور پر ان کی کوئی قابلِ اعتنا یادگار وہاں باقی نہ رہی۔ بخلاف اس کے عرب جو صدیوں سے اہلِ فلسطین سے راہ و رسم رکھتے تھے۔ فلسطین ہی میں بس گئے اور اس کے اصلی باشندوں سے ان کا میل ملاپ بڑھتا رہا۔

ساتویں صدی میں فلسطین کی تاریخی فتح اسلامی نے تمام ملک میں عرب حکومت قائم کر دی۔ اس کے بعد بھی عرب ہجرت کر کے مسلسل اس ملک میں داخل ہوتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پورے طور پر اصل آبادی میں غلط ملط ہو گئے اور اس طرح تمام ملک پر عرب کا نقش ثبت ہو گیا۔

عرب فلسطین سے یہودیوں کے اخراج کے ذمہ دار نہ تھے۔ عربوں نے تو فلسطین کو بیزنطینوں سے لیا تھا جنہوں نے عربوں کی فتح کو عہد ناموں کی رو سے تسلیم کیا اور عرب خلفاء کے ساتھ گہرے تجارتی اور سیاسی تعلقات استوار کئے۔

فی الحقیقت عربوں کی فتح فلسطین کے وقت یہودیوں کو کوئی حیثیت حاصل نہ تھی ان کی ایک نہایت ہی قلیل تعداد یروشلم سے باہر بکھری ہوئی تھی لطف یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ اسلام کی خدمت میں یروشلم حوالے کرتے وقت عیسائی پادری نے یہ شرط لگا دی تھی کہ اس مقدس شہر میں یہودیوں کا داخلہ ممنوع قرار پائے۔

یہ حالت عربی حکومت کے ماتحت کوئی چودہ صدیوں تک قائم رہی جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے اس زمانے میں صرف چند ہزار یہودیوں کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے جو عربوں میں گھل مل گئے تھے اور عربوں کے زیر حفاظت اور ان کی عنایت و مروت سے ملک میں زندگی بسر کرتے تھے۔

پس یہ ایک محکم حقیقت ہے کہ فلسطین سے یہودیوں کا تعلق بحیثیت ایک قوم آج سے صدیوں پیشتر عربوں کی فتح فلسطین سے قبل ختم ہو چکا تھا۔ اس حقیقت کی بنا پر فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے اور واپس آ کر اس پر تصرف حاصل کرنے کی آرزو کی نامعقولیت عالم آشکار ہے۔ اگر اس ملک سے ان کے تعلقات جنہیں خیر باد کہے ہوئے انہیں صدیاں بیت چکی ہیں۔ زیادہ قریبی اور مضبوط بھی ہوتے تو بھی ان کا دعویٰ ہر طرح باطل تھا اب ایسے ہوائی حقوق کا احترام نہایت قومی وجوہ کی بنا پر قطعاً ناقابل قبول ہے۔ اور موجودہ حالات کے پیش نظر تو یہ مطالبہ بین الاقوامی معاشرت کا خاتمہ کر دینے والا ہے۔ بہر کیف فلسطین پر عربوں کا حق اس قدر محکم ہے کہ کسی دوسری قوم یا ملک کو یہ بات نصیب نہیں۔

کسی قوم کا کسی ملک میں واپسی اور اس پر تصرف کا مطالبہ اس بنا پر کہ کسی زمانہ گذشتہ میں یہ قوم وہاں سکونت پذیر تھی۔ حد درجہ مضحکہ خیز ہے۔ دنیا میں کون انصاف پسند صاحب ہوش یہودیوں کے اس مطالبہ پر غور

کرنے کے لئے تیار ہوگا۔

یہ حقیقت پہلے بھی واضح کی جا چکی ہے کہ یہودی آج ایک قوم یا نسل کے امتیازات سے قطعاً محروم ہیں یہودیت تو محض ایک مذہبی عقیدہ ہے جس کے پیروؤں کو ان ممالک کے قومی، سیاسی، سماجی اور لسانی اوصاف کا حامل قرار دیا جاتا ہے جن میں وہ پذیر ہیں۔

(۱۰)

یہ حقیقت عالم آشکار ہو چکی ہے کہ یہودیوں کے خلاف غم و غصہ کا وہ عالمگیر جذبہ اور ان کی وہ تعذیب جو دنیا کے گوشے گوشے میں ان کیلئے مقدر ہو چکی ہے فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کی علت اساسی ہے اور فلسطین میں یہودیوں کے لئے دوبارہ ایک سیاسی حیثیت و اہمیت حاصل کرنے کی کوشش کا سرچشمہ بھی یہی دعوےٰ باطل ہے مقام تاسف ہے کہ ایسے مطالبہ کی نامعقولیت مسلّمہ کے باوجود اہل غرض نے حقائق اور واقعات کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ ان حقائق میں سے سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ فلسطین وہ ویران و خراب نہیں جسے چند خانہ بدوش قبیلوں، حقیر جھونپڑوں اور چند دیہات کا مجموعہ بتایا جاتا ہے جس میں نیم وحشی لوگ بستے ہیں یہودیوں نے تو فلسطین پر اتحادی قبضہ سے پہلے ہی انگلستان، امریکہ اور دوسرے ممالک میں عوام کو دھوکے سے یہ باتیں باور کرانے کی بے شرمانہ کوشش شروع کر دی تھیں۔ فلسطین نہ ایک ویرانہ ہے نہ ایک پس ماندہ ملک وہ تو عربی ممالک کے ساتھ تہذیب و تمدن کی ترقی اور نظام عالم کے استقلال و استحکام میں مشغول حصہ لے رہا ہے۔ جہاں تک آبادی کا تعلق ہے فلسطین میں آبادی کی وہ کثرت ہے کہ اس لحاظ سے وہ اکثر ایشیائی ممالک آسٹریلیا، افریقہ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ یہاں تک کہ یورپ سے بھی آگے ہے۔ برطانوی اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۲۲ء میں فلسطین میں آبادی کی شرح ۱۰۷ نفوس فی میل تھی۔ اب یہ نسبت ۱۷۹ فی میل تک پہنچ چکی ہے۔ اور اگر بیرسینیا کا ریگستان رقبے سے خارج کر دیا جائے تو آبادی کا اوسط ۳۳۶ فی مربع میل ہو چکا ہے۔ اینگلو امریکن متحدہ کمیشن کی رپورٹ کے سرکاری اعداد و شمار مندرجہ بالا اطلاع کے حامل و مؤید ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ فلسطین دوسرے عرب ممالک کا ہمسایہ اور حصہ ہے جن کی مجموعی آبادی ۷ کروڑ سے زیادہ ہے۔ ساتھ ہی فلسطین ان اسلامی اقوام و ممالک سے متحد ہے جن کی مجموعی آبادی تیس کروڑ سے زائد ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ فلسطین اپنی ثقافت اپنی تہذیب اور سماجی، صنعتی اور زراعتی حیثیت کے لحاظ سے مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ کے ان ممالک کے ہم پایہ ہے جو اب آزادی کی نعمت سے بہرہ اندوز

اور خود مختار مہذب اقوام کے زمرہ میں شامل ہیں ۔
اس اعتبار سے بھی فلسطین ان سے بعض ملکوں سے
بہتر ہے جو بیشتر ازیں عرض کیا جا چکا ہے اس سے
صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہودیوں کا ان ممالک سے
جہاں انھیں مستوجب تعذیب قرار دیا جا چکا ہے اور
جہاں ان کے خلاف غم و غصہ کی لہریں بلند ہو چکی ہیں
نکال نکال کر فلسطین میں منتقل کر دینا ان کی مشکلات
کا کوئی حل نہیں ہے ۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ وہ مقصد
جس کے وہ کوشاں ہیں بمشرق قریب اور مشرق وسطے
میں ایسے تنازعات و مصائب پیدا کر دے گا جو یہودیوں
کے خلاف غیظ و غضب کا وہ طوفان اٹھائیں گے
کہ ان کی حالت ان ممالک کے مقابلے میں جہاں سے
انھیں منتقل کیا جا رہا ہے زیادہ مہلک ثابت ہوگی
یہ جذبہ پیدا ہو چکا ہے اور واقفانِ حال سے
پوشیدہ نہیں کہ روز افزوں ترقی پر ہے ۔ یہودیوں
کا فلسطین پر تصرف کرانا ایک ایسے ملک پر حملہ ہے کیسے
یہودیوں پر ا اقتدار پڑی ہے اس کا کسی طرح ذمہ دار
قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ فلسطین عربی اور اسلامی ممالک
سے ثقافت اور خون کے رشتوں سے پیوستہ
ہے ۔ لہٰذا یہ فرض کر لینا کہ فلسطین عرب یوں آسانی
سے اپنے ملک کو یہودیوں کے حوالے کر دینے پر رضا
مند ہو جائیں گے ایک خام خیالی ہے بالخصوص جبکہ
وہ حروب صلیبیہ میں دو سو سال تک اس کے لئے
نبرد آزما رہے ۔ اور اس وقت تک چین نہ لیا جب
تک اس سرزمین کو حملہ آوروں سے پاک نہ کر لیا ۔
عربوں نے اپنی طویل و صبر آزما قربانیوں سے اسے عربی
خصوصیات کا حامل بنائے رکھا ہے ۔

(۱۱)

حکومت برطانیہ نے ان حقائق میں سے کسی پر توجہ کی
اور نہ ہی اپنی پالیسی کے مہلک نتائج پر دھیان دیا اسے
تو اپنی غیر محدود سامراجی ہوس کی تکمیل ہر طرف سے مدعا
کئے ہوئے تھی ۔ اور سچ تو یہ ہے کہ برطانیہ کو اس مجوزہ
روزگار تجویز میں جس کی پشت پناہی کے لئے سیاسی
اثر رکھنے والے اور دولت کے خزانوں کے مالک
یہودی مجنونانہ وار آمادہ ہو چکے تھے ۔ اپنے ہی مقاصد
کے حصول کا ذریعہ نظر آیا اور برطانیہ نے عربوں سے غداری
کرنے میں قطعاً تامل نہ کیا ۔

(۱۲)

۱۹۱۷ء میں اتحادیوں کے مجوزہ بالا باہمی معاہدات کی
اشاعت اعلان بالفور کی اطلاع شریف حسین کو اس وقت
ملی جب جنگ ابھی جاری تھی ۔ اور شام و فلسطین پر اتحادیوں
کا مکمل قبضہ نہیں ہوا تھا ۔ اس خبر سے عربوں میں اس درجہ
تشویش پیدا ہوئی کہ اتحادیوں کی طرف ان کے رویہ
میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا ۔ جہاں تک انہوں نے
ترکوں سے ایک جداگانہ صلح گفت و شنید بھی شروع
کر دی ۔ شریف حسین نے اتحادیوں کے باہمی خفیہ

معاہدات اور اعلان بالفور پر بے حد ناراضی کا اظہار کیا۔ اس کے خلاف برطانوی حکومت سے، زبردست احتجاج کیا ہے۔ ایک تار کے ذریعہ جو ۸ فروری ۱۹۱۸ء کو روانہ کیا گیا۔ حسب معاہدہ سابق آزاد عرب حکومت کے قیام کے وعدہ کی تجدید کرتے ہوئے اسے اطمینان دلایا کہ اس نے جو کچھ سنا وہ شریف حسین اور اتحادیوں میں منافرت پیدا کرنے کے لئے ترکوں کی سازش کے سوائے کچھ حقیقت نہیں رکھتا برطانوی حکومت نے اس تار کے مضمون کی تائید کے لئے ایک خاص سفیر بھی روانہ کیا برطانیہ کی ان کوششوں اور مواعید کی تصدیق، توثیق و سفارت نے عربوں کی تشویش کو فرو کر دیا۔

(۱۳)

یہ حقیقت اب عالم آشکار ہو چکی ہے کہ اتحادیوں نے ولسن صدر جمہوریہ امریکہ کی چودہ بنیادی شرائط صلح تسلیم کر لیں اور انہیں شائع کر دیا گیا۔ اور انہی شرائط پر جرمنی اور اس کے ساتھیوں نے ہتھیار ڈال دیئے انھیں شرائط کے مطابق تکمیل صلح سے پیشتر کے تمام خفیہ معاہدات کالعدم اور تسخیر و تصرف کے تمام نظریات مسترد قرار پائے۔ کمزور اقوام کے لئے اصول خود اختیاری تسلیم کیا گیا۔ عربوں کو یہ باور کرانے سے کہ اتحادی ان اصولوں کا احترام کریں گے۔ بہت اچھا اثر پڑا۔

(۱۴)

ترکی افواج کے اخراج اور اتحادی اور امیر فیصل کی افواج کے داخلے کے فوراً بعد اتحادی افواج کے سپہ سالار نے ۸، نومبر ۱۹۱۸ء کو شام، لبنان اور فلسطین میں مندرجہ ذیل اعلامیہ شائع کیا۔

"مشرق میں وہ جنگ لڑنے میں جو اہل جرمنی کی ہوس کا نتیجہ ہے۔ فرانس اور برطانیہ نے ان لوگوں کی کامل اور قطعی آزادی کو منزل مقصود قرار دیا ہے۔ جو ترکوں کے پنجہ ستم میں مدتوں گرفتار رہے ہیں۔ اور ساتھ ہی ان کا مقصود ان ملکوں کے لئے ایسے نظم اور حکومت کا قیام ہے جن میں اختیارات کا سرچشمہ ان ممالک کی اصلی آبادی کی آزادانہ خواہش اور پسند ہوگا۔

ان ارادوں کی تکمیل کے لئے فرانس اور برطانیہ دمشق میں جو آزاد ہو چکے ہیں۔ خود ان ممالک کے خود باشندوں ہی کی طرف سے نظم حکومت کے قیام کی تائید میں متحد ہیں۔ ان علاقوں کے لئے بھی جنہیں اتحادی آزاد کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایسے ہی نظام اور حکومت کے قیام کے حامی ہیں۔ یہ حکومتیں جونہی قائم ہوں گی تسلیم کر لی جائیں گی۔

ان علاقوں کی آبادی پر کسی قسم کا نظام عائد کرنے کے بجائے فرانس اور برطانیہ کی خواہش ان نظامات اور حکومت کے لئے جو ان باشندوں کی آزادانہ پسند پر مبنی ہوں، موثر امداد بہم پہنچانا ہے۔ نیز فرانس اور برطانیہ کی

خواہش سب کے لئے غیر جانبدارانہ اور مساوی انصاف مہیا کرنا اور مقامی کوششوں کے ذریعہ ملک کی معاشی ترقی کا سامان بہم پہنچانا تعلیم کا پھیلانا اور ان باہمی نزاعات خاتمہ کرنا ہے جن سے ترکی پالیسی دیر تک مستفید ہوتی رہی ہے۔ یہ اس فرض کی نوعیت ہے جو دونوں اتحادی طاقتیں آزاد شدہ علاقوں میں انجام دینا چاہتی ہیں۔"

اس اعلان سے برطانیہ کی نیت سے متعلق جو شبہات عربوں کے دلوں میں جاگزیں ہو گئے تھے۔ ان کا ازالہ ہو گیا اور عربوں میں دوبارہ ایک اطمینان اور سکون پیدا ہو گیا۔

(۱۵)

لیگ آف نیشنز کے میثاق کی بائیسویں دفعہ جس کا تعلق ان علاقوں اور آبادیوں سے ہے جو دوسری حکومتوں کے اقتدار سے اب آزاد ہوئی ہیں حسب ذیل ہے۔

"بعض قومیں جو پہلے سلطنت عثمانیہ کے زیر اقتدار تھیں ترقی کی اس منزل پر پہنچ چکی ہیں جس میں ان کی آزادی و خود مختاری عارضی طور پر اس شرط پر تسلیم کی جا سکتی ہے کہ جب تک وہ خود اپنے معاملات سنبھال نہ لیں حکومت انتدابیہ انہیں نظم و نسق میں مشورہ و امداد دیتی رہے حکومت انتدابیہ کے انتخاب میں انہی اقوام کی خواہشات کو بڑی حد تک ملحوظ رکھا جائے گا۔"

برطانیہ اور شریف حسین کے مابین ایک آزاد عرب حکومت کے قیام سے متعلق معاہدہ کی دفعات اور مندرجہ بالا دفعات میثاق لیگ۔ اختتام جنگ پر ان عرب ممالک کی آزادی کے لئے پختگی کا اولین بین الاقوامی وعدہ ہے۔ جو پہلے سلطنت ترکیہ کے زیر اقتدار تھے۔ فلسطین بھی انہی ممالک میں شامل تھا۔ لہٰذا فلسطین میں بھی انتداب کا انتخاب بھی اصلی آبادی کی خواہش کے مطابق ہونا چاہیئے تھا۔ اور قوت انتدابیہ کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہونی چاہیئے کہ زیر انتداب اقوام کو نظم و نسق ملک و ممالک میں مشورہ اور اعانت بہم پہنچائے تاآنکہ یہ اقوام و ممالک اپنے معاملات خود پورے طور پر انجام دینے کے اہل ہو جائیں یہ وعدہ بھی فلسطین اور دوسرے عربوں کے دلوں میں اپنے ممالک میں اپنی آئندہ سیاسی حیثیت سے متعلق ایک اطمینان خاطر پیدا کرنے کا موجب ہوا

(۱۶)

اتحادی مجلس اعلےٰ نے اسی سال صورت حال کا مقامی طور پر مطالعہ کرنے اور باشندگان فلسطین کی خواہشات معلوم کرنے کی غرض سے ایک بین الاقوامی تحقیقاتی کمیشن بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ بعض خاص وجوہ کی بنا پر اس کمیشن کو صرف امریکن نمائندگان تک ہی محدود رکھا گیا۔ اس کمیشن کا نام کنگ کرین کمیشن تھا۔

اس کمیشن نے جون اور جولائی ۱۹۱۹ء میں پہلے فلسطین اور بعد میں شام اور لبنان کے بعض علاقوں کا دورہ کیا۔

اس کمیشن کی رپورٹ کے مطابق جو صدر جمہوریہ ولسن کے روبرو پیش ہوئی اور ۱۹۲۲ء میں شائع بھی ہوئی ان تینوں ملکوں نے فلسطین میں ان کے داخلے کی مخالفت کی اور شام کے اندر شامل اور اس کا ایک جزو لاینفک کیونکہ فلسطین کو متصور کیا تھا۔ جیسا کہ اس کمیشن کے روبرو پیش کردہ شہادتوں اور لاتعداد دستاویزات کے حوالے سے کنگ کرین کمیٹی یوں رقمطراز ہے :۔

"یہ امر خاص طور پر قابل ذکر صیہونی پروگرام کے خلاف جذبہ صرف فلسطین تک ہی محدود نہیں بلکہ جیسا کہ ہمیں اپنی کانفرنسوں میں واضح طور پر معلوم و محسوس ہوا۔ شام کے عوام میں بھی پھیلا ہوا ہے۔ شام کے تمام محضر ناموں میں سے جن کی تعداد ۱۳۵۰ تک پہنچتی ہے۔ ۷۲ فی صدی صیہونی پروگرام کی مخالفت میں تھے۔ اکثریت کی حمایت متحدہ شام اور آزادی دیہی کے پروگراموں کو حاصل تھی۔ اس احساس عامہ کی ترجمانی کا حق شام کی جنرل کانگرس نے اپنی ساتویں، آٹھویں اور دسویں قرارداد میں ادا کیا تھا۔ افسروں کا بالعموم یہ اندازہ تھا کہ صیہونی پروگرام پر عملدرآمد کے آغاز کے لئے ہی کم از کم پچاس ہزار سپاہیوں کی ضرورت لاحق ہوگی یہ چیز بجائے خود فلسطین اور شام کی غیر یہودی آبادی ناانصافی کے خلاف مخالفت کا مترادف ہے۔

بعض اوقات بلاشبہ ایسے فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ جو نفاذ کے لئے بڑی بڑی افواج کے محتاج ہوتے ہیں۔ لیکن ایسے فیصلوں کو خواہ مخواہ ایک کھلی ہوئی ناراضگی کے لئے اختیار کرنا بے حد غیر ضروری ہے۔ صیہونی نمائندوں کی طرف سے اکثر فلسطین پر اپنا حق یہ کہہ کر جتایا جاتا ہے کہ دو ہزار برس پہلے ان کا اس ملک پر قبضہ تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ مطالبہ جو ایسی دلیل پر مبنی ہے ہرگز قابل التفات نہیں"۔

کنگ کرین کمیشن کے دورے نے بڑی حد تک عربوں کی تشویشات کو کم کر دیا اور ان کے دلوں میں اپنے مقاصد قومی کے حصول کی امید دوبارہ زندہ ہوگئی۔

(۱۷)

بدقسمتی سے واقعات مابعد نے حق و انصاف کی پامالی کے ساتھ ساتھ عربوں کی امنگوں اور آرزوؤں کا بھی خون کر دیا۔ سامراجی منصوبے ان بلند بانگ دعاوی پر جو اتحادی دوران جنگ میں کرتے تھے، غالب آ گئے۔ عرب تو اس امید اور اس شرط پر جنگ میں شامل ہوئے تھے کہ ان سے جو وعدے کئے گئے تھے ایمانداری سے وفا کئے جائیں گے لیکن سامراجی ہوس کے ہاتھوں ان وعدوں کا وہ حشر ہوا کہ دنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔ یہ وعدے کنگ کرین کمیٹی کے نتائج، خود اختیاری کا اصول اور جمعیۃ الاقوام کا میثاق بھی برطانیہ کی ہوس استعمار کی نذر ہو گئے۔ فلسطین پر انتداب مسلط کر دیا گیا۔ جو فی الحقیقت اس عرب ملک پر تصرف بزور شمشیر سے کم نہ تھا۔ اور دوسری طرف فلسطین کو شام سے

جدا کرنے اور اسے یہودیوں کا وطن بنانے کا ایک اہتمام تھا۔

(۱۸)

باوجود اس حقیقت کے کہ شام، عراق اور لبنان کے انتداب کے مشن میں اس امر کی خاص وضاحت موجود تھی کہ قوت انتدابیہ کا کام علاقہ زیر انتداب کو نظم ونسق حکومت میں مشورہ دینا اور اعانت کرنا ہوگا۔ یہاں تک کہ زیر انتداب علاقے خود مختاری کے قابل ہو جائیں۔ قوت انتدابیہ کا یہ بھی فرض قرار دیا گیا تھا کہ علاقہ زیر انتداب کو خود مختاری کے قابل بنائے فلسطین کا انتداب بے ضابطگیوں اور بوالعجبیوں کا ایک نادر مُرقع تھا۔ ان بے ضابطگیوں نے انتداب کے مقصود سیاسی کے پیکر و روح دونوں کو مجروح و پامال کیا۔ درآں حالیکہ انتداب کے دیباچہ میں اس امر کا اعلان بہ صراحت موجود ہے کہ نظم ونسق میں مشورہ اور اعانت کے ذریعے انتداب کا مقصد خصوصی باشندگان کو خود مختاری کا اہل بنانا ہے۔ انتداب لیگ آف نیشنز کے میثاق کی دفعہ ۲۲ کے مطابق جیسا کہ حسب ذیل اقتباس سے واضح ہو سکتا ہے۔ عمل میں آیا تھا۔

"ہر گاہ دول عظام متحدہ نے لیگ آف نیشنز کے میثاق کی دفعہ ۲۲ کے مطابق فیصلہ کیا ہے کہ ان دول کی طرف سے منتخب کی گئی ایک قوت کو علاقہ فلسطین کے نظم ونسق کا جو پہلے ترکی سلطنت کا ایک حصہ تھا انتداب سپرد کیا جائے۔"

شومئی قسمت سے اتحادیوں نے لیگ کے میثاق کی دفعہ کی محولہ بالا شرائط کی خلاف ورزی کی اور ان ممالک کے باشندوں کی خواہشات کو بالعموم اور فلسطینی عربوں کی خواہشات کو بالخصوص نظر انداز کرتے ہوئے فلسطین کو شام سے علیحدہ کر دیا اور اصل باشندوں کے جذبات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے فلسطین پر انتداب اور یہودی وطن دونوں مسلّط کر دیئے گئے۔ حالانکہ یہ ممالک ان دونوں امور کی مخالفت کر کے انہیں مسترد کر چکے تھے۔

(۱۹)

مقدمہ انتداب میں اعلان بالفور کی شمولیت لیگ کے میثاق کی دفعہ ۲۲ کے دیانتدارانہ اطلاق کی دوسری خلاف ورزی ہے۔ کیونکہ ملک کی بہت بڑی اکثریت اعلان بالفور اور اس کے لازمی ہولناک اور تباہ کن نتائج کی مخالف تھی۔ اعلان بالفور کو اتحادی طاقتوں نے تسلیم کر لینے کا جواز فلسطین سے یہودیوں کے قدیم تاریخی تعلق اور فلسطین میں ان کے قومی وطن کے قیام کے دلائل پر مبنی رکھا۔ یہ توجیہہ حد درجہ ناقابل قبول و دعاوی باطل ہیں جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ بین الاقوامی مواعید کی تباہی و بربادی ایسا اسلوب بیان اختیار کیا گیا۔ جو اعلان بالفور کی منشا اور لیگ میثاق کی دفعہ ۲۲ کے جانبدارانہ مفہوم سے مطابقت پیدا کر سکے۔ اس طرح جو اتحادی اس میں داخل کرنا چاہتے تھے

جیسا کہ شرائط کے مندرجہ ذیل متن سے واضح ہو سکتا ہے

دفعہ (۱)

قوت انتداب کو نظم و نسق اور قانون سازی کے کامل اختیارات حاصل ہوں گے بہ استثنا ان حدود کے جو اس انتداب کی شرائط سے پیدا ہوتی ہوں۔

دفعہ ۲:۔

قوت انتداب ملک کو ایسے سیاسی، انتظامی اور معاشی حالات میں رکھنے کی ذمہ دار ہوگی جو جیسا کہ مقدمہ میں بیان کیا گیا ہے۔ یہودی قومی وطن کے قیام کے منشا کے حصول کا موجب ہوں اور خود مختارانہ ادارت کی ترقی کے معاون اور جملہ باشندگان فلسطین کے بلا لحاظ نسل و مذہب ملکی، مذہبی حقوق کے محافظ ہوں۔

دفعہ ۳:۔

انتدابیہ جہاں تک حالات اجازت دیں مقامی خود اختیاری رائج کرے گی۔

دفعہ ۴:۔

ایک موزوں یہودی ایجنسی کو حکومت فلسطین کے ساتھ اشتراک عمل اور امور میں اعانت کے لئے جو فلسطین میں ایک یہودی وطن کے قیام سے متعلق پیدا ہونے والے معاشی، معاشرتی اور دوسرے مسائل نیز فلسطین کی یہودی آبادی کے مفادات پر اثر انداز ہونے والے معاملات میں ایک سرکاری انجمن تسلیم کر لیا جائے گا۔ اس انجمن کا کام حکومت کے زیر نگرانی ملک کی ترقی میں حصہ لینا ہوگا۔ صیہونی انجمن کو جب تک انتدابیہ کی نظر میں اس کا نظم و آئین مناسب ہے ایسی ایجنسی تسلیم کیا جائے گا یہ حکومت برطانیہ کے مشورہ سے ان تمام یہودیوں کا اشتراک عمل حاصل کرے گی۔

دفعہ ۶:۔

فلسطین کا نظم و نسق اس امر کا ضامن ہوتے ہوئے کہ آبادی کے دوسرے طبقات کے حقوق و حیثیت پر کوئی مخالف اثر نہ ہو۔ مناسب حالات کے ماتحت یہودی ایجنسی محولہ دفعہ ۴ کے اشتراک عمل سے یہودیوں کی باہم دگر پیوستہ آبادکاری کی حوصلہ افزائی کرے گا۔ اور اس غرض کے لئے انہیں سرکاری زمینیں اور ایسی غیر آباد اراضی بھی دے گا جو کسی سرکاری مقصد کے لئے درکار نہ ہوگی۔

دفعہ ۷:۔

فلسطین کی حکومت پر لازم ہوگا کہ ایک فلسطینی قومیت کا قانون تیار کرے۔ یہ قانون ان لوگوں کے لئے جو فلسطین میں مستقل رہائش اختیار کریں۔ فلسطینی شہریت کے حصول میں آسانیاں پیدا کرے گا۔

دفعہ ۱۱:۔

فلسطین کی حکومت ملک کی ترقی کے لئے قوم کے تمام مفادات کی محافظ ہوگی۔ اور ایسی بین الاقوامی ذمہ داریوں کے ماتحت جو انتدابیہ منظور کرے اسے پورا پورا اختیار

حاصل ہوگا کہ ملک کے قدرتی وسائل یا پبلک ورکس پر یا ان خدمات یا افادات پر جو موجود ہیں یا آئندہ معرض وجود میں آئیں سرکاری قبضہ کر سکتی ہے۔ زمین پر گنجان آبادکاری اور کاشت عمیق کے پسندیدہ اصول کو تسلیم کرتے ہوئے حکومت ایک مناسب نظام اراضی نافذ کرے گی۔

(دفعہ ۱۴) حکومت یہودی ایجنسی محولہ ۴ کے ساتھ یہ انتظام کر سکتی ہے کہ وہ مناسب اور منصفانہ شرائط پر کسی ادارہ رفاہ عامہ کی تعمیر کرے۔ کسی قسم کی خدمات عامہ اور افادات کی تعمیر کرے۔ یا ان سے کام لے اور ملک کے قدرتی وسائل میں سے کسی کی ترقی کا اہتمام کرے۔ جب حکومت براہ راست ان امور کو بخود انجام دینے پر آمادہ نہ ہو کسی ایسے انتظام میں اس امر کا لحاظ یا بلا واسطہ تقسیم نہیں کرے گی جو سرمایہ منقولہ پر مناسب شرح سود سے متجاوز ہو۔ اس حدِ مناسب سے متجاوز منافعات ملک کی بہتری کے لئے ایسے طریقوں پر خرچ کئے جائیں گے جنہیں حکومت کی منظوری حاصل ہو۔

دفعہ ۲۲:۔

انگریزی، عربی اور عبرانی فلسطین کی سرکاری زبانیں ہوں گی۔ ٹکٹ اور سکے پر جو کہ عربی عبارت ثبت ہو گی عربی عبرانی میں بھی درج ہو گی۔ اور جو عبارت عبرانی میں لکھی جائے گی، وہی عربی میں بھی تحریر ہو گی۔

(۲۰)

اعلان بالفور میں فلسطین کے عربوں کو غیر یہودی قوم کا جو حقیر خطاب دیا گیا ہے اس سے مُراد یہ ہے کہ ملک کے اصلی باشندے عرب نہیں یہودی ہیں۔ یہ واقعات نہایت ہی مذموم تحریف ہے انتداب نے یہودی قومی وطن کے قیام سے متعلق یہودیوں کی حمایت میں زبردست ذمہ داریاں اپنے اوپر لازم کر لیں اور یہودی ایجنسی کو اس طرح امتیاز و اہمیت بخشی گئی کہ گویا ایک حکومت کے اندر دوسری حکومت قائم ہو گئی۔

انتداب کی شرائط مالکان اراضی اور ملک کے جائز باشندوں کے ساتھ ایک کھلی ہوئی ناانصافی ہے۔ یہ شرائط وعدہ خلافیوں اور پیمان شکنیوں کا ایک ہولناک مُرقع ہیں جو عربوں کے حقوق کے منافی اور ان کی خواہشات کے خلاف ہیں۔ یہی شرائط عربوں کی آزادی کے راستے میں مستقل روک بنی ہوئی ہیں۔ اور انہی شرائط کی بدولت عربوں پر بزور شمشیر اور نوک سنگین وہ حالت عائد کر دی گئی ہے جو ان کے بہترین مفادات کی بربادی کا باعث بن رہی ہے۔ یہ صورت حال عربوں نے منظور کرنے سے پُر زور انکار کر دیا ہے۔ اور اس کے خلاف ان کا پُر زور احتجاج قائم رہے گا۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ حکومت فلسطین، جس کا ذکر دفعات انتداب میں موجود ہے محض ایسی حکومت ہے جسے یوم قیام سے آج تک وزارت مستعمرات کے ایک برطانوی شعبہ سے زیادہ حیثیت نصیب نہیں ہوئی۔ اور اسے شام، لبنان

اور عراق کی ان حکومتوں سے جو ان ملکوں میں شرائط
انتداب کی اشاعت کے بعد قائم ہوئیں دور کی بھی
نسبت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فلسطینی عربوں کو
ملک کی مجلس قانون ساز یا منتظمہ کونسل میں آج
تک کوئی نمائندگی حاصل نہیں ہوئی اور یہ صورت
حال جیسا کہ پیشتر ازیں ذکر ہو چکا ہے۔ جہاں تک
فلسطین کا تعلق ہے قوت انتداب اور علاقہ انتداب
کے اصول ہی کا قلع قمع کر دیتی ہے۔

(۲۱)

اعلان بالفور میں جو مقدمہ انتداب
میں شامل ہے۔ غیر یہودی قوموں یعنی عربوں
کے حقوق اور سیاسی حیثیت سے متعلق تحفظ
موجود تھا اور خود انتداب کی دفعات بھی ایسے
ہی تحفظ کی حامل ہیں۔ لیکن برطانیہ نے ان تحفظات
کے منشا کا کبھی بھی احترام نہ کیا۔ بلکہ برطانیہ
اور صیہونیوں کے اشتراک عمل سے انتداب پر حد
درجہ جانبدارانہ عملدرآمد ہوتا رہا۔

ان سازشوں میں ایک بڑی سازش
سر ہربرٹ سیموئل ایک یہودی کو حکومت فلسطین
کا ناظم اعلیٰ مقرر کرنا تھا اسی طرح نارمن بنوچ کو
حکومت فلسطین میں پہلا مشیر معدلت مقرر کر کے۔
یہودیوں کو اہم شعبہ جات حکومت پر مسلط کر دیا گیا۔
اور یہودی کمپنیوں کو فلسطین میں بجلی پیدا کرنے اور
بحیرۂ مردار سے معاشی فوائد حاصل کرنے کا ٹھیکہ
دیا گیا۔ اور ایسے ہی دوسرے پُر منفعت کام یہودی
کمپنیوں کے سپرد کر دیئے گئے۔ انتداب پر اس طرح
عملدرآمد سے عربوں کو یقین واثق ہو چکا ہے کہ برطانیہ
عربوں کے حق میں تحفظات کے مواعید کی خلاف
ورزی پر تلا بیٹھا ہے۔ اور سوائے ان ذمہ داریوں
کے نفاذ کے جن سے یہودیوں کو فائدہ پہنچے اسے
اپنے مواعید اور اپنی ذمہ داریوں کی ذرہ برابر پرواہ
نہیں ہے۔

برطانیہ کی اس حکمت عملی نے عربوں کے جائز حقوق
ہی کو پائمال نہیں کر دیا بلکہ انہیں طرح طرح کے
کے نقصانات و مشکلات میں مبتلا کر کے ان کی
زندگی اور ان کی آبرو کو خطرے میں ڈال دیا ہے
مثلاً آبادی میں ان کا جو تناسب ۱۹۱۸ء میں ۹۳
فی صدی تھا۔ یہودیوں کے آزادانہ داخلہ کی وجہ
سے ۱۹۴۷ء میں ۶۵ فی صدی رہ گیا ہے۔ اور
یہودیوں کی تعداد میں جو فلسطین پر برطانوی قبضہ
کے وقت تھی سے ۱۲ فی صدی اضافہ ہو چکا ہے۔
وہ پہلے ۷ فیصدی تھے اب ۳۵ فیصدی ہیں یہی
حال زمینوں کا ہے جو عربوں کے قبضے میں تقسیم
فلسطین کی قابل آب پاشی زمین کا ۲۲ فیصدی اور
زرخیز ترین اراضی کا ۶۰ فیصدی رقبہ یہودیوں کے
تصرف میں جا چکا ہے حالانکہ ۱۹۱۸ء میں قابل کاشت

زمین کا صرف پانچ فیصدی یہودیوں کے پاس تھا۔
ان ظالمانہ حرکتوں کی بدولت عربوں یعنی
حقیقی مالکان اراضی کو بے دخل کر دیا گیا ہے۔
اور تنگ دستی نے ان کی زندگی تلخ کر رکھی ہے۔
حقیقت تو یہ ہے کہ ان جوع الارض کی بدولت فلسطین
میں کتنے ہی عرب دیہات، مساجد، درگاہیں اور
اور قبرستان ملیامیٹ ہو چکے ہیں۔ یہاں ایک طویل
فہرست ناموں کے ثبوت میں پیش
کی جا سکتی ہے۔

صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ برطانوی حکومت
نے اپنے قوانین کو یہودیوں کی صنعتوں کی اعانت اور
عرب صنعتوں کی مخالفت میں اس تیزی اور شدت
سے استوار کیا ہے کہ ایک طرف تو یہودی صنعتوں کو
بے اندازہ ترقی حاصل ہوئی ہے اور دوسری طرف
عرب صنعتیں صرف فلسطین ہی نہیں دوسرے عربی
ممالک میں بھی دم توڑ کر رہ گئی ہیں۔

یہودیوں کو حکومت کی امداد سے تجارت
پر بھی وہ قابو حاصل ہو گیا ہے کہ وہ فی الحقیقت
ملک بھر میں مطلق العنان فرمانروا بن گئے ہیں
یہودیوں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اپنے بے پناہ
مقابلے سے عرب مزدوروں تک کو بے روزگار
کر دیا ہے۔ حکومت نے عربوں کی ان اراضی کے
جو ان کے زیر کاشت نہیں یا بطور چراگاہ استعمال
ہوتی تھیں۔ یہودیوں کے پاس منتقل ہو جانے کے
عمل کو ہر طرح مسلسل فروغ دے رکھا ہے۔

یہ زمین عربوں کا ذریعہ معاش اور ان کی اولاد کا
آخری سہارا تھی۔ حکومت کے لطف و کرم نے انھیں
یہودیوں کے تصرف میں پہنچا کر عربوں کی موجودہ اور
آئندہ نسلوں کی مفلوک الحالی کا اہتمام مکمل کر دیا ہے۔

قانون اور امن کی حفاظت کے لئے پولیس کی روز افزوں
تعداد میں ضرورت کی بنا پر حکومت کے مصارف بڑھتے
چلے جاتے ہیں۔ حکومت نے فلسطین کو یہودیوں کا وطن
بنانے کی جو پالیسی اختیار کر رکھی ہے اس کا لازمی نتیجہ
آبادی اور رقبہ کے تناسب کے لحاظ سے نہایت
کثیر تعداد میں نفری کی ضرورت کا لاحق ہونا ہے
نتیجہ یہ ہے کہ مصر، عراق، لبنان اور شام دوسرے
عربی ممالک کے مقابلے میں فلسطینیوں کو بالعموم چار
گنا زیادہ ٹیکس ادا کرنے پڑتے ہیں۔ تمام سرکاری
دفاتر میں یہودی افسروں کو اس کثرت سے ٹھونس
دیا گیا ہے کہ عرب سرکاری ملازم آٹے میں نمک ہو کر
رہ گئے ہیں۔ اور عام طور پر ان دفاتر پر یہودی افسروں
کا قبضہ اس قدر مستحکم ہے کہ وہ کھلے بندوں یہودی
افسروں کو تقویت پہنچانا اور عربوں کے حقوق پامال کرنے
کا مقدس فرض انجام دیتے ہیں۔ فلسطینی عربوں کو
حکومت برطانیہ کی پالیسی نے ایک طرف تو آزادی و
خود مختاری سے محروم رکھا اور دوسری طرف ملک کے

نظم ونسق میں انھیں کوئی حصہ نہ لینے دیا اندریں حالات عربوں کو ملک کی معاشی، ثقافتی، سماجی اور سیاسی ترقی میں حصہ نہ لینے کا ملزم کیونکر گردانا جاسکتا ہے۔

ابتداء کار ہی سے یہودیوں نے اسلامی مقاماتِ مقدسہ پر قبضہ جمانے کی نیت کا ثبوت بہم پہنچا دیا۔ یہودیوں نے یہ جانتے ہوئے کہ حکومت ہر ممکن کوشش سے ان کی حمایت پر آمادہ ہے اور ان سے ملائمت اور تلطف کا برتاؤ کر رہی ہے اسلامی مقاماتِ مقدسہ پر قبضہ جمانے کی سازشیں شروع کر دیں۔ ان کی جسارت یہاں تک بڑھی کہ انھوں نے مسجد الاقصےٰ کو ایک یہودی مسجد اور اس طرح اسے سلیمان کے ہیکل میں بدل دینے کے ارادے کا اعلان کر دیا۔

یہودیوں کا یہ اعلان جس نے بعض نامور برطانوی زعماء کو بھی ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ۱۹۲۹ء کے فسادات کی اصل وجہ تھا۔ عربوں نے ان ناانصافیوں سے تنگ آکر جو ان پر مسلط کر دی گئی تھیں اور مستقبل کی ہولناک تاریکیوں کو دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے یہ سوالات کرنے شروع کر دیئے۔

"ہمارا کیا حشر ہونے والا ہے۔ ہم ان بے پناہ مشکلات اور مصائب سے کیوں کر نجات پا سکتے ہیں۔ ہم نے اپنے اتحادیوں یعنی برطانیہ سے کیا سلوک روا رکھا ہے۔ جس کی یہ سزا ہے۔ وہ ہم پر روز افزوں ظلم و جبر کر رہے ہیں۔۔۔ وہ ہماری مشکلات بڑھاتے جا رہے ہیں۔ وہ ہمارے ملک میں فسادات کی آگ بھڑکا رہے ہیں۔ وہ ایسی حکمتِ عملی پر کاربند ہیں جو ہماری آئندہ نسلوں اور خود ہمارے لئے ایک خوفناک خطرے کا باعث ہے۔ حکومت نے بزور شمشیر ہم پر وہ پالیسی نافذ کی ہے جس کا لازمی نتیجہ اہلِ برطانیہ یہودیوں اور عربوں، سبھی کے لیے ایک مصیبت کا باعث ہوگا۔" (۲۲)

۱۹۳۷ء کے شاہی کمیشن کی رپورٹ سے ثابت ہوتا ہے کہ فلسطین کا انتداب اس پروگرام کا ایک خاکہ تھا جو یہودیوں نے اپنے لیے تیار کیا تھا اس رپورٹ کے مندرجہ ذیل اقتباس سے اس نظریہ کی تصدیق و تائید ہوتی ہے۔

"تین فروری ۱۹۱۹ء کو صیہونی انجمن نے ایک قرارداد کا مسودہ پیش کیا جس میں اعلان بالفور کے نفاذ کا ایک خاکہ موجود تھا۔ اس تحریک کے رہنماؤں نے ۲۷ فروری کو ہائی کونسل کے روبرو اپنی تجاویز کی وضاحت کی اس کے بعد ۲۸ مارچ کو مسٹر بنکس فیر نیکفرٹر ایک ممتاز امریکن صیہونی نے ایک مفصل منصوبہ تیار کیا ان دستاویزات اور واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک صیہونی پروگرام موجودہ انتداب کی صورت اختیار کر چکا تھا یہ انگریزوں اور یہودیوں کی

کی عربوں کے حقوق اور ہستی کے خلاف ایک سازش بھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ برطانوی اپنی ہوس کی تسکین کے لیے کیا کیا ذرائع نہ اختیار کر سکتے تھے۔

اس طرح شاہی کمیشن کی رپورٹ نے عربوں کیخلاف برطانیہ کی غداری اور اس بے پناہ اثر کو جو یہودیوں نے لیگ اقوام کی حکومتوں پر انتداب کی منظوری کے لیے ڈالا بالکل عیاں کر دیا ہے رپورٹ سے مزید برآں وہ اسباب بھی بے نقاب ہوتے ہیں جن کی بناپر موجودہ انتداب یہودی اصول و مقصد کی جانبداری سے آلودہ ہے۔

سرپولس حاکم عسکری فلسطین نے نظامت مقبوضات دمشق کو ۳ جون ۱۹۲۰ء کو حسب ذیل خط لکھا:

"سر اس انشکن نائب صدر صیہونی انجمن اور دوسرے لوگوں نے ابراہیم ایزق گگ کی تائید اور ارض مقدس میں یہودی ریتوں کی اسمبلی کی تائید مزید سے جو مطالبہ پیش کیا ہے اس کا مقصد "دیوار گریہ" پر قبضہ جمانا ہے کیوں کہ وہ کہتے ہیں کہ دیوار مذکورہ یہودیوں کی ملکیت ہے۔

وہ معبد کے مقدس مقام کا مطالبہ بھی پیش کرتے ہیں۔ معبد کے اس مقام کو حرم الشریف کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اس میں مسجد الاقصےٰ اور قبۃ الصخرہ شامل ہیں۔ اس مقام کو جسے دنیا کا تیسرا مقدس معبد مانا جاتا ہے۔ دنیائے اسلام میں ایک خاص تقدس حاصل ہے اس سلسلہ میں لارڈ کلمینٹ نے جو کچھ کہا ہے وہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے

"وہ دن ہم جب اس مقام پر سلیمان کی ہیکل دوبارہ تعمیر کریں گے اب نہایت قریب آگیا ہے اور میں اپنی بقیہ زندگی مسجد الاقصےٰ کے مقام پر ایک عظیم الشان ہیکل کی تعمیر کیلئے وقف کر دوں گا"

زیادہ قیمت کا لالچ دے کر کاشتکاروں سے زمین ہتھیالینا کسی طرح جائز نہیں قرار پاسکتا۔ فلسطینی عربوں نے اسی زمین پر صدیوں سے کاشت کی ہے اور یہی زمین ان کا ذریعہ معاش اور سہارا تھی جب یہ زمین ایک مرتبہ یہودیوں کے ہاتھ میں پہنچ گئی تو عرب اس سے ہمیشہ کیلئے ہاتھ دھو بیٹھے۔ عرب کاشتکاروں کی بے چینی اور بے قراری کی یہی بڑی وجہ ہے۔

اسی طرح فلسطین میں یہودی صنعتوں کا فروغ محصول درآمد کی گراں باری کا ممنون ہے۔ اس کا بار عربوں پر پڑتا ہے۔ جنہیں ضروریات زندگی نہایت گراں میسر آتی ہیں۔ مصر، شام، لبنان اور عراق کی طرح فلسطین میں بھی یہودی پہلے کی طرح موجود تھے۔ لیکن معیار زندگی، ثقافت و صنعت کسی لحاظ سے بھی تو یہودی اپنے عرب ہمسایوں سے آگے نہ تھے۔ ان یہودیوں کی برتری جو فلسطین میں اب آئے ہیں۔ انکی اعلیٰ قابلیت کی وجہ سے نہیں بلکہ واقع کی مرہون منت

ہے جو انہیں انگریزوں کی سرپرستی میں میسر آئے۔ اس ترقی کو قطعاً فلسطین میں داخلہ یہود کا جواز تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

فلسطین کے باہر عربوں نے بھی بہ تقاضائے وقت تمدن صنعت اور آرٹ وغیرہ میں خوب ترقی کی ہے۔ یہی حالت فلسطینی عربوں کی ہے۔ جو اپنے عرب بھائیوں سے کسی طرح آگے نہیں تو پیچھے بھی نہیں تھے۔ لہٰذا ملک کی اس ترقی کا سہرا صرف آنے والے یہودیوں ہی کے سر نہیں ہے۔

یہودیوں کی بظاہر عظیم الشان ترقی حقیقت میں ایک فریب نظر ہے اس یہودی صنعت کی عظمت کی بنا تو جنگ پر تھی اور اختتام جنگ کیساتھ ہی اس کی بنیادوں میں تزلزل آگیا۔ فلسطین اور دوسرے عربوں نے یہودی صنعتوں کا جو مقاطعہ کر رکھا ہے اور جس کی شدت اور رفتار روز بروز تیز تر ہو رہی ہے اس تزلزل کو شدید تر اور تیز تر کر رہی ہے بہت سے یہودی کارخانے بند ہو چکے ہیں متعدد کمپنیوں کے دیوالے نکل چکے ہیں۔ اور فلسطین کے یہودیوں میں بے روزگاری بڑھ رہی ہے۔

(۲۳)

فلسطین شام اور عراق کے عربوں نے ابتدا ہی سے اس سازش و غداری کو بھانپ لیا تھا۔ انہوں نے اعلان بالفور، انجذاب یہودی آبادی کے داخلے اور یہودیوں کے پاس انتقال اراضی کے خلاف متحدہ طور پر شدید ناراضی کا اظہار کیا اور عربی حلقہ وحدت کے اندر اپنی آزادی کا مطالبہ پیش کیا جلد ہی یہ مطالبہ انکا میثاق ملی قرار پا گیا یہ مطالبہ ایک ایسا محور ہے جو اپنی جگہ سے کبھی نہیں ہٹا یہ ایک ایسا مقصد ہے جس کے حصول کی جدوجہد مسلسل جاری ہے۔ اسی مقصد کیلئے انھیں اتحادی افسروں کے سرکاری بیانات کی تائید حاصل تھی جو انجام کار لیگ آف نیشنز۔ کے میثاق میں ضبط تحریر میں آگئے یہودیوں اور ان کے حامیوں کا دعویٰ ہے کہ ثقافت صنعت و حرفت اور پیشہ ورانہ تعلیم میں یہودیوں کو عربوں پر فوقیت حاصل ہے اس دعویٰ کا اعادہ بعض کمیٹیوں کی رپورٹوں میں بھی کیا گیا ہے دعویٰ میں کہا جاتا ہے کہ فلسطین کی صنعتی تجارتی اور شہری ترقی یہودیوں کی مرہون منت ہے اور عربوں کو ملک کی اس ترقی سے فائدہ پہنچا ہے عربوں نے اپنی زمین کی دل کھول کر قیمت وصول کی ہے وغیرہ وغیرہ۔ واقعات کا دیانتدارانہ جائزہ اس ڈھول کا پول کھول دیتا ہے۔ (۲۴)

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہودی فلسطین میں حملہ آوروں کی حیثیت سے داخل ہوتے ان کا مقصد عربوں کے مقابلے میں اپنی تعداد بڑھا کر خود عربوں کے وطن ہی میں ان پر تسلط حاصل کرنا ہے یہودیوں کے ان ظالمانہ اقدام نے عربوں کو نہ صرف مسلسل خوف و ہراس، آلام و مصائب

عصیان و عدوان اور کتنی ہی معاشی و سماجی قباحتوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ بلکہ وہ عربوں کی آزادی کے راستے کی سب سے بڑی روک بن گئے ہیں ان نتائج کے مقابلہ میں عربوں کو یہودیوں کے داخلے سے جو فرضی یا حقیقی فوائد حاصل ہوئے ہوں بالکل ہیچ ہیں۔

(۲۵)

برطانوی تصرف کے وقت سے فلسطین کی تاریخ ایک غم انگیز ڈراما بن گئی ہے جس میں دغابازبدمعاش کا پارٹ برطانیہ نے ادا کیا ہے اور یہودیوں نے ایک طامع حملہ آور چھینتے بیٹھے اور باغی بغاوت کا پارٹ ادا کیا ہے۔

عرب حقوق پائمال کئے جا رہے تھے۔ اس صورت حال کے خلاف عربوں کی صدائے احتجاج ایک صدا بصحرا ثابت ہوتی رہی۔ حالات بد سے بدتر ہوتے رہے کہ وہ منزل آن پہنچی جس کی تشریح دفعہ ۱۴ میں موجود ہے۔ جس میں ہم یہودی صنعت کو فروغ پاتے ہوئے دیکھتے ہیں جس میں زمین پر ان کا قبضہ ہوا اور تجارت پر سرکاری دفاتر اور مفادات عامہ پر ان کا تصرف بڑھتا جا رہا ہے۔ اب ان میں یہ جسارت پیدا ہو گئی ہے کہ فلسطین میں یہودی وطن کے مطالبہ سے بڑھ کر یہودی ریاست کا مطالبہ پیش کریں۔ وہ اپنے آپ کو مسلح کر رہے ہیں تاکہ اپنے محسن انگریزی کی مرمت شروع کر دیں۔

(۲۶)

عربوں نے آغاز کار ہی سے اس سازش کے مسموم بددیانتانہ ارادوں کو بھانپ لیا تھا عربوں کی انجمنوں نے اپنے اجلاس منعقد کئے مظاہرات ہوئے احتجاجات کئے گئے۔ لیکن کون سنتا ہے فغانِ درویش۔ انگریزوں اور عربوں اور یہودیوں کے درمیان کشیدگی بڑھ گئی۔ انگریزوں کے قبضہ کے آغاز ہی سے رنجش کی ابتدا ہو گئی ۱۹۲۹ء میں یروشلم کا خونچکاں ہنگامہ ہوا اور اسی سال جافہ میں بھی شورش برپا ہو گئی ۱۹۲۹ء میں پھر زبردست فسادات رونما ہوئے جو حبران اور دوسرے قصبات میں بھی پھیل گئے ۱۹۳۳ء میں تیسری مرتبہ شورش شروع ہوئی جو جافہ، حیفہ اور نابلس تک پھیل گئی پھر ۱۹۳۶ء کی عام ہڑتال شروع ہوئی جس کی وجہ سے ۱۹۳۷ء کی بغاوت کا آغاز ہوا۔ جو گرما ۱۹۳۹ء تک بپا رہی۔ اس سلسلہ میں ان چھوٹے چھوٹے ہنگاموں اور خلفشاروں کا شمار نہیں ہے جو متواتر جاری ہیں۔

ہر شورش کے بعد برطانوی حکومت تحقیق حال اور تجویز علاج کے لئے ایک کمیشن یا کمیٹی کا تقرر کر دیتی تھی لیکن اس امر کو کامل طور پر فراموش کر جاتی تھی کہ خود اس حکومت کا وجود ہی بنائے فساد تھا۔ ہر تحقیقاتی کمیٹی یہ نتیجہ پیش کرتی تھی کہ فلسطین میں یہودی

وطن کا قیام ہی تمام جھگڑے کی بنیاد ہے کیوں کہ یہودی وطن کا قیام عربوں کے ساتھ سیاسی اور سماجی ظلم و زیادتی اور حد درجہ ناانصافی کا موجب ہے۔

ہم اس فوجی کمیٹی کی رپورٹ سے جو یروشلم کی ۱۹۲۰ء کی شورش کے اسباب کی تحقیقات کے لئے مقرر ہوئی تھی۔ اقتباس پیش کر چکے ہیں، جافہ کے فسادات کی تحقیقات کے لیے ۱۹۲۱ء میں ہیکرافٹ کمیٹی مقرر ہوئی (دپہلی کمیٹی سے زیادہ اہم تھی یہ رپورٹ ملک معظم کے حکم سے پارلیمنٹ کے روبرو پیش ہوئی یہ کمیٹی اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ تمام فسادات کی بنا فلسطین میں یہودی وطن کے قیام کا وہ خطرہ ہے جو عربوں کے دل میں جاگزیں ہے۔ دوسری وجہ یہودیوں کے حق میں حکومت کی جانبدارانہ روش کے خلاف عربوں کا جذبہ ناراضی ہے۔ تیسری وجہ یہودیوں کی تعداد اور قوت میں وہ اضافہ ہے جو انھیں ایک دن عربوں پر مسلط کر دینے کا امکان رکھتا ہے چوتھی وجہ عربوں کا وہ غیض و غضب ہے جو اس پالیسی کی وجہ سے آزادی و خودمختاری سے ان کی محرومی کی صورت میں پیدا ہوتا ہے۔ اس رپورٹ میں یہودیوں کی طرف سے خدشات حق بجانب ثابت ہو گئے تھے اس رپورٹ میں ایک صیہونی لیڈر نے یہ کہا مسئلہ فلسطین کا واحد حل یہ ہے کہ یہودیوں کو یہودیوں کی حیثیت سے فلسطین میں وہ تمام حقوق اور امتیازات دے دیئے جائیں جو فلسطین کو ایسا ہی یہودی ملک بنا دیں جیسا انگلستان انگریزوں کا یا کینیڈا اہل کینیڈا کا ہے۔ ایک اور یہودی نے ایک صیہونی اخبار میں فلسطین کو ایک وحشت و ویرانہ قرار دیا۔ ایک اور بزرگ نے یہ تجویز فرمایا کہ فوجی ملازمت کے لیے صرف یہودیوں ہی کی بھرتی کی جائے۔ صیہونیوں کی تمام دنیا کی انجمن کے نائب صدر ڈاکٹر ایڈر نے فرمایا فلسطین میں صرف ایک ہی قومی وطن ممکن ہے اور وہ یہودی قومی وطن ہی ہو سکتا ہے۔ جس میں یہودی اور عربوں میں کوئی برابری نہیں ہو سکتی بلکہ اس وطن کا مقصد یہودیوں کی تعداد میں معقول اضافے کے بعد یہودیوں کا قطعی اقتدار اور تسلط ہے۔

ڈاکٹر ایڈر کا یہ مطالبہ تھا ہتھیار رکھنے کا حق عربوں کو نہیں صرف یہودیوں کو ہی حاصل ہونا چاہیئے۔ اس کمیٹی نے جو نتائج اخذ کیے ان میں سے چند حسب ذیل ہیں

جب تک یہودی ترکی حکومت کے عہد میں ایک ناقابل التفات اقلیت میں تھے نہ تو ان سے کسی کو کچھ تعرض تھا اور نہ ہی ان کے خلاف کوئی جذبہ منافرت موجود تھا۔ لیکن جب عربوں نے یہودیوں کی بڑھتی ہوئی قوت اور حکومت میں

ان کے بے اندازہ عمل دخل کے مخالف اثرات
کو محسوس کیا تو عربوں کے دلوں میں یہودیوں
کے خلاف ناراضی کا جذبہ پیدا ہوا ۔۔ یہ
اور ملک بھر میں پھیلتا چلا گیا ۔ یہ ایک ایسا
جذبہ تھا جس کے لیے کسی خارجی اشتعال
انگیزی کی ضرورت نہ تھی ۔

(۲) فسادات حاضرہ کی اصلی وجہ یہودیوں کے خلاف
عربوں کا یہی جذبہ ناراضی و مخالفت
تھا ۔ اس ناراضی کے اسباب
سیاسی و معاشی تھے جن کا تعلق یہودیوں
کے داخلے اور اس صیہونی پالیسی سے تھا
جس کی تشریح و تفسیر یہودیوں ہی کے
اختیار میں تھی ۔

(۳) بہت سے افراد جو بظاہر غیر یہودی
آبادی کے مختلف فرقوں سے تعلق رکھتے
تھے ، رضاکارانہ طور پر کمیٹی کے روبرو پیش
ہوئے اور انہوں نے رائے عامہ
کے یہودیوں کی مخالفت میں پیدا
ہو جانے کے اسباب و عمل کمیٹی کے روبرو
بیان کیے ۔ کمیٹی کے روبرو پیش ہونے والے
ان گواہوں میں مسلمانوں ، آرتھوڈاکس ، لاطینی
بار نطینی گریگ آرتھوڈاکس ، انگریزی اور دوسرے
عیسائی فرقوں کے نمائندے تھے ۔ کمیٹی اس

نتیجہ پر پہنچی کہ قریب قریب تمام غیر یہودی
آبادی یہودیوں کی مخالفت پر متفق تھی
ان فسادات کے اسباب سے متعلق
کمیٹی کے روبرو عربوں کے بیانات اور
کمیٹی کے اپنے نتائج حسب ذیل ہیں ۔

(۱) جب برطانیہ نے فلسطین کا نظم و نسق
سنبھالا تو صیہونیوں نے حکومت برطانیہ
کو مجبور کیا کہ وہ ایسی پالیسی اختیار کرے
جو بحیثیت مجموعی فلسطینیوں کی بہتری کے لیے
نہ ہو ۔ بلکہ جس کا مقصدِ وحید فلسطین میں
یہودیوں کے لیے قومی وطن کا قیام ہو ۔

(۲) فلسطین میں یہودیوں نے اس پالیسی
کے مطابق ایک صیہونی گروہ کو ایک
سرکاری ادارہ تسلیم کر لیا ۔ جن کی
وفاداری ایک مقصد و مدعا کے
لئے وقف ہو چکی تھی ۔ اور جو یہودی
مفاد کے حصول کے لئے سب کچھ قربان
کر دینے کے لیے تیار تھا ۔ یہ گروہ اپنے
خاص الخاص امتیازات کی بنا پر حکومت
کے اندر اپنی ایک علیحدہ حکومت قائم کر بیٹھا

۳ یہودیوں کو سرکاری ملازمتوں میں اپنی
آبادی سے کہیں زیادہ نمائندگی حاصل تھی ۔

(۴) صیہونی پالیسی یہ ہے کہ فلسطین میں نظم و نسق

اور تجارتی معاملات کے یہودی ماہرین کا جنہیں عربوں پر فوقیت حاصل ہو ایک ایسا سیلاب امڈ کر پہنچ جائے کہ بقیہ آبادی پر یہودی کو ایک نمایاں امتیاز حاصل ہو جائے۔

(۵) فلسطین میں باہر سے آنے والے یہودی اس مقابلے کی وجہ سے جس میں انہیں مخصوص فوائد حاصل ہیں ملک کیلئے ایک معاشی خطرہ ہیں۔

(۶) باہر سے آنے والے یہودی اپنے تجربہ کی بنا پر عربوں سے برا سلوک کرتے ہیں اور ان کے نظامِ معاشرت کا تمسخر اڑاتے ہیں۔

(۷) مناسب حفاظتی تدابیر کی کمی کی وجہ سے انقلاب پسند یہودیوں کو ملک میں داخلہ مل گیا یہ لوگ ملک میں سماجی تنازعات پیدا اور ایک معاشی جنگ برپا کرنا چاہتے ہیں۔

کمیٹی نے یہ سفارش کی کہ عربوں میں اطمینان پیدا کرنے کی غرض سے حکومت کو کوئی نہ کوئی کارروائی کرنا چاہیئے تاکہ حکومت کی پالیسی کے اعلان سے عربوں کی حیثیت اور ان کے حقوق کی ضمانت ہو اور یہودیوں کی اس انتہاپسندی میں جو ان کے رویے ان کی گفتار سے ٹپکتی ہے ایک اعتدال پیدا ہو۔ مقام تاسف ہے کہ حکومت برطانیہ نے جنگ کی اس خلیج کے پاٹنے کی کوئی کوشش نہ کی اس کا نتیجہ حالیہ جنگ کی صورت میں نمودار ہوا اسرائیلیوں نے اس علاقے پر اکتفا نہیں کی جو حکومت انگلستان نے انکی تحویل میں دیا تھا بلکہ وہ عمان کی سمت اپنی حدود کو وسیع تر کرنے کے منصوبے سوچنے لگے وادیائے اردن کے رخ کو بدلنے کی کوشش میں مصروف ہو گئے اور اب نہر سویز کے مقابلے میں ایک اور نہر بنانے کی فکر کر رہے ہیں۔ عرب دنیا انکے مقابلے میں ذرائع کم رکھتی ہے تو کوئی ہرج نہیں قومی غیرت اور ملی شعور اسرائیل سے ہرگز کم نہیں اس صورت حال کا جائزہ انجمن اقوام کے سپرد کرنا پڑے گا نہیں تو اس سرزمین پر تیسری عالمی جنگ کا آغاز ہو کر رہے گا۔ اور تیسری عالمی جنگ اسی دنیا کی آخری جنگ ثابت ہو گی۔

(۲۷)

ان فسادات کے بعد جلد ہی ایک عربی وفد لندن پہنچا تاکہ عربوں کی ترجمانی اور ان کے حقوق کا مطالبہ کرے۔ اور ان کے خلاف جو جانبدارانہ سلوک ہو رہا ہے اس کے انسداد کا طالب ہو یہ وفد قریباً سال بھر لندن میں رہا۔ اسی اثنا میں اس وفد نے حکومت ممبران پارلیمنٹ اور سیاسی پارٹیوں سے راہ و ربط پیدا کیا اپنے مقصد کی تائید میں بہت سے حمایتی پیدا کئے اور دار الامراء کے ارکان کی بہت بڑی تعداد کو اپنے مطالبات اور شکایات کے حق بجانب ہونے کا قائل کر لیا۔ اس طرح اس ایوان کی کثرت نے فیصلہ کیا کہ فلسطین میں حکومت کی پالیسی پر خاص غور کیا جائے۔

(۲۸)

حکومت نے ان شکایات اور حقوق کے مطالبہ پر غور کرنے سے انکار کر دیا۔ مسٹر ونسٹن چرچل وزیر مستعمرات نے حکومت کی طرف سے ۱۹۲۲ء میں ایک قرطاس ابیض (سرکاری بیان) شائع کیا۔ جس میں مسٹر چرچل نے اس کے اور عرب وفد کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی تھی شائع کر دی۔ اس خط و کتابت میں عربی وفد نے برطانیہ سے فلسطین میں شریف حسین کے ساتھ معاہدات اور لیگ آف نیشنز کے میثاق کے ماتحت قومی حکومت کے قیام کا مطالبہ کیا تھا مسٹر چرچل کو اس پر اصرار تھا کہ فلسطین ان مواعید میں شامل نہ تھا۔ مسٹر چرچل نے صاف طور پر یہ اعلان بھی کر دیا کہ فلسطین میں ایک قومی حکومت کا قیام حکومت برطانیہ کے اس وعدے کے خلاف ہو گا جو یہودیوں سے فلسطین میں وطن یہود کے قیام سے متعلق کیا جا چکا ہے۔ ایسا کرنے میں مسٹر چرچل نے اس امر کا تحریری ثبوت مہیا کر دیا کہ یہودی قومی وطن کا قیام اپنے ملک میں عربوں کے حقوق اور مطالبہ آزادی کے راستے میں ایک سد سکندری ثابت ہو گا۔

وفد کی یوں بے نیل مرام واپسی عربوں کی ناراضی کے لیے ایک تازیانہ ثابت ہوئی مسٹر چرچل نے قومی وطن اور اس کے حدود کا تعین کرنا چاہا اور یہ کوشش کی کہ عربوں کے دل میں جو خطرات و خدشات جاگزیں ہیں ان کی شدت میں کچھ کمی آ جائے قرطاس ابیض میں یہ الفاظ موجود تھے۔

”وہ اس امر کی طرف توجہ مبذول کرائیں گے کہ اعلان بالفور کی شرائط کے ماتحت تمام فلسطین کو ایک یہودی وطن قرار دیا جانا مقصود نہ تھا بلکہ ایک ایسا وطن فلسطین کے اندر قائم کیا جانا مقصود تھا۔“

مسٹر چرچل کو اس ارادے میں کوئی کامیابی نصیب نہ ہوئی نہ تو اس نے موجودہ حدود سے متعلق ابہام کو رفع کیا اور نہ ہی عربوں کے ان خطرات و خدشات کے (جنہیں حکومت کی اس وقت کی پالیسی نے اور بھی مصدق و محکم کر دیا تھا۔) ازالے کی کوئی تدبیر کی گئی چرچل اپنی حکومت کے وعدہ و عمل کی تفاوت کو ضبط تحریر میں لے آنے میں کامیاب ہو گئے ۱۹۲۰ء کے شاہی کمیشن کی رپورٹ سے ثابت ہوتا ہے کہ مسٹر چرچل نے ۱۹۲۲ء میں جو کچھ کیا وہ محض ایک فریب تھا کیونکہ اس کمیشن کے روبرو شہادت دیتے ہوئے چرچل نے کہا کہ اس کا ۱۹۲۲ء والا وعدہ فلسطین میں ایک یہودی ریاست کے قیام کے منافی نہیں ہے۔ اس طرح برطانوی حکومت کے مواعید و اعمال کی فریب کاری اور سازش ایک مرتبہ پھر عالم آشکار ہو گئی۔

(۲۹)

برطانوی حکومت نے عربوں کو دھوکا دینے کی کوشش

کی۔ انھیں اپنے حقوق سے دست بردار ہونے پر راغب کرنا چاہا۔ انھیں مجبور کیا کہ وہ یہودی وطن کا مطالبہ تسلیم کریں اور اس طرح غیر ملکی یہودیوں کو اپنے وطن میں اپنا شریک بنا لیں۔ اس کوشش میں حکومت برطانیہ نے عربوں کے سامنے اپنی تجاویز پیش کیں جس میں ان کے حقوق کے احترام کی کوئی بھی معقول ضمانت موجود نہ تھی مثلاً ایسی مجلس قانون ساز کے قیام جس میں انگریزوں اور یہودیوں کی اکثریت تھی اور جسے فلسطین کے اہم معاملات پر رائے زنی کا حق حاصل تھا یا پھر ایک ایسی عرب ایجنسی کا قیام جو یہود کو عربوں کے ہم پایہ ہم پلّہ بنا دے عربوں نے ان تجاویز کو مسترد کر دیا کیوں کہ ان میں کوئی ایسی خوبی نہ تھی جو عربوں کو حکومت کے ساتھ ایسی طفلانہ تجاویز میں اشتراکِ عمل پر مائل کر سکتی۔

جب ریمزے میکڈانلڈ کے زیرِ قیادت وزارتِ عمال انگلستان میں برسرِ اقتدار آئی تو عربوں کو پھر خیال پیدا ہوا کہ ممکن ہے یہ وزارت پہلی وزارتوں سے کہیں زیادہ عربوں سے انصاف کرنے پر مائل ہو ایک اور عربی وفد انگلستان بھیجا گیا اور ناکام واپس آیا کیونکہ پہلی حکومتوں کی طرح یہودیوں نے اس حکومت پر بھی خوب دباؤ ڈالا دوسری وجہ یہ ہوئی کہ فلسطین کا نظم و نسق تمام تر یہودیوں کے ہاتھ میں تھا جو حکومت کو یہود کی رہنمائی اور رائے تسلیم کرنے پر مجبور کر سکتے تھے۔

(۳۱)

ناراضی و کشیدگی بڑھتی گئی۔ احتجاجات کا سلسلہ جاری رہا تا آنکہ ۱۹۲۹ء کی شورش برپا ہو گئی۔ اس وسیع شورش کا فوری سبب یہودیوں کی وہ حرص اندر دیدہ دلیری تھی جس کی بنا پر وہ اسلامی حرم اور نبی کریم صلعم کی روائتی براق پر مداخلت بے جا کے مرتکب ہوئے۔

برطانوی حکومت نے سر والٹرشا کے زیرِ صدارت ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا تاکہ ان فسادات کے اسباب دریافت اور اس صورتِ حال کا تدارک تجویز کرے۔

(۳۲)

شا کمیشن ۲۴ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو فلسطین میں وارد ہوا اور دو ماہ تک جائزہ لینے اور تحقیقات میں مصروف رہا۔ اس کمیشن کی رپورٹ مارچ ۱۹۳۰ء میں پارلیمنٹ میں پیش ہوئی یہ رپورٹ ایک اہم دستاویز ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہودیوں کی حرص و ہوا۔ براق پر ان کے بے بنیاد دعاوی ان کے تشدد آمیز مظاہرات، ان کا اس مقام پر جو رسول اکرمؐ کی زندگی سے ایک خاص تعلق کی بنا پر مسلمانوں کے لئے محترم ہے شور و شغب برپا کرنا اور سنکھ بجانا ۱۹۲۹ء کے فسادات

فوری اور بلا واسطہ اسباب تھے ۔ رپورٹ نے یہ بھی وضاحت کی کہ عربوں کی سیاسی اور معاشی شکایات بھی جو شہادت میں نمایاں تھیں ان فسادات کی بنا سمجھی جانی چاہئیں ۔ رپورٹ میں یہ رائے بھی ظاہر کی گئی تھی کہ یہودیوں کے خلاف عربوں کا جذبہ فساد ان کی سیاسی اور قومی امنگوں کی پامالی اور اپنے معاشی مستقبل سے مایوسی کا نتیجہ تھا ۔ رپورٹ نے یہ فوری اندیشہ بھی ظاہر کیا کہ عربوں کا غیظ و غضب خوف و ہراس اور پریشانی و یاس آئندہ فسادات کا پیش خیمہ ثابت ہوں گے ۔

شا رپورٹ یوں رقمطراز ہے ۔

۱ ۔ فلسطین میں یہودیوں کے داخلے کے مستقبل کے متعلق یہودیوں کا مطالبہ عربوں کے دلوں میں جائز طور پر انھیں اپنے ذرائع معاشی سے محرومی کا قومی خدشہ پیدا کر سکتا ہے انھیں اس امر کا بھی اندیشہ پیدا کر سکتا ہے کہ یہود عربوں پر سیاسی طور پر مسلط ہو جائیں گے ۔ جس کثرت سے یہودی فلسطین میں لائے جا رہے ہیں ، ملک اس کا متحمل نہیں ہو سکتا یہودی ، صیہونی انجمن کی طرف سے تسلیم کئے گئے اصول سے منحرف ہو گئے ہیں ۔ یہودیوں کے داخلے عربوں کے خدشات دوسرے اسباب کے ساتھ مل کر فسادات کا موجب ہوئے تھے یہودی داخلے کے سلسلہ میں یہودیوں کے پیش نظر اپنی سیاسی حیثیت سے یہ امر حد درجہ قابل اعتراض ہے ۔

۲ ۔ ۲۹ - ۱۹۳۱ء کے زمانے میں یہودیوں نے کثرت سے زمینیں خریدیں اور عربوں کو بے دخل کر دیا اس امر کا کچھ بھی انتظام نہ ہوا کہ عربوں کو بدل کے طور پر دوسری زمینیں مل جائیں جنہیں وہ اپنا ذریعہ معاش بنا سکیں حکومت نے عرب کاشت کاروں کی حفاظت و اعانت کیلئے جو تدابیر اختیار کیں ان میں ناکامی ہوئی ۔ اسی مقصد کے لئے جو قواعد و قوانین وضع ہوئے تھے ۔ وہ بھی کارگر ثابت نہ ہوئے معلوم ہوا ہے کہ ۱۹۲۱ء کے قوانین کی ان دفعات پر جن میں کہا گیا تھا کہ عرب کاشت کاروں کے پاس اتنی زمین ضرور چھوڑ دی جائے جس پر وہ خود کاشت کر سکیں ۱۹۲۹ء تک ایک مرتبہ بھی عمل نہ ہوا اس طرح ملک میں کاشت کاران بلا اراضی کی ایک غضب ناک جماعت پیدا ہو گئی جو ملک کیلئے ایک شدید خطرے کا باعث تھی ۔ زمین کا مسئلہ ناراضی کا ایک مستقبل سبب اور فسادات کی وجہ بنا رہے گا جب تک موجودہ زراعتی طریقوں کو بدل نہ ڈالا جائے فلسطینی کاشت کاروں کی حالیہ تعداد کے لیے ذریعہ معاش

مہیا نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا کیا جا سکے تو ملک کے بعض حصوں میں نو واردوں کے لیے کچھ گنجائش پیدا ہو سکتی ہے۔

۳۔ نمائندہ حکومت کے لیے عربوں کا مطالبہ متحدہ ہے۔ عربوں کی حکومت خود اختیاری سے مسلسل و کامل محرومی نظم و نسق کے لئے مشکلات کا باعث ہو گئی ہے کمیشن نے یہ بھی سفارش کی کہ عربوں کی تشویش اور مستقبل سے متعلق ان کے خدشات کو ختم کرنے کے لیے زمین کی خرید اور داخلہ یہود سے متعلق ایسا رویہ اختیار کیا جائے کہ ان خدشات کے اسباب کا انسداد ہو جائے بڑھتے ہوئے داخلہ اور بے زمین کاشت کاروں کی تعداد کو بڑھنے سے روکا جائے عرب کاشتکاروں اور مزدوروں کو اس سے فائدہ پہنچے گا کمیشن نے یہ سفارش بھی کی کہ ان مسائل کے جائزہ کیلئے ماہرین مامور کیے جانے چاہئیں۔

(۳۳)

شا کمیشن کے بعد ایک عربی وفد لنڈن گیا تاکہ عربوں کی شکایات پیش اور ان کے پائمال شدہ حقوق کی بحالی کا مطالبہ کرے اور عربوں کو جس خطرے اور مصیبت کا سامنا ہے اس سے انھیں نجات دلانے کی کوشش کرے مسٹر میکڈانلڈ نے جن کے ہاتھ میں اس وقت عنان حکومت تھی وفد سے اپنے اس عزم کا اظہار فرمایا کہ وہ ایک ماہر فلسطین روانہ کریں گے اور اس کی سفارشات پر عمل پیرا ہوں گے انھوں نے وفد کو یہ بھی یقین دلایا کہ وہ ایک نئی پالیسی اختیار کریں گے جس کا مقصد عربوں کے مسائل کا حل تلاش کرنا اور ان کے خدشات کو رفع کرنا ہوگا۔

(۳۴)

حکومت نے سر جان ہوپ سمپسن کو فلسطین بھیجا اور اس نے فلسطین کے حالات کا پورا پورا مطالعہ کیا اور اپنی رپورٹ ۱۹۳۰ء میں پیش کی۔

اس رپورٹ کے چند اہم نتائج حسب ذیل ہیں۔

۱۔ فلسطین کی زراعتی آبادی کی ایک تہائی کے پاس اس وقت قطعاً کوئی زمین نہیں۔

۲۔ اگر تمام لائق آب پاشی زمین کو عرب زراعتی آبادی پر تقسیم کیا جائے تو ہر خاندان کا حصہ اس کی معاش کے لئے ناکافی ہوگا کیوں کہ ایک غریب کسان خاندان کے لیے کم از کم ۱۳۰ دنام زمین چاہیئے لیکن واقعی حصہ اس سے بہت کم ہے۔

۳۔ یہودیوں کو فلسطین میں آباد کرنے کے لیے کوئی زمین نہیں ہے۔

۴۔ عرب کاشت کاروں کو زمین فروخت کر

ڈالنے کی ترغیب وتحریص دی جاتی ہے۔ اوران کے حقوق کا کوئی معقول تحفظ نہیں ہے

۵۔ یہودی افسران یہودیوں کے لیے جو پٹہ پر زمین لیتے ہیں لازم قرار دے دیتے ہیں کہ وہ عربوں کو ملازم نہ رکھیں حالانکہ پیشتر ازیں اس شرط پر عملدرآمد تھا کہ عرب ملازم رکھے جائیں گے۔

۶۔ یہودی افسر فلسطین میں یہودیوں کے کثرت سے داخل ہونے کی خواہش کی بنا پر دھوکے سے کام لیتے ہیں عام طور پر یہودی مزدور جن کی وجہ معاش کے یہ افسر ضامن ہوتے ہیں کوئی ذریعہ معاشی نہیں رکھتے۔ اس طرح بے روزگار عربوں اور یہودیوں کی تعداد میں اضافہ کا موجب بنتے ہیں۔

۷۔ یہودی مزدوروں سے مقابلہ کی وجہ سے عرب مزدوروں کو کیتے ہی کارخانوں سے خارج کردیا گیا ہے اور اس طرح عرب مزدوروں کی مصیبت اور تباہ حالی میں اضافہ ہوا ہے۔

(۳۵)

شاکیشن اور سرجان ہوپ سمپسن کی رپورٹ کی مطابقت میں برطانوی حکومت نے فلسطین سے متعلق اپنی ایک پالیسی متعین کی جس کا اعلان ۱۹۳۰ء کے قرطاس ابیض میں ہوا۔ اس قرطاس میں حکومت نے اپنی اس غفلت شعاری اور ان تمام غلطیوں کا اعتراف کیا جو اس نا اتفاقی کا موجب ہوئیں حکومت نے اعلان کیا کہ شاکمیشن اور ٹیکنیکل ماہر کی سفارشات پر عملدرآمد کا عزم اور ملک کے نظم ونسق اور قانون سازی میں اہل ملک کو حصہ دینے کا عزم رکھتی ہے۔ اس اعلان سے صیہونی حلقوں میں ایک ہیجان برپا ہوگیا اور انھوں نے اپنے مختلف اور مخصوص طریقوں سے حکومت پر ایسا دباؤ ڈالا کہ جناب ریمزے میکڈانلڈ کل عالم صیہونی انجمن کے صدر ڈاکٹر ویزلین کے نام ایک خط لکھنے پر مجبور ہوگئے جس میں انھوں نے اس قرطاس کی وہ تفسیر بیان فرمائی جو اس کے مدعا ومفہوم سے دست برداری و بے زاری کے اعلان سے کچھ کم نہ تھی یہ صورت حال ایک ایسی رجعت تھی کہ عرب ریمزے میکڈانلڈ کے خط کو کتاب اسود کے نام سے یاد کرنے پر مجبور ہوئے یہودیوں کو صورت برطانیہ پر جو گلو گیر قابو حاصل تھا۔ اس سے متعلق عربوں کے شبہات مبدل بہ یقین واثق ہوگئے اور ان پر یہ حقیقت آفتاب عالمتاب کی طرح روشن ہوگئی کہ یہودیوں کی ہوس اور برطانیہ کی طرح ایک دوسرے کی رازدار اور ان کی حریف ہیں۔

(۳۶)

اس کے بعد جلد ہی برطانوی حکومت نے یہودی داخلے کے لیئے فلسطین کے دروازے پوری دریادلی سے کھول دیئے اور اس طرح اپنی ہی کمیٹیوں اور ماہرین کی سفارشات کو داخلہ یہود کے سلسلہ میں سرپائے حقارت سے ٹھکرا دیا گیا جس طرح کہ بیشتر ازیں یہود کے پاس انتقال اراضی کی تجاویز اور عرب کاشت کاروں کے حقوق کو پائمال کیا جا چکا تھا اب کے جو یہود کے داخلے کے لیئے دروازے کھلے تو ایک سیلاب ہی امڈ کر آگیا سالانہ بیس ہزار، تیس ہزار سے بڑھ کر چالیس ہزار تک نوبت پہنچی ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۵ء تک کے تین سالوں میں دو لاکھ سے زائد یہودی فلسطین میں داخل ہو گئے۔ حالانکہ اس سے پہلے چودہ سال یعنی ۳۱ - ۱۹۱۹ء تک کے عرصے میں مجموعی داخلہ ایک لاکھ سے کچھ ہی زیادہ یعنی اوسطاً سات ہزار سالانہ تھا۔

یہودیوں نے زمین کی خریداری برابر جاری رکھی۔ عرب کاشت کار بے گھر اور بے در ہو کر شہروں میں آتے رہے۔ اگرچہ ان کے پاس چھوٹے چھوٹے قطعات رہ گئے تھے۔

حکومت نے زمین پر اس یورش یہود کا کامیابی سے مقابلہ کرنے کے لیے کچھ نہ کیا۔ ایک طرف تو بے دخل شدہ عرب کاشت کاروں کی تعداد بڑھتی گئی اور دوسری طرف ہر معاشی میدان میں عربوں اور یہودیوں کا مقابلہ تیز تر اور شدید تر ہوتا چلا گیا علاوہ بریں سرکاری عہدہ داروں میں یہودیوں کی تعداد برابر بڑھتی جا رہی تھی خود حکومت پورے طور پر ان کی مٹھی میں تھی وہ پوری فریب کاری سے جو چاہتے حاصل کر لیتے تھے اور حکومت ہر معاملے میں ان سے دبتی چلی جاتی تھی۔ یہود نے برطانوی حکومت کا آئینی قواعد کے عملدرآمد میں ناطقہ بند کر دیا ان ناگفتہ بہ حالات نے عربوں کو فی الواقع خوفزدہ کر دیا کیونکہ ان کی زندگی خطرات میں گھر گئی تھی۔

انگریزوں کے اس دعوٰے کی کہ عربوں کے خدشات مبالغہ آمیز ہیں، یہ ایک کھلی ہوئی تردید تھی انگریزوں کے اس ظلم و تشدد کے خلاف جس کا عرب تختہ مشق بنے عربوں نے احتجاجی مظاہرات شروع کئے۔ جنہیں وحشیانہ تشدد سے دبایا گیا جس میں سینکڑوں عربوں کو جام شہادت نصیب ہوا۔

(۳۷)

یہودیوں کے داخلے کا سلسلہ برابر جاری رہا فلسطین کا المیہ اپنی بربریت اور استثنائیت میں عدیم المثال تھا۔ عربوں کو خود ان کے وطن میں ان کی مرضی کے خلاف ہر طرح کی فریب کاری اور دغا بازی سے کام

لیتے ہوئے مختلف اقوام کے دانشمندوں کے نقطۂ نظر سے اپنے جائز مقام سے برطرف کیا جا رہا تھا اور جب کبھی عرب حرف شکایت و ملامت زبان پر لاتے تو نظر بندی، قید و بند، اخراج، جلاوطنی اور دار و رسن ان کی تواضع کے لیے سبھی کچھ تیار تھا۔ ان حالات میں عربوں کے پاس قطعاً کوئی چارہ نہ تھا سوائے اس کے کہ عام ہڑتال اس امید پر کریں کہ بنی نوع انسان کی ضمیر عربوں کی ناتواں آواز سن سکے اور سنگین دل ان کی غم ناکیوں پر پسیج جائیں۔

یہ ہڑتال اپنی نظیر آپ تھی۔ کامل چھ ماہ اپریل سے اکتوبر تک جاری رہی۔ اس میں قریباً دس لاکھ عربوں نے اپنا کاروبار پورے طور پر بند کر دیا یہاں تک کہ ان کے مکاتب بھی بند کر دیئے گئے ملک میں ہر مقام پر کشیدگی موجود تھی جلسے ہوئے جلوس نکالے گئے مظاہرے کیے گئے۔ عربوں اور برطانوی حکام کے درمیان جلد ہی کشیدگی رونما ہوئی کیوں کہ حالات نے جو صورت اختیار کی حکام اس سے بالکل ششدر رہ گئے اور اسے اپنی روایتی فریب کاری اور مکاری کی پالیسی سے قابو میں لانے سے قطعاً قاصر رہے۔ اس کشیدگی نے ایک تباہ کن شورش کی صورت اختیار کی جس میں شہروں گاؤں اور پہاڑوں سبھی مقامات کے رہنے والوں نے حصہ لیا۔ شامی، لبنانی، عراقی اور مشرقِ اردن اور دوسرے عرب ممالک کے رضا کاروں نے اس شورش میں حصہ لیا۔

برطانیہ نے ہر ایک مرتبہ ایک کمیشن کے تقرر ہی کو عربوں کی آتشِ غضب کو سرد کرنے کا ذریعہ سمجھا حکومت برطانیہ نے اپنی تجویز پر عمل پیرا ہونے کیلئے عرب حکومتوں سے امداد چاہی۔ عرب بادشاہوں اور امراء و شیوخ کی مداخلت اور وعدہ پر کہ اس مرتبہ ضرور انصاف ہوگا اور بدی کو نابود کر دیا جائے گا۔ ہڑتال ختم کر دی گئی۔

(۳۸)

نومبر ۱۹۳۶ء کو ایک شاہی کمیشن فلسطین پہنچا اور جنوری ۱۹۳۷ء تک وہاں رہا اس نے عربوں، یہودیوں اور حکومت کے نمائندوں کے بیانات سنے اور ان کی شہادتیں لیں اور ۱۹۳۷ء کے موسم سرما میں پارلیمنٹ کے روبرو اپنی رپورٹ پیش کر دی۔ یہ رپورٹ بھی ایک اہم دستاویز ہے۔

اگرچہ اس کمیشن نے اپنے طریق تحقیق اور مسئلہ فلسطین کے سمجھنے اور اس کا حل تجویز کرنے میں اپنی غیر جانبداری اور ایمانداری کا کوئی ثبوت نہیں دیا تاہم اس رپورٹ نے اس عرب دعوے و مطالبہ کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا کہ عرب صدیوں سے فلسطین میں آباد ہیں فلسطین شام کا حصہ ہے اور یہودیوں کا اخراج کے بعد فلسطین سے کوئی تعلق

قائم نہیں رہا۔ سوائے قدیم تاریخی روایات اور ایک جذبہ مذہبی کے' اس کمیشن کی رپورٹ میں دوسرے امور کے علاوہ حسب ذیل امور کا ذکر بھی موجود ہے۔

۱۔ فسادات کے بنیادی اسباب عربوں کی قومی آزادی کی خواہش اور عربوں کے دل میں یہودیوں کے وطن کے قیام کا خدشہ اور اس کے لیے ایک جذبۂ منافرت وعناد تھے بلاشبہ اب کوئی شخص یہودیوں کے لئے فلسطین میں قومی وطن کے قیام سے متعلق عربوں کے جذبہ منافرت کی عالم گیری سے ناآشنا نہیں۔ اس جذبۂ منافرت کی شدت گذشتہ پانچ دس سال میں پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئی اور فلسطین کی سرحد کے پار تمام عرب ممالک میں پھیل گئی ہے یہی جذبہ قاہرہ' بغداد اور دوسرے عربی شہروں میں مظاہروں کا موجب ہوا۔

۲۔ ۱۹۲۰ء ۱۹۲۱ء ۔ ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۳ء کے فسادات مندرجہ بالا وجوہ کا نتیجہ تھے۔

۳۔ مزید برآں کچھ دوسرے اسباب بھی تھے۔ جنہوں نے مل ملا کر یہ صورت حال پیدا کر دی مثلاً دنیا بھر کے یہودیوں کا وہ دباؤ جس کی وجہ سے یہودی داخلے میں بے جا اضافہ ہوا اور جس کی بنا پر عربوں کے دلوں میں فلسطین میں یہودیوں کے تسلط کا اندیشہ اور زیادہ جاگزیں ہو گیا۔ ایک ضمنی سبب یہ بتایا گیا کہ عربوں کو دنیا کے سامنے اپنے دعوے پیش کرنے کی وہ سہولت میسر نہیں آئی جو یہودیوں کو حاصل رہی ہے۔ عربوں کو یقین واثق ہو چکا تھا کہ یہودی جو کچھ چاہتے ہیں اپنے ان مخصوص ذرائع سے حاصل کر لیتے ہیں۔ جو عربوں کی دسترس سے باہر ہیں یہ اندیشہ بھی اس صورت کا ایک سبب تھا۔ عربوں کو یہ یقین بھی ہو چکا تھا کہ برطانوی حکومت اپنے وعدے پورے کرنے کی قوت و قابلیت سے بالکل محروم ہو چکی ہے۔

۴۔ برطانوی حکومت کی پالیسی کا فوری اور شدید رد عمل ہمسایہ عرب ملکوں میں ظاہر ہوا اور شامیوں، عراقیوں اور شرقِ اُردن والوں نے کثیر تعداد میں ان مظاہروں میں حصہ لیا اور اس طرح اس تحریک میں تمام عرب حکومتوں اور بادشاہوں کی علانیہ شمولیت کی صورت پیدا ہو گئی۔

۵۔ یہودیوں اور عرب، دنیا میں منافرت بڑھتی چلی گئی اور ان کے باہمی مفاد نے خوفناک

شورشوں اور یورشوں کی صورت اختیار کی

۶ ۔ حکومت برطانیہ نے یہودیوں اور عربوں سے جو جداگانہ وعدے کر رکھے ہیں وہ باہم دگر متناقض ہیں ۔

۷ ۔ حکومت برطانیہ نے عربوں سے مواعید کے خلاف یہودی وطن کے قیام میں بے حد اعانت کی ۔ یہودیوں کی تعداد داخلہ میں کئی گناہ اضافہ ہوا ۔۔۔ زمینوں پر بھی یہود کا قبضہ بڑھتا چلا گیا یہودیوں کی صنعتوں کو فروغ حاصل ہوا ۔ اور یہودیوں کو ایک قومی حیثیت حاصل ہونا شروع ہو گئی ۔ بجا طور پر دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ حکومت نے فلسطین میں ایک یہودی وطن کے قیام سے متعلق اپنا فریضہ لائق ستائش طریق پر انجام دیا ہے یہاں تک کہ برطانوی حکومت کے اندر ایک یہودی حکومت قائم ہو گئی ہے لیکن یہودی اس پر بھی خوش نہیں ہیں کیوں کہ وہ چاہتے ہیں کہ یہودی داخلے کے لیے فلسطین کے دروازے اس طرح کھول دیئے جائیں کہ فلسطین میں یہودی اکثریت قائم ہو جائے اور پھر یہودی ریاست کا قیام آسان ہو جائے ۔

۸ فلسطین میں یہودیوں کے قومی وطن کا قیام خواہ اس کے حدود کچھ ہی ہوں ، فلسطینی عربوں کی اس قومی حیثیت کا حصول ناممکن بنا دے گا ۔ جو بقیہ عربوں کو حاصل ہو چکی ہے ۔ یہ وقت اس وقت تک برابر قائم رہے گی جب تک نظام انتداب موجود اور نافذ ہے ۔

(۴۰)

شاہی کمیشن نے تجویز پیش کی کہ فلسطین کو یہودی اور عرب دو علیحدہ علیحدہ ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے اس کمیشن کو اپنی اس تجویز میں کوئی قباحت نظر نہ آئی حالانکہ مجوزہ یہودی ریاست کا نصف یا چوتھائی حصہ عربوں کی زمینوں پر مشتمل تھا اور اسکی حدود میں پچاس فیصد عرب آبادی موجود تھی کمیشن نے دو ریاستوں کے درمیان تبادلہ آبادی کی تجویز بھی پیش کی حالانکہ مجوزہ عرب ریاست میں یہودیوں کی آبادی اور زمین کا رقبہ ناقابلِ التفات یعنی ۵ فی صدی سے بھی کم تھا ۔ کمیشن کی اس تجویز میں ایک برطانوی انتداب کا علاقہ بھی شامل تھا ۔

اس تجویز کی جانبداری اور خود غرضی بالکل عیاں تھی ۔ یہودیوں کی طرف داری حال اور مستقبل دونوں کے لئے اس تجویز کی بنیاد تھی ۔ عربوں کی سرسبز و شاداب زمینیں چھین کر یہودیوں کے پاس آجاتی تھیں اور عربوں کے لیے برہنہ پہاڑیاں اور ایک ریگستان رہ جاتا تھا جسے وہ مشرق اردن

سے مل سکتے تھے برطانوی حکومت اور یہودیوں نے تو اس تجویز کا خیر مقدم کیا۔ کیوں کہ یہودیوں کو تو اس تجویز کے ماتحت وہ کچھ مل جاتا تھا جس کے مطالبہ کی انھیں کبھی جرأت تک نہ ہو سکتی تھی۔ بلکہ جو اُن کے وہم و گمان سے بھی بالاتر تھا۔ یہودیوں کی ایک انتہا پسند پارٹی جسے صیہونیوں کی اکثریت گمراہ اور احمق سمجھتی تھی، اس تجویز پر رضامند نہ تھی۔

(۴۱)

شاہی کمیشن کی تجویز اور طریق تقسیم فلسطین کے خلاف ہر عرب کی ناراضی ایک قدرتی امر تھا۔ کیونکہ یہ تجویز و طریق تقسیم صرف فلسطین ہی نہیں تمام عرب ممالک میں عربوں کی ہستی کے خلاف ایک کھلی ہوئی ناانصافی تھی۔ اس ناراضی میں فلسطین کے ساتھ دوسرے عرب ممالک کی حکومتیں، انجمنیں اور عوام برابر کے شریک تھے۔ انھوں نے تجویز کی تقسیم کو ناانصافی جانبداری اور غداری قرار دیا۔ اور اہل فلسطین کو یقین دلایا کہ وہ اس تعصب اور ظلم سے جو فی الحقیقت فلسطین اور دوسرے عرب ممالک کے خلاف ایک سازش ہے، انھیں نجات دلانے کے لئے ان کا ساتھ دیں گے۔

عربوں نے ۱۹۳۷ء میں شام کے ایک قصبہ بلودان میں ایک قومی کانفرنس طلب کی۔ جس میں امراء رؤساء مصر، عراق، شام، مشرق اردن، حجاز اور فلسطین شامل ہوئے۔ اس کانفرنس میں عربوں نے تجویز تقسیم فلسطین پر ناراضی ظاہر کرتے ہوئے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ یہ تجویز انھوں نے مسترد کردی۔ قومی معاہدہ کی تکمیل پر اصرار کیا جو روز اول ہی سے ان کے پیش نظر تھا۔

(۴۲)

عربوں نے جلد ہی محسوس کیا کہ ان کے خلاف ایک خوفناک اور شدید سازش کی تیاریاں ہو رہی ہیں اس سازش نے انگریزی اور یہودی پریس میں عرب قومی تحریک کے رہنماؤں کے خلاف زبردست حملوں کی صورت اختیار کی۔ انھیں ضدی اور انتہا پسند کہا گیا اور حکومت سے پرزور مطالبہ کیا کہ انھیں سختی سے دبا دیا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عرب رہنماؤں کو بڑی تعداد میں گرفتار کر دیا گیا۔ عرب اعلیٰ کمیٹی توڑ دی گئی اور ممبران کی بڑی تعداد گرفتار کر لی گئی اور انھیں فلسطین سے جلا وطن کر دیا گیا۔ حکومت نے حرم مقدس یعنی اس احاطہ مسجد کو جس میں مفتی اعظم موجود تھے، محصور کر لیا۔ مفتی اعظم کو ان کو ان کے منصب صدارت مسلم کونسل اعلیٰ سے معزول کر دیا گیا۔ اور اس جگہ کو جو مسلمانوں کے اوقاف اور عدالتوں کا ناظم ہے اور جس سے ان کے تمام مذہبی اور ثقافتی ادارات وابستہ ہیں اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یہ سب کچھ انتداب

گئے قواعد و منشا کی صریح خلاف ورزی میں کیا گیا۔

عربوں اور برطانوی حکام میں کشیدگی بڑھتی گئی اور اس نے جلد ہی ایک زبردست انقلاب کی صورت اختیار کر لی جو ۱۹۳۹ء تک جاری رہا۔ تا آنکہ عالم گیر جنگ دوم شروع ہو گئی۔

(۴۳)

حکومت نے عرب تحریک آزادی کا انتہائی ظلم و تشدد سے مقابلہ کیا قریباً چھ ہزار عرب تو اس تحریک میں شہید ہوئے۔ اور اس سے دگنی تعداد مجروح ہوئی۔ پچاس ہزار کی نظر بندی عمل میں آئی۔ نظر بندوں میں جوان بوڑھے، علماء دین اور مفتیان، شرع سبھی شامل تھے۔ اس مشق ستم سے کوئی نہ بچ سکا۔ حکومت نے ذرا ذرا سے بہانے پر شہر اور دیہات میں مکانات و دکانات کو مسمار کر دینے کا خلاف قانون مشغلہ بھی پوری دریا دلی سے اختیار کیا کم از کم دو ہزار مکانات اس طرح مسمار کر دیئے گئے۔ حکومت نے ان لوگوں کو جن کے قبضے سے کوئی ہتھیار برآمد ہو، خواہ وہ چلے ہوئے چند کارتوس ہی کیوں نہ ہوں، پھانسی پر لٹکا دینے کی خدمت بھی اپنے ذمے لی۔ اس طرح ایک سو اٹھاسی عربوں کو پھانسی دی گئی۔ اس میں ان لوگوں کا شمار نہیں جنہیں کافی تعداد میں بلا مقدمہ گولی سے اڑا دیا گیا۔ سینکڑوں لوگوں کو طویل مدت کے لئے جیل میں ڈال دیا گیا۔ عربوں نے یہ تمام ظلم اور تشدد مردانہ وار صبر و تحمل سے برداشت کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ اپنے وطن اور ایک مقدس وراثت کے لئے موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ اس مرتبہ بھی دوسرے عرب ممالک سے ان کے بھائیوں نے ان کا ساتھ دیا۔ خود اس جنگ میں شامل ہوئے۔ اسلحہ مہیا کیا، روپیہ دیا۔ ان عرب ممالک کیلئے فلسطین کی امداد کرنا خود ان کے لیے پیام موت تھا۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ یہودی ریاست کا قیام سیاسی ریشہ دوانیوں کا ایک ایسا مرکز بن جائے گا۔ جہاں سے تباہ کن پراپیگنڈے اور معاشی تسلط کا ایسا سیلاب اٹھے گا جو تمام دنیائے عرب کو اپنی مہلک موجوں میں بہا لے جائے گا۔

(۴۴)

شاہی کمیشن کی تجویز کے مطابق ووڈہیڈ کمیٹی تقسیم کے منصوبے کی تکمیل کے لئے مقرر ہوئی۔ یہ کمیٹی ۱۹۳۸ء میں فلسطین پہنچی اور اگلے سال اس نے اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس کمیٹی نے مسئلہ تقسیم پر اپنے مختلف مطالعوں کے نتائج پیش کئے۔ اور یہ اعلان کیا کہ فلسطین میں ایک یہودی اور ایک عرب ریاست کا قائم کرنا ناممکن ہے۔ کیونکہ دونوں ریاستوں کے علاقے آپس میں اس طرح مربوط ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کے لئے بھی معاشی خود

کفالتی محالات سے ہوگئی ۔

اس اہم اور جدید دستاویز نے بھی عربوں کے نقطۂ نگاہ کی مکرر تائید کی سازش کے خلاف اس کیطرف سے ایک گونہ ملامت مترشح ہوئی تھی ۔ جب برطانوی حکومت نے عربوں کو اپنے میثاق ملی کے ماتحت جس کے نام پر انھوں نے زبردست قربانیاں کیں، اپنی جگہ پر پہاڑ کی طرح جمے پایا، تو اس نے بظاہر اظہار ندامت کیا اور کفارہ پیش کرنا چاہا ۔ برطانوی حکومت پر یہ بھی واضح ہوگیا کہ تمام ممالک فلسطینی عربوں کے اس حد تک ساتھ ہیں کہ ان کی نظر میں فلسطین کا معاملہ تمام مشرق عرب کا مسئلہ بن گیا ہے ۔

(۴۵)

تقسیم کمیٹی کی ٹکنیکل رپورٹ حکومت برطانیہ نے ۱۹۳۸ء میں شائع کی ۔ اس رپورٹ میں حکومت نے تقسیم فلسطین کی تجویز واپس لے لی ۔ اور اپنے اس ارادے کا اعلان کیا کہ عرب اور یہودیوں کی کانفرنس طلب کی جائے گی تاکہ اس مسئلہ پر پورا پورا غور کیا جا سکے ۔ اس کانفرنس میں فلسطین کے عرب اور عرب حکومتوں کے نمائندے شامل ہوں گے ۔

عربوں نے یہودیوں کے ساتھ کانفرنس میں شمولیت سے صاف انکار کردیا ۔ کیوں کہ انہوں نے نہ تو فلسطین پر یہودیوں کا حق کبھی تسلیم کیا تھا اور نہ ہی انھیں اس نزاع میں فریق مخالف سمجھا تھا لہٰذا اوائل ۱۹۳۹ء میں یہ کانفرنس حکومت برطانیہ اور عرب نمائندوں کے درمیان منعقد ہوئی اس کانفرنس میں عرب نمائندوں کا پُراصرار مطالبہ تھا کہ قضیۂ فلسطین کی بالکل واضح اور سادہ تنقیحات پر توجہ مبذول کی جائے اور حکومت کا وہ غیر معمولی رویہ جس کی وجہ سے فلسطین کے عربوں پر مصیبت اور رنج و غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں بدل دیا جائے ۔

عرب نمائندوں نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ حکومت برطانیہ فلسطین کی آزادی کا اعلان کرے ۔ اور اپنا اقتدار ختم کر دے اور فلسطین اور برطانیہ کے باہمی تعلقات اسی طرح کے ایک معاہدہ کی رو سے استوار ہوں جیسا کہ عراق، شام اور لبنان کے ساتھ ہوا ہے ۔ فلسطین میں یہودیوں کے داخلے اور ان کے پاس انتقال اراضی پر پابندی کا مطالبہ بھی کیا گیا۔ حکومت پر اچھی طرح واضح کر دیا گیا کہ فلسطین اپنے ہمسایہ عرب ممالک کی سی حیثیت رکھتا ہے ۔

(۴۶)

حکومت برطانیہ نے عرب نکتہ نگاہ کو فوراً ہی تسلیم نہ کرلیا ۔ اور کانفرنس بلا کسی متفقہ فیصلہ کے برخاست ہوگئی لیکن عربوں کی تجویز کو یکسر مسترد بھی نہ کردیا گیا حکومت نے عربوں کے زاویہ نگاہ کی موافقت میں ایک پالیسی اختیار کرلی اور ۱۹۳۹ء کے موسم بہار میں اس کا اعلان کردیا گیا ۔

یہ اعلان ایک قرطاس ابیض کی صورت میں ہوا۔ یہ قرطاس حسب ذیل اعتراف اور نتائج کے لحاظ سے تمام دستاویزات سے اہم ثابت ہوا۔

(۱) حکومت نے سرکاری طور پر صاف صاف تسلیم کر لیا کہ عربوں اور یہودیوں سے اس کے مواعید باہم متناقض ہیں۔ حکومت نے یہودی وطن کے مفہوم اور اس کے حدود کے ابہام کو بھی تسلیم کر لیا۔

(۲) حکومت نے یہودی قومی وطن کی جدوجہد میں اپنی اعانت و حمایت کا اعتراف کرتے ہوئے اس امر کا بھی اعلان کیا کہ مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اہل فلسطین کو جس قدر جلد ممکن ہو دوسرے عرب ممالک کے سے حقوق خود اختیاری دیئے جائیں۔

(۳) حکومت نے اپنے اس ارادے کا بھی اعلان کیا کہ لیگ آف نیشنز کے مشورہ کے بعد حکومت برطانیہ انتداب کو ختم کر دے گی۔ اور دس سال کے اندر اندر فلسطین میں ایک آزاد حکومت قائم کر دے گی جس کے تعلقات برطانیہ سے ایک معاہدہ پر استوار ہوں گے۔ یہ تجویز کی گئی کہ فلسطینی عربوں کو اپنے ملک کے نظم و نسق میں روزافزوں حصہ دیا جائے۔ اور پانچ سال کے بعد فلسطینیوں اور حکومت برطانیہ کے نمائندوں کی ایک جماعت آئندہ نظام سیاسی پر غور کرے اور آزاد ریاست فلسطین کے لئے ایک آئین تیار کرے۔

(۴) حکومت نے زمین کا مسئلہ بھی ایسے قواعد مرتب کر کے حل کرنے کا فیصلہ کیا۔ جن کی رو سے انتقال اراضی کی یا تو کلی ممانعت کر دی جائے گی۔ یا اس پر شدید پابندیاں عائد کر دی جائیں گی۔

قرطاس ابیض میں یہ صاف صاف اعلان کر دیا گیا کہ حکومت برطانیہ اپنی مجوزہ پالیسی پر عملدرآمد شروع کر دے گی۔ خواہ عرب اور یہود دونوں ان میں سے کوئی ایک اس پالیسی میں اشتراک عمل سے انکار ہی کیوں نہ کر دے۔

(۲۷)

ریاست فلسطین کے مدارج ترقی اور اس کا آئینی ارتقاء جیسا کہ ۱۹۳۹ء کے قرطاس ابیض میں تجویز کیا گیا تھا کچھ مبہم سا تھا۔ اور ایک حد تک تو اسے یہودی آبادی کی خواہش و رضامندی پر موقوف رکھا گیا تھا۔ عرب اعلیٰ کمیٹی کو اس پر اعتراض تھا اور تمام دنیائے عرب نے احتیاط و تامل کو لازم سمجھا۔

عربوں نے قرطاس ابیض کے تحفظات اور اس کی تعویق اندازیوں کو بھی بھانپ لیا تھا۔

وہ ایک بار پھر اسی نتیجے پر پہنچے کہ حکومت برطانیہ محض دفع الوقتی سے کام لے کر پیچیدگیاں بڑھا رہی ہے اور عربوں کو اپنے وعدوں اور دلاسوں سے بہلا رہی ہے۔ جب عربوں نے یہ دیکھا کہ اب یہودی جن کی آبادی میں برطانیہ کی اعانت وحمایت سے اضافہ ہو چکا تھا، اس وقت تک مصالحت اور اشتراک عمل پر رضامند نہ ہوں گے جب تک ریاست فلسطین کی بنیادی شرط یہودیوں کی دائمی اقلیت قائم ہے تو وہ اور بھی زیادہ محتاط ہو گئے۔ یہودیوں نے ہر اس فیصلے کو جو ان کی موافقت میں نہ تھا۔ مسترد کر دیا تھا۔ لہٰذا اس میں کوئی تعجب نہ تھا۔ اگر انھوں نے اس تازہ پالیسی کو بھی نامنظور کر دیا۔ اور اس کے خلاف احتجاج کیا۔ ان کے طرز عمل سے ان کا عندیہ معلوم ہو گیا۔

(۴۸)

قرطاس ابیض کی اشاعت کے چند ماہ بعد ہی عالم گیر جنگ دوم کا آغاز ہوا فلسطینی عربوں نے برطانیہ سے اس امید پر ایک ہنگامی صلح کا اعلان کر دیا کہ برطانیہ ان کے طرز عمل کی ستائش کرے گا۔ اور جنگ کے اختتام پر ان سے نیا معاہدہ کر کے اپنا وعدہ پورا کرے گا عرب رضاکار دستوں میں بھرتی ہوئے۔ ان میں سے بہت سے افریقہ اور یورپ کے محاذوں پر لڑے۔ بہت سے جنگ میں کام آئے۔ ان عربوں نے جو جنگ میں شامل ہوئے۔ برطانیہ کے خلاف اس وقت بھی انگلی تک نہ ہلائی جب جرمن اسکندریہ کی سرحد پر پہنچ گئے اور نہر سویز کو خطرہ پیدا ہو گیا۔

(۴۹)

برطانوی حکومت نے دوران جنگ میں فلسطین کے اندر ایک یہودیوں کے حفاظتی ڈویژن کو تربیت دی اور اسے ہر قسم کے اسلحہ سے مسلح کر دیا۔ برطانیہ میں یہودیوں کو برطانوی فوج میں ایک ڈویژن قائم کرنے کی اجازت دے دی۔ جس کی بدولت انھیں فوجی تربیت حاصل کرنے اور مسلح ہونے کا موقع میسر آگیا۔ صیہونی انجمنوں نے اس موقعہ کو برطانیہ پر ۱۹۳۹ء کے قرطاس ابیض کو ٹالنے کے لئے دباؤ ڈالنے اور یہودیوں کے داخلے کو جو قریباً بند ہو چکا تھا دوبارہ جاری کرانے کے لئے غنیمت سمجھا۔ یہودیوں کے بعض مسلح گروہوں نے برطانوی حکام کے خلاف تشدد آمیز اور دہشت انگیز رویہ اختیار کیا۔ جیسا کہ ۱۹۴۶ء کے قرطاس ابیض سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہودی ایجنسی کا ان تمام چالوں میں نمایاں حصہ تھا۔ یہودیوں نے یورپ کے یہودیوں پر جو خوفناک مظالم ہوئے تھے ان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک طوفان برپا کر دیا

اور پر زور مطالبہ کیا کہ ان بے خانماں یہودیوں کو فلسطین میں داخل ہونے کی اجازت ملنی چاہیئے امریکن اور بعض دوسرے لوگوں نے فلسطین میں یہودی داخلے کے لئے ان کی ہمنوائی کی۔ اگرچہ اب نازی ازم کی شکست اور جمہوریت کی فتح کے بعد اس ہنگامہ کا کوئی جواز باقی نہ رہا تھا۔ اب جمہوری حکومتوں کو یہودیوں کے ان کے اصلی وطنوں میں آباد رہنے کے حقوق کی حفاظت کی ضمانت پیش کرنے کا کافی موقعہ میسر تھا۔ صیہونیوں نے جو طریقہ اختیار کر رکھا ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ اقلیت کی رائے کو اکثریت پر مسلط کر دیا جائے۔ اسے اپنے فطری حقوق کے حصول و استعمال سے محروم رکھا جائے۔

(۵۰) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے امریکن یہودی صیہونی انجمنوں میں داخل ہو گئے۔ جو دشمن کے خلاف جذبہ منافرت سے جو ابھی تازہ تھا۔ اپنے مفید مطلب کام لینے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کر رہے تھے۔ انھوں نے کمال عیاری سے تمام یہودیوں کو مشرقی یورپ کے بے خانماں لوگوں کے کیمپوں میں پہنچانا اور جنوبی یورپ کے مختلف مقامات میں جمع کرنا اور وہاں سے مختلف خفیہ طریقوں سے انہیں فلسطین درآمد کرنا شروع کر دیا۔ U.N.R.R.A کا عملہ جو یہودی بکثرت ملازم تھے انھوں نے اپنے مناصب کا ناجائز فائدہ اٹھایا جیسا کہ سر فریڈرک مارگن ڈائریکٹر فیلڈ U.N.R.R.A ۔ عملہ جرمنی کے افسر اعلیٰ نے صاف صاف ظاہر کیا۔ اس نے یہ راز طشت از بام کر دیا کہ یہ لوگ ہرگز بے خانماں نہیں ہیں۔ بلکہ انھیں تو ایک مخصوص سیاسی مقصد کے لئے خفیہ اور منظم طریقوں سے بھرتی کیا جاتا ہے جن کا اخلاقیات اور نوع انسان کی ہمدردی سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس طرح ایک وسیع یہودی سازش معرض وجود میں آئی جس کی پشت پناہی کے لئے دہشت انگیزی، تشدد، پراپیگنڈہ مظاہرہ، غرض ہر حربہ موجود تھا۔ اور جس نے بڑی مکاری وعیاری سے ان فیاضانہ عطیات کا جو چار دانگ عالم سے خانماں برباد انسانوں کی امداد کے لئے پہنچ رہے تھے۔ اس مقصد کے لئے استعمال کیا۔ اس طرح صیہونیوں کو دنیا کے مختلف حصوں میں اپنا اثر قائم کرنے کا موقع ملا۔ اور بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیئے گئے کہ فلسطین پر یہودیوں کا دعویٰ حق و انصاف پر مبنی ہے۔ اس طرح قضیۂ فلسطین کا ایک منصفانہ حل جو جنگ سے پہلے بالکل آسان نظر آ رہا تھا۔ بیحد پیچیدہ ہو گیا۔

(۵۱) امریکہ میں یہودی انجمنوں کو نہایت نمایاں اثر حاصل تھا۔ یہودیوں نے اپنی ان انجمنوں کے سیاسی وملکی اثرات کے امداد و ووٹوں سے

پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ان ایجنٹوں نے سرکاری افسروں اور سیاسی پارٹیوں کو اس قوت اور رسوخ کی بنا پر اپنے ساتھ ملا لیا اور اس طرح تصفیۂ فلسطین اور بھی الجھا دیا ہے۔ یہودیوں نے صدارت امریکہ کے انتخاب پر جس قوت اور زور شور کا مظاہرہ کیا۔ حیرت زدہ دنیا اسے آج تک فراموش نہیں کر سکی۔ دنیا کو یہ بھی پورے تاسف کے ساتھ یاد ہے کہ کس طرح امریکہ کی دو پارٹیاں صیہونیت کی تائید کے لئے آپس میں متحد ہو گئیں کیوں کہ یہودیوں نے ان پارٹیوں کو اپنے اصول سے جہاں تک فلسطین میں اس کے اطلاق کا تعلق تھا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح اہل امریکہ اپنے اصولوں کا جنازہ اپنے ہی کندھوں پر اٹھا کر امریکہ میں یہودیوں کی حمایت پر کمر بستہ ہو گئے۔

یہودیوں کی یہ حمایت ملک کے اصلی باشندوں اور وارثوں یعنی عربوں کے خلاف تھی۔ مدعا یہ تھا کہ یہود کو فلسطین میں اس کثرت سے داخل کیا جائے کہ عرب ایک اقلیت بن کر رہ جائیں۔ اور اسی طرح عربوں کے ملک میں نوک سنگین و بزور شمشیر ایک مذہبی نسل کو ہمیشہ کے لیے مسلط کر دیا جائے۔ اور عربوں کی موجودہ اکثریت ایک دائمی اقلیت میں بدل کر رہ جائے۔ عربوں کی معمولی کوششیں صیہونیوں کے پیدا کئے ہوئے اثرات کو بدل دینے کے لیے ناکافی تھیں اور عربوں کی ناتواں آواز یہودیوں کے مطالبات کے ظلم و نا انصافی کو دنیا پر واضح کرنے سے قاصر رہی۔ صیہونی یہودیوں کا برطانوی لیبر پارٹی پر بھی زبردست اثر تھا۔ اسی اثر کی وجہ سے یہ عقدہ پیچیدہ تر ہو گیا۔ اسی اثر نے لیبر گورنمنٹ کو مجبور کیا کہ قرطاس ابیض کے ان وعدوں سے جو حکومت نے کیے تھے۔ اور جن کا احترام ان پر واجب تھا۔ اور جن کے بعد از جنگ ایفا کا عربوں کو یقین تھا بے تعلقی کا اظہار کیا۔

یہ سب کچھ یہودیوں کی شرمناک احسان ناشناسی کے باوجود عمل میں آیا۔ یہ بھی ایک تلخ حقیقت تھی کہ یہودی سرتاپا مسلح ہو رہے اور دہشت انگیزی پھیلا رہے تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ انگلستان آج بھی صیہونی اثر کے ماتحت ہے۔ حالانکہ یہودی کی دہشت انگیزی نے ان گنت برطانویوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ سرکاری دفتروں اور عمارتوں کو خاک کا ڈھیر بنا دیا۔ حکومت فلسطین پر بہت زیادہ مصارف کا بار ڈالا۔ جن کی ادائیگی ٹیکسوں کی صورت میں ہوتی تھی۔ اس طرح حکومت کا کافی نقصان ہوتا رہا۔ اس دہشت انگیزی کی زد عربوں پر بھی پڑتی تھی۔ کیوں کہ حکومت کے ٹیکس کا غالب حصہ انھیں ادا کرنا پڑتا تھا۔ یہودیوں کی اس روش نے ملک کی معاشی اور سماجی زندگی

حنیف شاہد

اسرائیلی جارحیت

۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۷ء تک

اسرائیل اور عرب جھگڑے کا پس منظر بہت ہی گہرا اور موجودہ بحران کی داستان بہت طویل ہے۔

یہودی آباد کار انیسویں صدی میں فلسطین میں اس وقت آنے شروع ہو گئے تھے، جب یہ سلطنت ابھی سلطنت ترکیہ کا حصہ تھا۔ ۱۸۹۷ء میں تھیوڈر ہرزل نے پہلی صیہونی کانگرس بلائی جس میں فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کا پہلی بار منصوبہ بنایا گیا۔ یہی منصوبہ بنیادی اساس ثابت ہوا۔ اور انیسویں صدی میں فلسطین آنے والے یہودی اپنے قدیم "ہوم لینڈ" میں نئی یہودی مملکت کا خواب لے کر آ گئے تھے، اسی دوران میں (۱۸۸۱ء سے ۱۹۲۴ء تک) وسطی یورپ سے پچیس لاکھ یہودی امریکہ پہنچ گئے۔ ۱۹۱۸ء میں امریکن جیوئش کانگرس کی اساس رکھی اور صیہونی تحریک کا باقاعدہ آغاز کر دیا۔ پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کے خلاف یہودیوں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے برطانوی حکومت نے اعلان بالفور کیا۔ اور اس تحریک نے ایک نئی کروٹ لی۔ یہ اعلان دراصل ایک سازش تھی جس کے خلاف برطانوی حکومت نے یہودیوں کے مقاصد اور وطن کی حمایت کی تھی۔ اور انہیں ہر ممکن مدد دینے کا وعدہ کیا تھا، اس وقت مشرق وسطیٰ کا بیشتر علاقہ ترکی میں شامل تھا۔ اور اس نے جرمنی کے ساتھ ہو کر اتحادیوں کے خلاف جنگ کی تھی۔ چنانچہ پہلی جنگ کے بعد ۱۹۲۳ء میں لیگ آف نیشنز نے فلسطین کو برطانیہ کے انتداب میں دے دیا۔ اور اس (برطانیہ) نے یہودیوں کو ان کے حقوق کے تحفظ کا از سر نو یقین دلایا لیکن عربوں کی طرف سے یہودیوں کی آباد کاری کی شدید مخالفت ہونے پر اعلان بالفور واپس لے لیا گیا مگر درپردہ یہودیوں کی آمد جاری رہی اور بالآخر اعلان بالفور اور اس کے مختلف معاہدوں میں فلسطینی عربوں کو تحفظ کی جو ضمانتیں دی گئی تھیں، انھیں آہستہ آہستہ پس پشت ڈال دیا گیا۔

فلسطین میں یہودیوں کی آمد اور اسرائیل کا قیام ایک سوچے سمجھے منصوبے کی کڑیاں ہیں۔ ۱۹۲۲ء میں فلسطین کی آبادی آٹھ لاکھ تھی جبکہ ۱۹۴۲ء میں ساڑھے سولہ لاکھ ہو گئی۔ آبادی میں یہودیوں کا تناسب دس فی صد تھی۔ جو بڑھ کر ۳۱ فیصد ہو گیا۔ گویا

سال کے اس عرصے میں تقریباً ساڑھے تین لاکھ یہودی مشرقی یورپ سے نقل مکانی کر کے فلسطین میں آباد ہو گئے دونوں عالمگیر جنگوں کے درمیانی عرصے میں بیس ہزار یہودی ایشیا اور شمالی افریقہ سے آکر فلسطین میں آباد ہوئے۔

عربوں کی زمین پر قبضہ

یہودیوں کو یہ پتہ تھا کہ شہروں میں آباد ہو جانا ہی کافی نہیں۔ یہ صرف پاؤں جمانے کی بات تھی۔ اس کے بعد انہوں نے پہلا قدم اٹھایا اور غیر آباد زمین پر قبضہ کر کے کاشت شروع کر دی۔ اگرچہ عرب آبادی اس پر معترض تھی۔ لیکن چونکہ بے دخلی وغیرہ ایسی قانونی کارروائی ضروری نہ تھی۔ اس لئے یہودیوں کو ایسی زمین پر قبضہ کرنے میں آسانی رہی۔ جو یہودی سرمایہ ساتھ لائے تھے۔ انہوں نے عرب آفندیوں سے زمین خریدنا شروع کر دی۔ اور جلد ہی وہ ایک چوتھائی قابل کاشت اراضی پر قابض ہو گئے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک اور چال چلی کہ یہودی اپنی خرید کردہ اراضی کو اجتماعی ملکیت قرار دیتے۔ اور کسی عرب کو ملازم یا مزدور نہیں رکھتے تھے۔

۱۹۲۰ء میں فلسطین جب برطانیہ کے زیر تسلط چلا گیا عربوں نے انتظامیہ میں شریک ہونے سے انکار کر دیا اور ان کے دلوں میں اندر ہی اندر آگ سلگتی رہی ۱۹۲۹ء میں چنگاری نے شعلے کا روپ دھارا۔ اور اسی سال اگست میں فلسطین میں عموماً اور یروشلم میں خصوصاً خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ جس سے تقریباً دو سو افراد ہلاک ہو گئے۔ برطانیہ نے مجبوراً مزید یہودیوں کے داخلے کی ممانعت کر دی اور ایک قرطاس ابیض کے ذریعے عربوں کی ملکیتی زمین کی خرید و فروخت پر پابندی کی تجویز پیش کی گئی۔

لیکن یہودیوں کی آمد جاری رہی ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۷ء کے دوران مزید پونے دو لاکھ یہودی فلسطین میں آباد ہوئے۔

جدوجہد کا آغاز

اپریل ۱۹۳۶ء میں "عرب ہائی کمیٹی" نے پہلی بار منظم طریقے سے اس سازش کے خلاف جدوجہد کا آغاز کیا۔ اس موقع پر یہودیوں کے ناپاک عزائم پر سے پردہ چاک ہوا۔ اور دنیا کو پتہ چل گیا کہ انھوں نے خفیہ طور پر پوری فوجی تیاری کر رکھی تھی ان کی دو خفیہ اور غیر قانونی فوجی جماعتیں ہتھیاروں سے پوری طرح لیس تھیں۔ ایک ہی دن میں یہودیوں نے اپنی آبادی کے گرد خاردار تار کے حصار کھینچ لئے۔ ریت کی بوریوں کے مورچے بن گئے۔ اور اونچے مقامات پر سرچ لائٹیں نصب ہو گئیں۔ یہ سب کچھ پہلے سے تیار تھا۔ ۱۹۳۶ء میں عرب اپنی سرزمین کو غاصبوں سے بچانے کے لئے میدان جہاد میں کود پڑے

اسی سال اپریل سے اکتوبر تک جاری رہنے والی عام ہڑتال کے باعث صورت حال اور بھی کشیدہ ہو گئی۔

تقسیم کی تجویز

برطانوی حکومت نے مزید دستے فلسطین میں متعین کر دیئے اور اس کے ساتھ ہی لارڈ پیل کی زیر قیادت شاہی کمیشن مقرر کیا۔ اس کمیشن نے برطانیہ کی پالیسی پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہوئے فلسطین کی تقسیم کو ضروری قرار دیا۔ تقسیم کے برطانوی منصوبے کے تحت سیفہ اور جافہ کے درمیان ایک "آزاد" یہودی ریاست قائم ہونا تھی۔ جافہ اور یروشلم کے درمیان ایک حصہ برطانیہ کے زیر تسلط رہنا تھا۔ اور باقی علاقہ عربوں کو یعنی اردن کو ملنا تھا۔

کل عرب کانفرنس

عرب کسی طور بھی ایک یہودی سلطنت کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ۷ جولائی ۱۹۳۷ء کو شام میں ایک کل عرب کانفرنس ہوئی جس میں سو سے زائد نمائندوں نے شرکت کی۔ اس کانفرنس نے برطانوی منصوبہ مسترد کر دیا۔ اس کے بعد عربوں کی جدوجہد شدت اختیار کر گئی۔

برطانیہ اب تک اپنے آپ کو عربوں کا ہمدرد ظاہر کرتا تھا۔ لیکن اس ہمدردی کی حقیقت بھی جلد ظاہر ہو گئی۔ یکم اکتوبر کو عرب ہائی کمیٹی کے تقریباً تمام ارکان گرفتار کر کے ملک بدر کر دیئے گئے تاہم مفتی اعظم فلسطین امین الحسینی بچ نکلے۔ اور شام پہنچ کر تحریک آزادی کی قیادت کرنے لگے ۱۹۳۹ میں وہ عراق اور ایران اور ۱۹۴۱ء میں برلن پہنچ گئے۔ جنگ کے دوران انہوں نے برلن سے برطانوی استعمار کے خلاف پراپیگنڈہ جاری رکھا۔ برلن پر قبضہ ہو گیا۔ تو وہ فرانس پہنچ گئے۔ اور بہ ڈرامائی طور پر گرفتاری سے بچ کر مصر آ گئے۔

برطانیہ کا یکطرفہ فیصلہ

دریں اثنا ۱۹۳۸ء میں خانہ جنگی باقاعدہ تحریک آزادی کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ برطانیہ کے تیس ہزار سپاہی فلسطین میں موجود تھے۔ لیکن اتنی بڑی جماعت بھی حریت پسند عربوں کی یلغار روکنے میں ناکام رہی برطانیہ نے ایک اور چال چلی۔ اس نے فروری مارچ ۱۹۳۷ء میں لندن میں ایک کانفرنس طلب کی جس میں دونوں فریقوں کے علاوہ مصر، سعودی عرب، عراق، اردن اور یمن کو بھی شرکت کی دعوت دی۔ عرب اب بھی برطانیہ کی چال میں نہ آیا۔ تو اس نے ۱۷ مارچ کو اپنے منصوبے کا اعلان کر دیا کہ

> ۱۹۴۹ء میں فلسطین عراق اور اردن کی طرح آزاد ہو جائے گا۔ ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۴ء کے درمیان ۷ ہزار سے زیادہ یہودیوں کو فلسطین آنے کی اجازت نہ ہوگی۔ اس کے بعد یہودیوں کی آمد کے

کرنے میں عرب اکثریت کا فیصلہ حتمی ہوگا
فلسطین آزاد ہو جائے گی، پورے فلسطین
میں عربوں کی ملکیتی زمین کی خرید و فروخت
کی اجازت نہ ہوگی۔"

برطانوی پارلیمنٹ کے تمام ارکان اس منصوبے سے متفق نہ تھے۔ سرکاری پارٹی کے سوا ارکان نے رائے شماری میں حصہ نہ لیا جبکہ ۲۲ نے اس کی مخالفت میں ووٹ دیا۔ ان میں سر ونسٹن چرچل بھی شامل تھے۔

فلسطین میں بھی عربوں نے اس منصوبے کو ایک چال قرار دیا۔ اور وہاں گوریلا جنگ ایک بار پھر بھڑک اٹھی۔ انہیں دنوں دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی جس کے باعث یہ معاملہ وقتی طور پر سرد پڑ گیا۔

امریکہ کی سرگرمیاں

لیکن جب جرمنوں کو شمالی افریقہ اور کاکیشیا سے نکال دیا گیا تو یہودیوں نے پھر دہشت انگیز سرگرمیاں شروع کر دیں۔ برطانیہ نے اس غیر موزوں حالات پر قابو پانے کے بجائے فلسطین سے نکل جانا مناسب سمجھا۔

امریکہ بھی یہودیوں کی ریاست کے قیام کی کوششوں میں پیش پیش تھا۔ صدر ٹرومن ۱۹۴۵ء میں کئی بار وزیر اعظم ایٹلی سے یہ مطالبہ کر چکے تھے کہ یورپ سے نکالے ہوئے ایک لاکھ یہودیوں کو فلسطین میں آباد کیا جائے

۱۹۴۷ء کے اوائل میں برطانوی فوج فلسطین میں اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگی اور برطانوی حکام کے بیوی بچے برطانیہ روانہ ہو گئے۔ اس موقع پر برطانیہ نے اقوام متحدہ سے مداخلت کی درخواست کی۔ اقوام متحدہ نے جس پر امریکہ اور اس کے حواریوں کی گرفت تھی فلسطین کو تقسیم کرنے یا دوسرے لفظوں میں صیہونی ریاست کے قیام کا منصوبہ بنایا۔ یروشلم کو بین الاقوامی شہر قرار دینے کی تجویز تھی۔

ایشیائی اقوام کی مرضی کے خلاف

اقوام متحدہ نے ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو تقسیم کا یہ منصوبہ دو تہائی اکثریت سے منظور کر لیا۔ لیکن یہ اکثریت کچھ ایسی تھی کہ متعلقہ اقوام یعنی ایشیائی ممالک میں سے فلپائن کے سوا کسی نے بھی اس کے حق میں ووٹ نہ دیا مخالفت میں ووٹ دینے والوں میں پاکستان، افغانستان، مصر، عراق، ایران، الیمن، لبنان، السعودی عرب، ترکی، یونان، کیوبا اور ہندوستان شامل تھے جبکہ اس کے حق میں امریکہ، روس، لائبیریا، فلپائن اور جنوبی امریکہ کے ممالک نے ووٹ دیئے۔ برطانیہ اور چار دوسروں نے اپنا حق استعمال نہیں کیا۔ چونکہ یہ فیصلہ یکطرفہ تھا اور عربوں اور ایشیائی اقوام کی مرضی کے خلاف کیا گیا تھا، اس لئے ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو جب برطانیہ نے اقتدار ختم کیا اور صیہونی ریاست قائم ہوئی تو فلسطین میں پھر جنگ

کے شعلے بھڑک اٹھے۔

عرب ممالک مصر، عراق، یمن، اردن، لبنان، سعودی عرب، شام سب عرب لیگ کے پرچم تلے متحد ہو چکے تھے۔ جنوری ۱۹۴۸ء میں فلسطین کے عربوں اور بین الاقوامی عرب لشکر آزادی نے فلسطین میں گوریلا جنگ کا آغاز کر دیا تھا۔ اس سال مئی میں اردن، عراق اور مصر کی فوجوں نے بھی صیہونی ریاست کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

دوسری طرف اسرائیل کے ساتھ پورا مغربی بلاک تھا۔ امریکہ اور چیکوسلواکیہ نے خاص طور پر اسرائیل کی بہت مدد کی۔ اور ان دونوں ملکوں سے طیارے اور اسلحہ سمگل ہو کر اسرائیل کو ملتا رہا۔

اس دوران ایک یہودی نے اقوام متحدہ کے سویڈش کمشنر کو ہلاک کر دیا۔ انہوں نے ایک بار دوبارہ تقسیم کا نیا منصوبہ شائع کیا تھا۔ جس کے مطابق نجب عربوں کو ملنا تھا۔

اسرائیل کو امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک کی خفیہ اور کھلم کھلا امداد کے باعث عرب ممالک فلسطین کی جنگ آزادی میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکے اور جنوری تا جولائی ۱۹۴۹ء کے مذاکرات کے نتیجہ میں اردن کو سابق فلسطین کا پانچواں حصہ، مصر کو غزہ کا مختصر حصہ اور باقی سارا علاقہ یہودیوں کو دے دیا گیا۔ عرب اس فیصلے کو تسلیم نہیں کرتے۔ تو ان پر زبردستی ٹھونسا گیا تھا۔

یہودیوں نے اپنی ناجائز ریاست کے قیام کے فوری بعد عرب مسلمانوں پر مظالم ڈھانا شروع کر دیئے اور ہزاروں بے گناہوں کو شہید کر دیا گیا۔ اور وہ اب تک اردن اور مصر میں پناہ گزین ہیں۔ ان کے مکان اور زمینیں یہودیوں کو دے دی گئیں جو یورپ شمالی افریقہ اور مشرق وسطی سے آئے تھے۔

اسرائیل عربوں کے سینے کا ناسور ہے اور مغربی استعمار کا آلہ کار۔ یہ ایک خنجر ہے جو مغربی استعمار نے عربوں کی کمر میں گھونپ رکھا ہے۔

یہ سازش یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ مغربی سامراجیوں کی شہ پر اسرائیل نے ہمیشہ جارحیت کا ارتکاب کیا۔ اور باوجودیکہ مئی ۱۹۵۰ء میں امریکہ، برطانیہ اور فرانس نے ایک اعلان کے ذریعے عرب اور اسرائیل کی سرحدوں کی حفاظت کی ضمانت دی تھی۔ اسرائیل نے سرحدی جھڑپوں کا سلسلہ بدستور جاری رکھا۔

حالانکہ مغربی سامراج نے مشرق وسطی میں قیام امن کی ذمہ داری رضاکارانہ طور پر اپنے سر لیتے ہوئے یہ حقیقت فراموش کر دی تھی کہ اس وقت اسرائیل کی حدیں اس سے کہیں آگے تھیں۔ جو فلسطین کو چھوڑتے وقت انگریز نے مقرر کی تھیں۔ یہودیوں نے خلیج عقبہ تک رسائی بھی جارحانہ کارروائی کے ذریعے حاصل کی اور نہ انگریزوں نے اسے جو علاقہ بخشا تھا وہ خلیج عقبہ کے

ساحل سے خاصا دور تھا۔

اپریل سنہ ۱۹۵۴ء میں جب صدر ناصر نے مصر میں اختیارات سنبھالے تو انہوں نے برطانیہ کو نہر سویز کے خطہ سے اپنی فوجیں نکالنے پر مجبور کیا۔ جس کے نتیجے میں مشرق وسطیٰ اور ایشیا میں سامراجیوں کے مفادات کو شدید دھچکا لگنے کا خدشہ تھا۔ چنانچہ ۱۹۵۵ء میں مغربی ممالک نے ہتھیار دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر صدر ناصر نے روس اور زیکوسلواکیہ سے کپاس کے عوض ہتھیار حاصل کرنے کا معاہدہ کیا۔ جولائی ۱۹۵۶ء میں صدر ناصر کے کیمونسٹ ممالک سے ہتھیار حاصل کرنے پر امریکہ نے سزا کے طور پر مصر میں اسوان بند بنانے کی پیش کش واپس لے لی۔ چنانچہ صدر ناصر نے جوابی اقدام کے طور پر نہر سویز کو قومی ملکیت میں لے لیا۔ اس طرح اس مغربی کمپنی کو بے دخل کر دیا۔ جو نہر سویز کے نظام اور انتظام کی مختارِ کل تھی۔ یہ فیصلہ اینگلو فرانسیسی حکمرانوں کو ناگوار گزرا۔ چنانچہ برطانیہ فرانس اور اسرائیل نے مصر کے خلاف مشترکہ کارروائی کا خفیہ منصوبہ بنایا۔ اور انہوں نے اسرائیل کو اشارہ کیا کہ وہ وقت آپہنچا ہے جس کے لئے اس مصنوعی ریاست کا قیام عمل میں آیا تھا۔ چنانچہ اسرائیل نے مصری علاقہ پر حملہ کر دیا۔ اور صحرائے سینا میں سے پیش قدمی کرتے ہوئے نہر سویز کی جانب بڑھا۔

مصری مدبروں کو اندازہ تھا کہ اینگلو فرانسیسی فوج مصر پر حملہ کرنے کے لیے تیار کھڑی ہے۔ چنانچہ مصری فوج کا ایک حصہ یہودیوں کے مقابلہ کے لئے بڑھا اور دوسرا اینگلو فرانسیسی حملہ آوروں کی راہ روکنے کے لئے نہر سویز کے قریب جمع رہا۔ یہ اندازہ درست نکلا۔ انگریز اور فرانسیسی فوج نہر سویز کے علاقے میں اتر گئی۔ نئے اور بڑے حملہ آوروں سے پنجہ آزمائی کے لیے ناگزیر تھا کہ مصری فوج کا بیشتر حصہ نئے محاذ پر موجود رہے چنانچہ یہودیوں کا مقابلہ کرنے والی مصری فوج کے بہت سے دستے واپس بلا لئے گئے۔ یہ راز تھا یہودی فوج کی پیش قدمی کا۔

سویز کی جنگ کے اختتام پر یہودیوں نے طمطراق سے یہ دعویٰ کیا کہ ان کے مقابلے مصر کو شکست فاش ہوئی ہے۔ اور یہودیوں کے سرپرستوں نے اس دعویٰ کو خوب خوب اچھالا مگر حقیقت یہ تھی کہ مصر اس وقت فوجی اعتبار سے اتنا طاقتور نہیں تھا کہ بیک وقت تین بڑے دشمنوں کا مقابلہ کرتا۔ اس کی فوج کسی ایک محاذ ہی پر لڑ سکتی تھی۔ اور فوجی نقطہ نظر سے یہ صورت خطرناک حماقت کہلاتی۔ اگر مصری فوج کا بیشتر حصہ اسرائیلی محاذ پر جمع رہتا۔ اس طرح اینگلو فرانسیسی فوج نہر سویز کے دونوں کناروں پر بلا روک ٹوک قبضہ کر لیتی۔ اور مصری فوج چاروں طرف سے گھر جاتی۔ اینگلو فرانسیسی فوج نہر سویز کے علاقے سے نکل کر

قاہرہ اور مصر کے اہم مراکز پر بھی قبضہ کرلیتی۔ مصری رہنماؤں کا یہ فیصلہ درست تھا کہ انہوں نے اپنی فوج کا بیشتر حصہ اینگلو امریکی حملہ آوروں کے مقابلے کے لئے وقف رکھا۔ اور یہودیوں کو صحرائے سینا میں بڑھنے کی اجازت دے دی۔ اسے یہودی لیڈروں نے بڑی ڈھٹائی سے اپنی کامیابی اور کامرانی کا ثبوت قرار دیا۔

اینگلو فرانسیسی حملہ آور تو اپنا استعماری مقصد حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ مگر انہوں نے یہودیوں کو دوسرے مغربی ملکوں کی مدد سے اس خدمت کا یہ انعام دلایا کہ اقوام متحدہ کے ذریعے خلیج عقبہ کی ناکہ بندی ختم کرادی اور اسرائیلی جہاز اس عرب خلیج کو استعمال کرنے لگے۔ دوسری طرف مصر اور "اسرائیل" کی سرحد پر اقوام متحدہ کی فوج متعین ہو گئی تاکہ یہودیوں کو اس جانب سے حملے کا خوف نہ رہے۔ اور یہودی جب چاہیں اپنے عرب پڑوسیوں کو پریشان کرتے رہیں۔ یہودیوں کو اس جارحانہ کارروائی کے اور انعام بھی ملے مگر ان کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے

یہاں اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ سامراج نے اسرائیل کو عربوں کے سر پر اس لئے مسلط کیا تھا کہ عربوں میں دوسری جنگ عظیم کے بعد تیل کی دولت ہونے سے مشرق وسطیٰ میں ان کے مفادات کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے، ان کی حفاظت اسرائیل کے ذریعے کی جائے۔ اسی لئے ہر موڑ پر سامراجیوں نے اسرائیل کا ساتھ دیا۔ چنانچہ ۵۶ء کی جنگ سویز کے بعد بھی سامراج کی طرف سے اسرائیل کو شہہ ملتی رہی، اور اسرائیل کے جارحانہ عزائم میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔ مارچ ۱۹۶۰ء میں اسرائیل کے وزیر اعظم ڈیوڈ بن گوریان نے اعلان کیا کہ اسرائیل صحرائے نجف میں آبپاشی کے لئے دریائے اردن کا رخ تبدیل کرے گا۔ اسرائیل کا یہ مقصد عربوں کے ایک وسیع رقبے کو آبپاشی کی سہولتوں سے محروم کرنا تھا۔ چنانچہ عربوں نے جوابی کارروائی کی دھمکی دی جس پر اسرائیل کے عزائم کسی حد تک سرد ہو گئے۔ مگر مئی ۶۳ء میں صدر کینیڈی کی طرف سے اسرائیل اور عرب سرحدوں کی گارنٹی کا اعادہ ہوا۔ اور درپردہ اسرائیل کو شہہ دی گئی۔ اس کے ٹھیک ایک سال بعد مئی ۶۴ء میں اسرائیل نے دریائے اردن کا رخ موڑنا شروع کر دیا اس کے جواب میں عربوں نے دریا کے بہاؤ کو تبدیل کرنے کا منصوبہ بنانا شروع کر دیا نتیجتاً اسرائیل اور عربوں کے درمیان سرد جنگ تیز ہو گئی جو نومبر ۶۶ء میں مصر اور شام کے درمیان مشترکہ فوجی کمان کے معاہدہ پر شدت اختیار کر گئی۔ اسرائیل نے جارحیت کا ارتکاب کرتے ہوئے ایک اردنی گاؤں ہیردن پر حملہ کر دیا۔ اس کے بعد شمالی سرحدوں پر بھی جھڑپیں

ہونے لگیں۔ مئی ۱۹۶۷ء میں اسرائیل اور شام کے درمیان زبردست جنگ ہوئی اور فضائی تصادم بھی ہوا۔ اسی دوران اسرائیلی وزیر اعظم لیوی اشکول نے کھلے لفظوں میں عام جنگ کی دھمکی دی۔ اس صورت میں ناممکن تھا کہ متحدہ عرب جمہوریہ کے رہنما خاموش رہتے۔ اور یہودیوں کو شام پر حملہ کرنے اور وہاں کی حکومت کا تختہ الٹنے کا موقع دیتے۔ صدر ناصر نے جوابی کارروائی کے لئے فوری قدم اٹھایا۔ انہوں نے سب سے پہلے اقوام متحدہ کی فوج کو واپس بلانے کا مطالبہ کیا۔ یہ فوج صرف مصری علاقہ میں مقیم تھی۔ یہودیوں نے اسے اپنے علاقے میں قدم رکھنے کی بھی اجازت نہ دی تھی۔ اقوام متحدہ کی فوج نے چوکیاں خالی کر دیں۔ تو مصری افواج نے ساری سرحد پر مورچے سنبھال لیے اور خلیج عقبہ کی ناکہ بندی بحال کر دی۔ یعنی وہی صورت ہو گئی جو ۱۹۵۶ء سے پہلے تھی۔ امریکیوں اور انگریزوں نے یہ نظر انداز کر کے اس فیصلے پر احتجاج کیا کہ ۱۹۵۶ء سے پہلے یہودیوں کے لیے خلیج عقبہ کا استعمال ممنوع تھا۔ اور اس وقت امریکہ اور انگلستان نے بھی ناکہ بندی کو جائز تسلیم کر رکھا تھا۔ نیز یہ کہ امریکہ اور برطانیہ نے جب بھی ضرورت محسوس کی "آزاد جہاز رانی" کے آداب فراموش کر کے بحری راستے بند کر دیئے۔ کیوبا کی ناکہ بندی حال ہی کی بات ہے۔ حالانکہ امریکہ اور کیوبا تو برسر جنگ تھے البتہ ان کے درمیان جنگ کی سی کیفیت تھی جبکہ عربوں اور اسرائیل کے درمیان تو ہمیشہ سے جنگ کی سی کیفیت قائم رہی ہے۔

یہ مختصر سا پس منظر اس لئے پیش کیا گیا ہے کہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ یہودی حکمران ہمیشہ جارحانہ کارروائی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ان کی نام نہاد مملکت کی بنیاد ہی جارحیت اور غصب پر رکھی گئی ہے اور وہ جارحانہ کردار سے کبھی دستبردار نہیں ہوئے اور دوسری اہم بات جس کی وضاحت کے لئے یہ پس منظر بیان کیا گیا ہے یہ ہے کہ یہودیوں نے حالات کو ساز گار پا کر ہی جنگ چھیڑی ہے۔ وہ ہمیشہ اس وقت حملہ شروع کرتے ہیں جب انہیں یقین ہوتا ہے کہ عرب کمزور ہیں اور ان پر غلبہ پایا جا سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب تک ہمیشہ جنگ کا میدان بھی یہودیوں نے منتخب کیا اور وقت بھی!

بہر حال امریکہ و برطانیہ کی شہ پر ۵ جون کی صبح اسرائیل نے پھر جارحیت کا ارتکاب کیا اور بیک وقت شام، مصر اور اردن پر فضائی حملے کئے۔ اس سے صرف دو تین روز قبل اردن بھی شام اور مصر کے مشترکہ فوجی معاہدہ میں شریک ہو چکا تھا۔ اسرائیل کا یہ حملہ نہ صرف بین الاقوامی آداب کے خلاف بلکہ روس اور امریکہ کی اس یقین دہانی کے بھی خلاف تھا کہ اسرائیل جنگ میں پہل نہیں کرے گا۔ اسرائیل کا یہ حملہ صرف چند ہفتوں کی صورت حال کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ سالہا سال کی تیاری

اور سامراجی سازشوں کا حاصل تھا۔ اسرائیل کو اس کی ہمت نہ ہوتی۔ اگر سامراجی ممالک بالخصوص امریکہ برطانیہ وغیرہ اس کی پشت پناہی نہ کرتے۔

صرف امریکہ نے اسرائیل کو ایک ارب ساٹھ کروڑ ڈالر دیئے۔ یہ ساری رقم اسرائیل کی فوج کو مسلح کرنے اور اس کو طاقتور بنانے کے لئے استعمال کی گئی۔ امریکہ برطانیہ اور مغربی جرمنی نے اسرائیل کو جدید اسلحہ سے لیس کیا۔ مختصر یہ کہ ان ممالک نے اسرائیل کو طاقتور بنانے کیلئے پانی کی طرح روپیہ بہایا اور جب اسرائیل نے مصر اور شام پر حملہ کیا تو اسوقت اسکے پاس ڈھائی لاکھ فوج تھی گویا ملک کی دس فیصد آبادی مسلح افواج میں بھرتی کی گئی، ہوائی فوج میں ۸ ہزار اور بحریہ میں تین ہزار سپاہی تھے۔ اسرائیل کے ۲۳ بریگیڈ تھے ان کی ایک تہائی تعداد بکتر بند یونٹوں پر مشتمل تھی۔ باقی پیادہ فوج تھی۔ ایک ہزار توپیں اور آٹھ سو سے زیادہ ٹینک تھے۔ بھاری اور اوسط درجے کے ٹینک زیادہ تعداد میں تھے۔ ان میں امریکہ کے "پیٹن" اور "شرمن" ٹینک اور برطانیہ کے "سنچورین" ٹینک شامل تھے۔ فضائیہ میں پانچ سو سے زیادہ ہوائی جہاز تھے جن میں زیادہ بمبار اور لڑاکا بمبار تھے۔ علاوہ ازیں اسرائیلی فوج نے سڑکوں اور ہوائی اڈوں کا جال بچھا رکھا تھا۔ اور عرب ممالک سے جو سرحد ملتی تھی اس کی قلعہ بندی کر دی گئی تھی اس طرح میدان جنگ پوری طرح تیار کیا گیا۔ انتہا پسندوں نے نظریاتی طور پر بھی آبادی کے ذہنوں کو بھی متاثر کرنے کی سر توڑ کوشش کی ان میں عربوں کے خلاف نفرت پیدا کی گئی۔ اور یہ پراپیگنڈہ کیا گیا کہ یہودی بہ نسبت دوسری قوموں کے افضل و اعلیٰ ہیں۔ حربی فرائض کی انجام دہی میں بمبار ہوائی جہازوں کو بنیادی کام سونپا گیا تھا۔ دوسرا اہم کام ٹینک دستوں کو دیا گیا۔ چونکہ ریگستانی علاقہ ٹینکوں کے لئے ناقابل گذر ہوتا ہے اس لئے بکتر بند یونٹوں نے سڑکوں کی راہ اختیار کی اور چار پانچ روزہ جنگ میں سب کچھ تہس نہس کر کے رکھ دیا۔

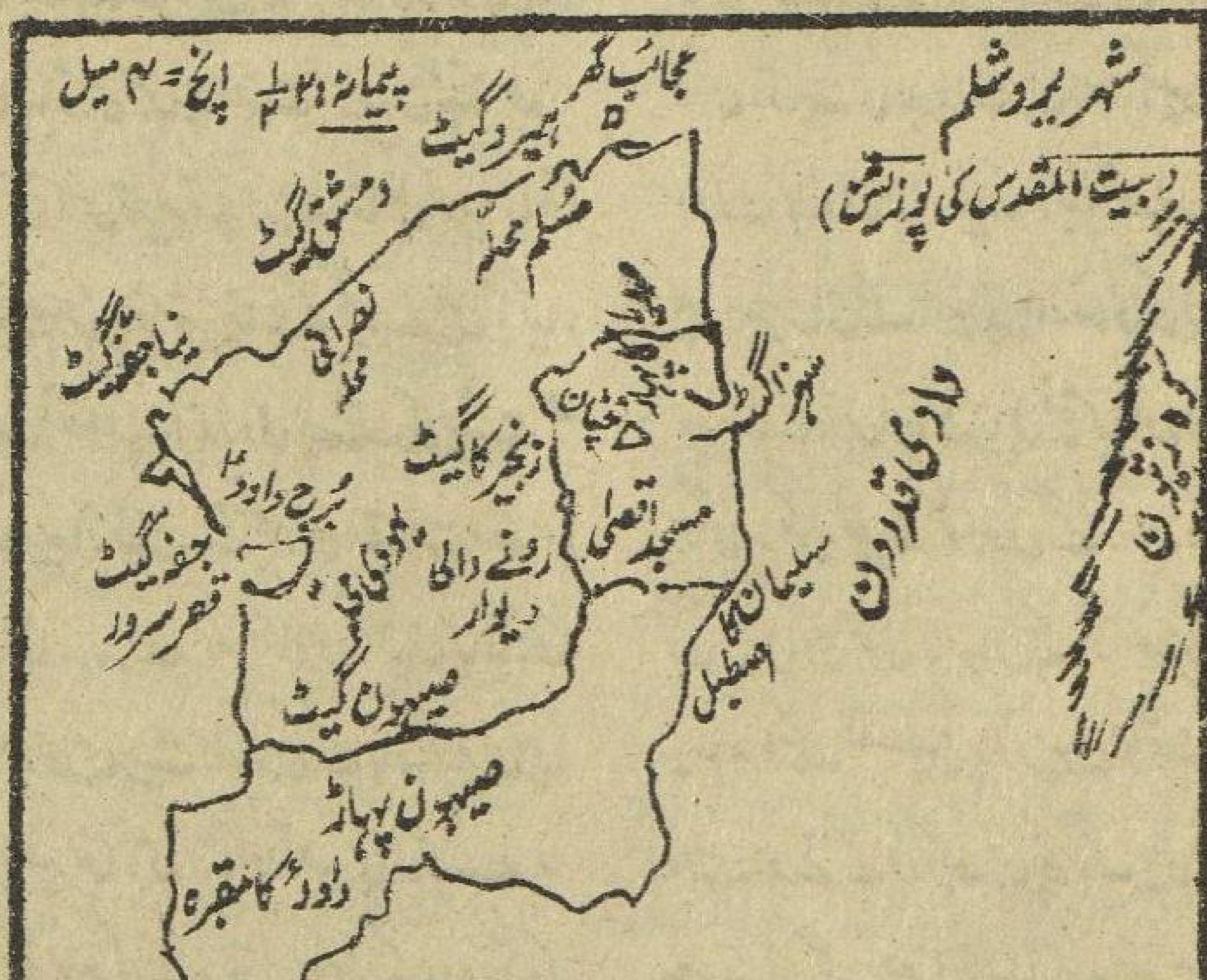
"برق آسا" جنگ کی حکمت عملی

جنگ کے متعلق اسرائیل کے علم و فن میں "برق آسا" حملہ کے نظریہ کو بنیادی مقام حاصل ہے۔ یہ نظریہ ہٹلری افواج سے لیا گیا ہے۔ اسرائیل کی جنگی چال یہ رہی کہ عرب ملکوں کی سرحدوں پر فوجی اشتعال انگیزیاں کی جائیں اور پھر اچانک حملہ کر دیا جائے اس اقدام کو حق بجانب قرار دینے کی قبل از وقت پیش بندی کرنے کی غرض سے عالمی رائے عامہ کو یہ باور کرایا گیا کہ عرب ملکوں کی جانب سے جارحانہ حملہ کئے جانے کا خطرہ ہے۔

مولانا عبدالباری ایم۔ اے

فلسطین اور صیہونیت

آج جبکہ دنیا کی نظریں فلسطین کی طرف اٹھ گئی ہیں اور اسرائیلی جارحیت کے ساتھ ساتھ 'صیہونیت' (Zionism) اور صیہونی (Zionist) الفاظ بار بار اخبارات میں آرہے ہیں۔ اسرائیلی جارحیت کے اصل اسباب و محرکات کو سمجھنے کے لئے تاریخ و پرانے رسالوں اور اخباروں کے کالموں کا مطالعہ اور 'صیہونیت' کا مفہوم اچھی طرح ذہن نشین کر لینا نہایت ہی ضروری ہے۔ اس مطالعہ کے بعد ہی وہ لوگ جو اس جارحیت کا نشانہ رہے ہیں کوئی صحیح قدم اٹھا سکیں گے اور اسرائیلی جارحیت کی نوعیت بھی متعین ہو سکے گی۔



قدیم یروشلم اور فلسطین پر ایک نظر

'صیہونیت' اور صیہونی 'کا تعلق صیہون (Zion) سے ہے جو یروشلم کا ایک پہاڑ ہے۔ یروشلم کا شہر دو متوازی پہاڑوں اور ان کے مابین

وادی پر بسا تھا ۔ مشرقی پہاڑ موریا ہے ۔ جس پر بیت المقدس تھا ۔ مغربی پہاڑ صیہون تھا جو دونوں میں زیادہ بلند ہے ۔ ہیرود (HEROD) کے زمانہ میں تین دیواریں تھیں ۔ ہر دیوار ایک خاص حصہ شہر کو گھیرے ہوئے تھی ۔ شہر مختلف حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا ۔ شہر پناہ کے متعدد پھاٹکوں میں سے ایک صیہون پھاٹک بھی تھا ۔ ہیڈریان (HADRIAN) کے عہد سے لے کر یوڈوسیا کے عہد تک صیہون پھاٹک شہر قدس کا جنوبی پھاٹک سمجھا جاتا تھا ۔ پہلی قدیم آبادی صیہون پر ہی تھی ۔ موریا کا پہاڑ بھی جس پر حضرت سلیمان ؑ نے مسجد اقصیٰ قائم کی تھی اس قدیم آبادی میں شامل کر لیا گیا تھا اور جب سے صیہون پہاڑ شہر پناہ کے گھیرے میں آ گیا ۔ یہ پرانا پھاٹک فقط ایک اندرونی پھاٹک کی حیثیت سے رہ گیا ۔ صیہون پہاڑ قدس کے خصوصی مقاماتِ مقدسہ میں سے ایک تھا ۔ اور اسے "ام الکنائس" خیال کیا جاتا تھا نویں صدی عیسوی میں بیت المقدس کے بعد گرجوں میں اس کا دوسرا نمبر تھا ۔ قدرتاً اور تعمیری لحاظ سے یہ ایک ناقابلِ تسخیر قلعہ کی مانند تھا ۔ لیکن ایک دور آیا کہ اس کی ساری عظمت خاک میں مل گئی ۔ صیہون پہاڑ پر ہی حضرت داؤد ؑ کی قبر ہے ۔

بنی اسرائیل کی سرگزشت

موسیٰ ؑ کے ذریعے مصر کی غلامی سے آزاد ہوتے کے بعد بنی اسرائیل نے آہستہ آہستہ فلسطین کے پورے علاقہ کو فتح کر لیا اور تقریباً ۴۰۰ سال کی مدت تک غیر منظم رہ کر ایک متحدہ سلطنت کی بنیاد ڈالی جس کے پہلے بادشاہ طالوت ہوئے ۔ اور ان کے بعد حضرت داؤد ؑ اور حضرت سلیمان ؑ ۔ حضرت سلیمان ؑ کی وفات کے بعد بنی اسرائیل کی متحدہ سلطنت دو حصوں میں منقسم ہو گئی ۔ شمال میں اسرائیلی سلطنت تھی جس کے باشندوں کا نام بنی اسرائیل باقی رہا ۔ اور جنوب میں "سلطنتِ یہود" قائم ہوئی یہاں والے یہودی کہلانے لگے ۔ شمالی سلطنت کا پایۂ تخت سکّم کے قریب سامریہ مقرر ہوا ۔ جنوبی سلطنت کا دارالحکومت قدس ہوا ۔ دونوں میں شدید رقابت تھی ۔ اس رقابت کی بدولت بنی اسرائیلیوں اور یہودیوں دونوں کا زوال ہوا ۔ ایک مرتبہ اشوریوں کے ہاتھوں بابل میں ستر سال تک اسیری اور غلامی کی زندگی گذارتے رہے پھر شہنشاہ ایران نے بابل فتح کیا اور ان کی جلاوطنی ختم ہو گئی ۔ مگر یہ پھر خدا کو بھول گئے ۔ اور رومیوں کے ہاتھوں ان کی بربادی ہوئی ۔ یہاں تک کہ آنحضرت صلعم کے بعد ۶۳۷ء تک فلسطین پر رومیوں کا قبضہ رہا ۔ وطن واپس ہونے کے فوراً بعد ہی کچھ لوگ اپنی قسمت آزمائی کیلئے باہر جانے لگے ۔ مغربی ایشیا کے ہر حصہ میں بحیرہ روم کے اردگرد جہاں یونانیوں کی نوآبادیاں پھیلی ہوئی تھیں یہودی بھی پہنچ گئے ۔ اور پھیلتے پھیلتے اٹلانٹک کے ساحل تک پہنچ گئے ۔ حضرت محمد ؐ کی پیدائش سے قبل بنی اسرائیل کافی تعداد میں عرب میں بھی آکر آباد ہو گئے تھے ۔ مدینہ میں یہودیوں کی کثیر تعداد تھی ۔ خیبر میں تو انھیں اچھا خاصا اقتدار حاصل تھا ۔ مدینہ اور اردگرد کی بستیوں میں نوآباد یہودی کے قبیلے بنو نضیر، بنو قریظہ اور بنو قینقاع تھے فلسطین

چھوڑ کر عرب کے ریگستانی علاقے میں آنے کی جہاں ایک غرض تجارتی تھی وہاں ایک غرض یہ بھی تھی کہ وہ اپنی آسمانی کتابوں میں پیشین گوئیاں پاتے تھے کہ نبی آخر الزماں مبعوث ہو کر یہود کو آزاد کرائیں گے۔ لیکن یہودیوں کا رویہ حضرت محمدؐ کے ساتھ اس قدر خراب رہا کہ بالآخر یہودیوں کو مدینہ چھوڑنا ہی پڑا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ ۶۳۷ء میں فلسطین میں اسلامی حکومت قائم ہوگئی۔ یہودی اور عیسائی دونوں اس حکومت سے خوش تھے یہانتک ۱۰۹۵ء میں بعض شرارت پسندوں نے متعصب عیسائی حکومتوں کو فلسطین پر حملہ کے لئے آمادہ کیا اور صلیبی جنگیں شروع ہوگئیں۔

فلسطین کی طرف کس طرح رخ موڑا گیا۔

بیت المقدس یورپ کے زائرین کا مرجع تھا۔ عیسائی اور یہودی دور نزدیک سے ہر سال لاکھوں کی تعداد میں آتے اور امن و امان کے ساتھ مقامات مقدسہ کی زیارت کرتے، قربانیاں دیتے اور لوٹ جاتے گیارھویں صدی عیسوی میں بیت المقدس پر ایک ترکی خاندان کی حکومت آئی۔ اس دور میں اتفاق سے زائرین کے چند قافلے لٹ گئے۔ یورپ نے اس کو شاخسانہ بنا کر ہر طرف دشمنی اور مخالفت کی آگ لگا دی۔ اور مارچ ۱۰۹۵ء میں پاپائے روم نے ایک فتویٰ صادر کر کے کہا کہ سرزمین فلسطین کو "ناپاک" مسلمانوں کے ہاتھ سے چھین لینا مسیحی دنیا پر فرض ہے۔ اور جو مسیحی اس فرض مقدس کو ادا کرے گا دربار مسیح میں اس سے کسی جرم و گناہ کا مواخذہ نہ ہوگا۔ اور پھر خود اس جہاد میں فتح و نصرت کے بعد ملک کے انجیر و زیتون اور انگوری شراب ان کے لیے عام ہوگی۔ لوٹ کا مال اس کے سوا ہوگا۔" چنانچہ اس فتویٰ کے بعد باقاعدہ صلیبی معرکے بڑے زور شور سے شروع ہوگئے۔ اور ۱۰۹۸ء میں بیت المقدس پر صلیبیوں کا قبضہ ہوگیا۔ ساری دنیا کے مسلمانوں نے جوش کا مظاہرہ کیا اور اپنی جانیں دینے کے لئے نکلتے رہے۔ یہاں تک کہ صلاح الدین ایوبیؒ نے ۱۱۸۷ء میں پھر اس پر قبضہ کر لیا۔ ۱۵۱۶ء میں عثمانی ترکوں نے اقتدار حاصل کیا۔ ۱۸۳۰ء سے ۱۸۴۰ء تک مصری قبضہ رہا۔ اس کے بعد پھر سے ترکی اقتدار قائم ہوگیا اس دوران میں سرعت کے ساتھ عیسائی نوآبادیاں ارض مقدس میں قائم ہونی شروع ہوگئیں۔ فرانسیسی اور روسی خانقاہوں کے علاوہ جرمن گرجے بھی تعمیر ہونے لگے۔ اس دوران میں یہودی بھی آکر بسنے شروع ہوگئے۔ جن کی تعداد صرف ایک پادری ڈبلرایم ٹامس کی عینی شہادت کے مطابق (ان کی کتاب دی لینڈ اینڈ دی بک میں) ۵۰۰۰ دمشق میں ۷۰۰۰ دیروشلم میں تھی ۲۵۰۰ حلب میں ۴۰۰۰ - سفیہ میں ۲۰۰۰ - جبول میں ۶۰۰ طبریا میں ۱۵۰۰ - بیروت اور صیدا وغیرہ میں ۵,۹۰۰ جبکہ مسلمانوں کی بڑی اکثریت تھی۔

بابل کی اسیری کے زمانہ میں قدرتی طور پر وطن کی یاد آتی تو یہودی دریاؤں کے کنارے بیٹھ کر صیہون کو یاد کرتے اور روتے تھے۔ اسیری کے بعد واپسی پر دوسرے قافلہ میں مجدّد عزرا یہودی بھی قدس آئے (۴۵۸ ق م)

جنہوں نے عہد نامہ عتیق کی آخری ترتیب دی - اس وقت جس قسم کے جذبات ان کے دل میں موجزن تھے ان کا اثر زبور میں حضرت داؤد کے نغموں سے ظاہر ہے مثلاً "اے خدا! تیرے احکام کے سبب سے کوہ صیہون شادمان ہو۔ یہوداہ کی بیٹیاں خوشی منائیں۔ صیہون کے گرد پھر و اور اس کا طواف کرو اس کے برجوں کو گنو۔ اس کی شہر پناہ کو خوب دیکھ لو۔ اس کے محلّوں پہ غور کرو تا کہ تم آنے والی نسل کو اس کی خبر دے سکو۔ یہی خدا ابدالآباد ہمارا خدا ہے یہی موت تک ہمارا ہادی رہے گا۔" زبور - ۴۸)

عرصۂ دراز سے ہیکل سلیمانی کی بربادی پر تمام طرف سے یہودی آ آ کر پتھروں کی ایک دیوار پر اس طرح ڈھیر بڑھ کر روتے تھے کہ :-

"اے خداوند! تیرے مقدس شہر برباد ہو گئے صیہون ویران ہو گیا اور یروشلم بھی۔ ہمارا مقدس اور حسین عبادت خانہ جہاں ہمارے بزرگ تیری حمد گایا کرتے تھے۔ جل کر خاک ہو گیا۔ اور ہماری تمام پسندیدہ چیزیں بھی برباد ہو گئیں۔" اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ پھر سے قبضہ دلائے تاکہ دوبارہ ہیکل تعمیر کریں۔

لیکن واضح رہے کہ یہودیوں نے جب خدا سے نافرمانی کی اور موسیٰؑ کے بتائے ہوئے راستہ سے منہ موڑ لیا تب ہی تو خدا کی طرف سے انہیں یہ سزا ملی کہ وہ بے وطنی کی زندگی گذارنے لگے۔ شاید اسی جذبہ کے تحت مذکورہ بالا پادری ٹامسن نے یہ بھی لکھا ہے کہ :-

"مختلف ملکوں سے آنے والوں میں بہت سے ایسے گناہ کرنے والے مجرم ہیں جنہیں خدا نے ان کے کرتوت کی بدولت ان ملکوں میں پھینک دیا تھا۔ اور اب وہ تطہیر کی غرض سے آئے ہیں اور آرزومند ہیں کہ پرہیزگاری کی زندگی میں گناہ دھل جائیں۔ بعدہٗ وفات پا کر اس مقدس شہر کے قریب ترین حصہ میں مدفون ہوں۔"

مسلمانوں کا بیت المقدس پر اپنے زیادہ حق ہے کہ جو مقدس آثار حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ (پیغمبرانِ بنی اسرائیل) سے تعلق رکھنے کی وجہ سے یہودیوں کو محبوب ہیں، مسلمانوں کو بھی مشترکہ طور پر محبوب ہیں۔ کیوں کہ وہ ان دونوں کو بھی حضرت محمدؐ کی طرح نبی مانتے ہیں - جبکہ یہودی یا عیسائی حضرت محمدؐ کو نبی اور رسول خدا تصور نہیں کرتے۔ اور ان مشترکہ آثار کے علاوہ مسلمانوں کے لیے مخصوص یادگاریں ہیں، مسجد اقصیٰ (قبلۂ اوّل) حرم شریف اور الصاف کی چٹان - اس آخری یادگار پر یہودیوں کا اعتقاد بھی ہے کہ اللہ اس چٹان سے انصاف کرے گا۔

صیہونی تحریک کی ابتدا

یہودی تمام دنیا پھیلے ہوئے تھے۔ لیکن کسی ملک میں ان کی اکثریت نہ تھی۔ کہیں انہیں قومیت کے حقوق حاصل نہ تھے۔ جس کے باعث وہ کسی ملک کی قومی اور انقلابی تحریک میں عملاً حصہ نہ لے سکتے تھے۔ لہٰذا خفیہ تحریکیں چلانا یا پس پردہ سازشیں کرنا ان کی عادت ثانیہ بن چکی تھی۔ یہ تھا صیہونی تحریک کا سبب - اور صیہونی سے مراد وہ تمام یہودی ہیں جو صیہون کی طرف

رخ کرکے فلسطین کی قومی حکومت کے خواہاں اور اس مقصد کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام یہودی صیہونی نہیں ہیں۔ بلکہ بہت سے ایسے یہودی فرقے بھی ہیں جنہوں نے پُرجوش صیہونیوں کی ناروا ارادوں کو کبھی نہیں سراہا۔ خود ساختہ ریاست اسرائیل میں بھی یہودیوں کا ایک ایسا مذہبی فرقہ موجود ہے جو صیہونیوں کی موجودہ اسرائیل اسٹیٹ کے قیام کے خلاف ہے! یہ اسٹیٹ خود یہودیوں کے اصل دین موسوی پر قائم نہیں ہے۔ بلکہ یہودیوں کو یہودی مذہب سے اس لیے محبت ہے کہ یہ ان کی نسل کا مذہب ہے اور یہی نسلی اسپرٹ دراصل انہیں متحد کیے ہوئے ہے۔ متذکرہ بالا قدیم تاریخ میں جب ان کی متحدہ سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی تو آخر میں جو ریاست برباد ہوئی اس کا نام 'یہودا' تھا۔ جس کا دارالخلافہ یروشلم تھا۔ (اسی اسٹیٹ کے نام پر وہاں کے باشندے یہودی کہلاتے ہیں) لیکن چونکہ قرآن میں انہیں بنی اسرائیل کے نام سے یاد کیا گیا ہے اس لیے خود ساختہ نئی اسٹیٹ کے قیام پر ان لوگوں نے 'اسرائیل اسٹیٹ' کا نام رکھ لیا ہے۔

فلسطین پر دینی غلبہ نہیں بلکہ سیاسی غلبہ کی خواہش ابتدا ہی سے ان کے اندر رہی ہے۔ چنانچہ کئی اشخاص نے مسیح ہونے کا دعویٰ کیا جن کا مقصد بعث اسی آرزو کا حصول تھا۔ مثلاً رومتہ الکبریٰ میں بارکوچیبہ (۱۱۵ء تا ۱۱۸ء) قرنطیس کا موسیٰ یہودی (چوتھی صدی عیسوی) سیرن نامی یہودی (آٹھویں صدی عیسوی) ابو عیسیٰ یہودی (ایران میں) داؤد (۱۱۶۰ء) ملنا مسیح بن اسرائیل (۱۶۰۴ء تا ۱۶۵۷ء) نے انگلینڈ میں اس دعوے سے یہود کو اپنے ساتھ ملایا

• مغربی ممالک سے یہود کا اخراج

حالانکہ ہر جگہ یہود اقلیت میں تھے (فرانس میں صرف ۱۴ فی صدی۔ اٹلی میں ۱۲ فی صدی اور جرمنی میں ۲۳ فی صدی) لیکن علم و فضل کے اعتبار سے ان میں بڑی بڑی شخصیتیں پیدا ہو کر ان ممالک پر چھا گئیں اور ان کے اس بڑھتے ہوئے اقتدار کو مغربی ممالک برداشت نہ کر سکے۔ اس کے علاوہ خود مسیح پر یہود کے مظالم کی یاد ہمیشہ ان کے واسطے نفرت و حقارت کا موجب بنتی

جرمنی میں یہود کے دو سیاست داں (لاسگر اور بامبرگر) نے سیاسی حیثیت سے پرنس بسمارک کی سخت مخالفت کی۔ چنانچہ پرنس بسمارک 'سامی دشمنی' کے نام پر یہودیوں کا بدترین مخالف ہوگیا۔ اور جرمنی میں یہود دشمنی روز بروز بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ ہٹلر نے جرمنی سے یہود کو انتہائی ذلت کے ساتھ ملک بدر کر دیا۔ ان کے سرمایے بھی ضبط کر لیے اور شہری حقوق چھین لیے۔

روس میں زار الیگزانڈر دوم کے قتل کے بعد یہود کے خلاف جذبۂ نفرت بہت شدید ہوگیا۔ چنانچہ ۱۸۸۱ء میں ایسٹر کے موقعہ پر کھیرسن میں یہ افواہ اُڑ گئی کہ یہودی اس تہوار کے موقع پر عیسائیوں کے خون سے آٹا گوندھتے ہیں۔ چنانچہ اس پر شدید بلوہ ہوا اور پوری یہود آبادی کو تباہ و برباد کر ڈالا گیا۔ کیونکہ

مقام پر دو ہزار یہودی خانماں برباد کر دیئے گئے۔ اور چند ہی ہفتوں بعد تمام مغربی روس یہود کے وجود سے پاک کر دیا گیا۔ ان کے مکانات مسمار کر دیئے گئے سر بازار ان کی خواتین کی بے حرمتی کی گئی۔ ستر ہزار یہودی بمشکل جان بچا کر روس کی سرحد سے پار ہو سکے۔ اس کا معاشی اثر روس پر بے حد خطرناک ہوا۔ کاروبار بند ہو گئے۔ بینکوں کا کاروبار معطل ہو کر رہ گیا تھا۔ اور گرانی حد سے بڑھ گئی بمشکل ۱۸۹۵ء میں یہود دشمنی ٹھنڈی پڑی تھی کہ ۱۹۰۳ء میں پھر ہنگامے شروع ہو گئے۔

رومانیہ میں یہود حالانکہ صدیوں سے آباد تھے مگر انہیں شہریت کے حقوق ہرگز عطا نہیں تھے، بلکہ ان پر قتل وغارت گری کے ہنگامے برپا ہوئے اور ۱۹۰۲ء میں انہیں اس ملک کو خیرباد کہنا پڑا۔

برطانیہ میں اٹھارویں صدی میں انگلستان کے پادریوں نے کانفرنس میں طے کیا کہ یہود ایک خاص قسم کا لباس پہنیں تاکہ ان کی شناخت ہو سکے۔ جس کا مقصد ان کی تذلیل اور اپنے عوام کو ان کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ کر لینا تھا۔ پھر بھی جب یہودی اپنی سازشوں سے باز نہ آئے تو ان کی رہائش کے لیے چند محلے مخصوص کر دیئے گئے اور ان کے گرد لوہے کی جالی لگا دی گئی۔ رات کے وقت ان کے دروازوں کو مقفل کر دیا جاتا تھا کہ ایڈورڈ اول نے تو یہودی زعماء کو انگلینڈ سے اخراج ہی کا حکم دے دیا تھا۔

امریکہ کے صدر بنجامن فرینکلن نے ۱۷۸۹ء میں اپنی مشہور تقریر میں   اسرائیلی تعلقات و روابط اور ان کے خطرے سے امریکہ کی پبلک کو ہوشیار و متنبہ کر دیا تھا۔

صیہونی تحریک کا منظم آغاز

سترہویں صدی عیسوی کے اخیر میں منظم آغاز ہو چکا تھا جس کا پہلا ہیڈ کوارٹر وی آنا میں تھا عرصۂ دراز تک یہودی متعدد طریقوں سے اپنے مقصد کے حصول کی کوشش کرتے رہے۔ مثلاً انگلینڈ میں لارڈ رابھتس چائلڈ نے فلسطین میں یہود کے داخلہ اور قیام کی کوششوں میں بے انتہا دولت صرف کی۔ لارڈ بکنیس فیلڈ، لارڈ سیلسبری اور مسٹر لارنس اول فلینٹ نے برطانیہ میں اس امر کی کوشش کی کہ ترکی حکومت یہود کو آزادی کا چارٹر دے دے۔

۱۸۵۴ء میں لندن کے ایک یہودی نے ایک کمپنی اسی مقصد کے لئے قائم کی۔ ۱۸۷۶ء میں جارج ایلیٹ نے "دانیال دیروندا" نامی کتاب شائع کرائی اور "ریچول سائن" نامی ایک سوسائٹی قائم کی جس کا مقصد بظاہر ارض مقدس میں زراعتی نوآبادیوں کا قیام ہی تھا۔ مسٹر کرنالیٹ نے تجویز پیش کی کہ یہودی سرمایہ سے وادیٔ فرات میں ریلوے لائن نکالی جائے۔ بیرن دی ترش نے نوآبادیوں کی تحریک شروع کی اور اس مقصد کے لیے اپنی جیب خاص سے نوے لاکھ پونڈ کا عطیہ دیا۔ ان کوششوں کے اور

متعدد ایسی تحریکیں شروع کی گئیں جن کا مقصد دوسرے ممالک میں یہودی خود مختار ریاست قائم کرنا تھا، ظاہر ہے کہ جب دوسرے ممالک اسے نہ برداشت کریں گے تو وہ خود صیہونی تحریک کا ساتھ دیں گے۔ حصول مقصد کے لیے کئی ادارے، مجالس، بینک اور امدادی محکمے کھولے گئے۔

۱۸۹۶ء میں وائنا کے ایک یہودی صحافی ڈاکٹر تھیوڈور ہرزل نے ریاست "یہود" کے نام سے ایک رسالہ شائع کر کے صیہونی تحریک کے لئے قومی وطن کا ایک ٹھوس تصور یہود کے سامنے پیش کیا۔ اس میں تحریک کے دو مقاصد تھے۔ ایک یہ کہ یہودی ایک علاقہ میں جمع ہو جائیں اور بہتر ہو کہ ان کا یہ قومی وطن فلسطین کی ارض مقدس ہو۔ دوسرے یہ کہ دیگر ممالک ان کی خود مختاری کو تسلیم کر لیں۔

اس صحافی نے اپنی پوری زندگی ان مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے وقف کر دی۔ لارڈ راتھس چائلڈ نے (جو انگلینڈ میں انگلو یہودی کمیونٹی کا سرغنہ تھا اور دولت کی طاقت سمجھا جاتا تھا) اس صحافی کی دل کھول کر سخنے، درمے، قدمے مدد کی۔ اور برطانوی حکومت کو بھی اس تحریک کی امداد پر ابھارا۔ ڈاکٹر تھیوڈور ہرزل نے ترکی کے مشہور فرمانروا سلطان عبدالحمید سے اس سلسلہ میں کئی بار ملاقاتیں کیں تاکہ عثمانی حکومت فلسطین میں یہود کے قومی وطن کی تجویز کو تسلیم کر کے انہیں کچھ مراعات دیدے مگر اسے اس مقصد میں ناکامی رہی

۲۷ اگست ۱۸۹۷ء میں سوئٹزرلینڈ کے شہر بیسل میں یہودی کانگرس کا پہلا اجلاس ہوا جس میں مختلف ممالک کے یہود نے شرکت کی۔ بالآخر قرار پایا کہ یہ کانگرس فلسطین کو یہود کا قومی وطن بنانا چاہتی ہے اس مقصد کے لیے جو ابتدائی تحریک "انجمن محبین صیہون" کے نام سے شروع کی گئی تھی۔ اسے منظم کر لیا گیا۔ اور اب باقاعدہ فلسطین میں ہجرت کی تحریک شروع ہو گئی سب سے پہلے روس کے کچھ یہودی ترک وطن کر کے فلسطین گئے۔ مگر ہجرت یہود کی یہ پہلی تحریک کچھ بھی کامیاب نہ ہو سکی۔

۱۹۰۲ء میں ڈاکٹر تھیوڈور ہرزل کا انتقال ہو گیا۔ مگر اپنی موت سے قبل وہ 'یہودی نو آبادی بینک' اور 'یہودی بیت المال' کے قیام میں کامیاب ہو گیا تھا اس کے مرنے کے بعد ۱۹۰۴ء میں ہیڈ کوارٹر منتقل ہو کر کولون چلا گیا۔ اور ۱۹۰۴ء میں اس تحریک کا ایک دفتر فلسطین کی بندرگاہ جفہ میں کھول دیا گیا۔ ۱۹۱۱ء میں ہیڈ کوارٹر برلن منتقل ہوا۔ اور جنگ عظیم اوّل کے بعد لندن منتقل ہو گیا۔

تحریک صیہونیت کے صدر ڈاکٹر ہیم ویزمن تھے۔ (جو بعد میں خود ساختہ ریاست اسرائیل کے صدر اعلیٰ مقرر ہوئے۔) ان دنوں ڈاکٹر ویزمن مانچسٹر یونیورسٹی میں کیمسٹری کے لکچرر تھے۔ اتفاق سے برطانوی مدبر آرتھر جیمس بالفور کا حلقۂ انتخاب اس یونیورسٹی کا تھا۔ ڈاکٹر ویزمن نے بالفور سے تعاون کر کے سازباز کر لی۔ دوسرا موقعہ یوں پیدا

ہوا کہ جنگِ عظیم میں ایک بارودی مادہ کو مصنوعی طور پر تیار کر کے ڈاکٹر ویزمن نے برطانیہ کی ایک بڑی پریشانی دور کر دی۔ جس کا برطانوی حکومت مالی صورت میں معاوضہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ لیکن ڈاکٹر ویزمن نے نقدی لینے سے انکار کر دیا۔ تیسرا موقعہ یہ حاصل ہوا کہ ان دنوں برطانیہ کا وزیر نوآبادیات ایک یہودی النسل مسٹر ایڈون مانٹیگ تھا جس سے باآسانی رابطہ قائم کیا جا سکا۔ غرضیکہ ان حالات سے ڈاکٹر ویزمن اور ان کے ساتھیوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اور لارڈ راتھس چائلڈ نے بھی تعاون کیا یہاں تک کہ یہ لوگ نومبر ۱۹۱۷ء کو مشہور 'بالفور اعلان' نشر کرانے میں کامیاب ہو گئے۔

'صیہونی تحریک کے اغراض و مقاصد'

ابتداء میں تحریک کے مقاصد کو صیغۂ راز میں رکھنے کی غرض سے ہر ممبر سے تاکیداً حلف بھی لیا گیا۔ مگر یہ راز چھپ نہ سکا۔

- تحریک کے مقاصد حسب ذیل تھے:
- یہود مالی لحاظ سے عالمگیر غلبہ و سطوت حاصل کریں۔
- یورپ کے مختلف ممالک میں کانفرنسیں کر کے یہود میں تعاون و اشتراکِ عمل کا جذبہ پیدا کیا جائے۔
- پبلسٹی و پروپگنڈا کو تیز کیا جائے
- بدامنی، جنگ و جدل اور احتجاجی مظاہرات سے ملکی فضا کو مکدر کیا جائے۔
- حلقۂ اقتدار کے متعلق عوام میں شکوک و شبہات پیدا کیے جائیں۔
- حصولِ مقصد کے لئے مخالف زعماء کو قتل کر دیا جائے۔
- اخلاقی، ثقافتی، اجتماعی اور سیاسی و مالی اعتبار سے دوسری اقوام کو شکست دی جائے۔ ارضِ مقدس کو یہود کا قومی وطن بنانے کی انتہائی کوشش کی جائے۔ اور اس مقصد کے حصول کی خاطر دنیا کی چھوٹی بڑی جماعتوں کو ہموار کرنے کی کوشش کی جائے۔

'تحریک کی وسعت'

مرکزی سوسائٹی کا ممبر بننے کے لئے ہر عاقل بالغ یہودی کو حقدار قرار دیا گیا اور سالانہ چندہ ایک شلنگ مقرر ہوا ۱۹۲۵ء میں اس کے ممبروں کی تعداد ۹ لاکھ تھی۔ اور مختلف ممالک میں اس کی ۶، ۷ شاخیں تھیں ۱۹۵۰ء میں دنیا بھر میں اس کی شاخیں قائم ہو گئیں اور بارہ تیرہ لاکھ کے قریب ممبر بھرتی ہو چکے تھے جو برابر بڑھتے ہی گئے۔

صیہونی تحریک کے مرکزی تصور 'ارضِ مقدس میں یہود کا قومی وطن بنانا' میں جاذبیت، مذہبی داعیہ اور سیاسی دلچسپی کے ذریعہ پیدا کی گئی جس کو دو چیزوں نے بہت تقویت پہنچائی 'یہودی نوآبادی بینک' اور 'یہودی بیت المال'، یہ بنک ڈاکٹر تھیوڈور

ہرزل کی کوششوں سے ۱۹۰۱ء میں قائم ہوا۔ جس کا راس المال تیس لاکھ پونڈ مقرر ہوا۔ پہلے ہی سال میں فوراً چار لاکھ پونڈ کی رقم جمع ہو گئی۔ بیرن دی ہرش (Baron the Hirsch) نے فلسطین میں یہود کی نو آبادی قائم کرنے کے لئے اپنے جیب خاص سے نوے لاکھ پونڈ کا عطیہ دیا تھا۔

یہودی بیت المال کا تمام تر سرمایہ فلسطین میں یہود کی زمین کے خرید و فروخت اور نو آبادیات کی تعمیر کے لیے وقف ہو گیا۔ اراضی کی خرید نہایت منظم طور پر شروع ہوئی ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۶ء کے درمیان نو آبادیات کے مصارف میں ۷۹ لاکھ ۶۸ ہزار پونڈ خرچ کیے گئے۔ اور صرف ۱۹۳۵ء میں فلسطین کے اندر زمین کی خرید پر ایک لاکھ ۱۵ ہزار چار سو پونڈ کی رقم خرچ کی گئی۔ جنگِ عظیم اول سے پیشتر ارضِ مقدس میں وہ صرف ایک لاکھ ایکڑ اراضی کے مالک تھے۔ مگر ۱۹۳۶ء میں ان کے قبضہ میں ایک کروڑ چار لاکھ ۳۲ ہزار ایکڑ زمین آ چکی تھی۔

۱۹۰۸ء میں جفہ میں دفتر کھلتے ہی اس کے پاس ہی پہلی نو آبادی کی بنیاد ۱۹۰۹ء میں رکھی گئی جس کا نام تل ابیب، (بہار کی پہاڑی) رکھا گیا ۱۹۱۴ء میں صرف ۱۸۲ یہودی خاندان آباد تھے۔ ۱۹۲۴ء میں ۱۵ ہزار۔ ۱۹۳۲ء میں ۵۴ ہزار اور ۱۹۴۱ء میں صرف شہر کے بسنے والوں کی تعداد ایک لاکھ ۲۵ ہزار تک پہنچ گئی۔ تعداد بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ یہی تل ابیب شہر موجودہ خود ساختہ ریاست اسرائیل کا دار الخلافہ ہے۔ (جو شہر، بندرگاہ اور ہوائی مستقر سب کچھ ہے۔) اعلیٰ درجے کے کارخانے کاروباری مراکز اور ادبی و سیاسی ادارے موجود ہیں۔ ۱۹۴۲ء ہی میں وہاں ۸ پریس اور ۱۲ رسالے و اخبار نکل رہے تھے۔ اور آج تو کہیں زیادہ ہیں۔

ارضِ مقدس میں یہود کی بڑھتی ہوئی آبادی کی تدریج ملاحظہ ہو:

۱۹۲۲ء کی مردم شماری کے حساب سے ارضِ مقدس کی مجموعی آبادی ۸ لاکھ تھی جس میں مسلمان ۶ لاکھ، عیسائی ۷۳ ہزار اور یہودی ۸۳ ہزار تھے۔

۱۹۳۱ء میں مسلمان ۰۰۰ر۷۶۰، عیسائی ۰۰۰ر۹۰ اور یہودی ۰۰۰ر۱۷۵ ہو گئے۔

۱۹۳۵ء میں یہودیوں کی کل تعداد ۰۰۰ر۳۰۸ تک ہو گئی۔

۱۹۳۷ء میں یہودیوں کی کل تعداد ۰۰۰ر۳۲۵ ہو گئی۔

۱۹۴۴ء میں یہودیوں کی کل تعداد ۷۰۲ر۵۲۸ ہو گئی۔

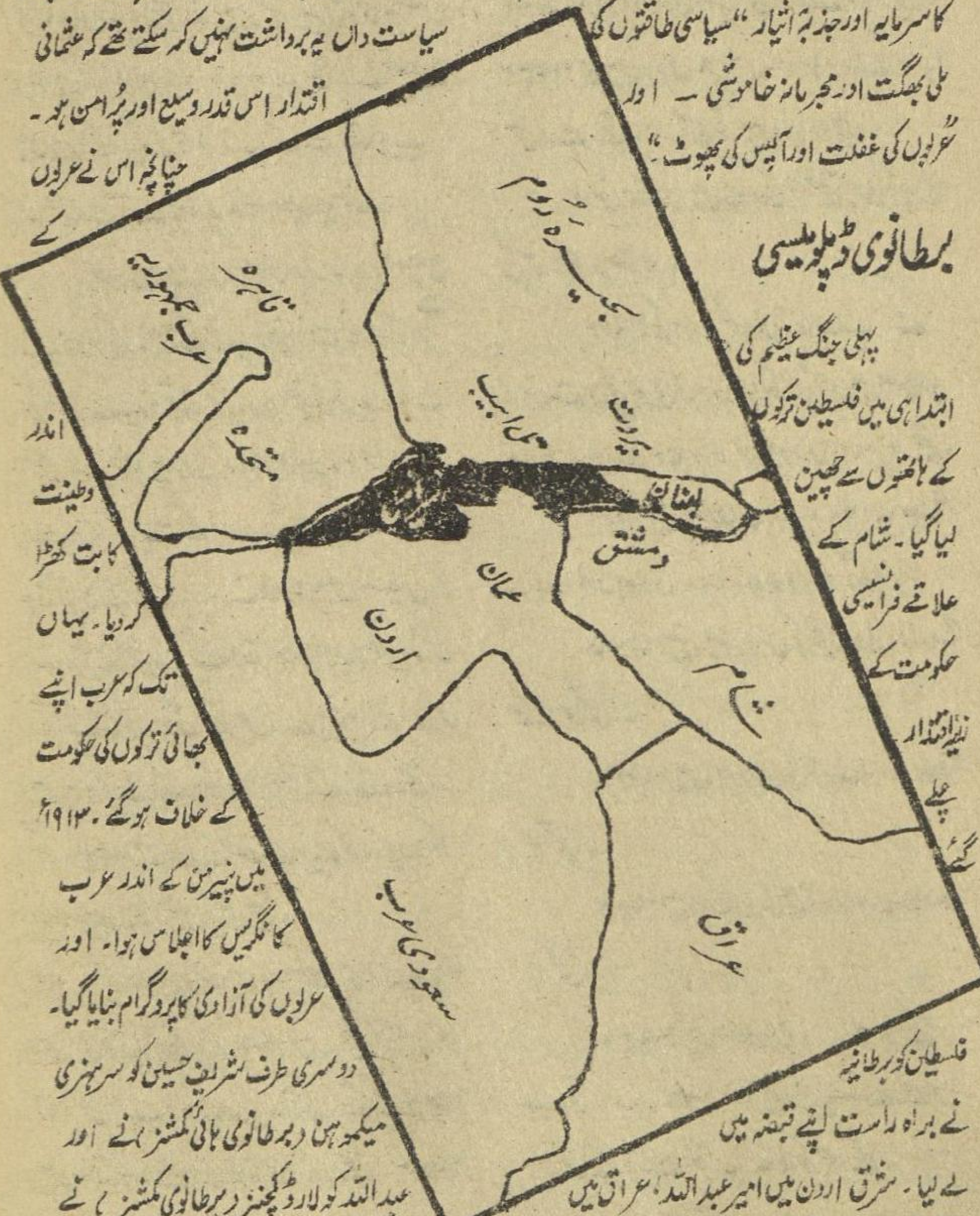
۱۹۴۶ء میں مسلمان ۰۰۰ر۴ ہو گئے۔ عیسائی ۰۰۰ر۱۳۷ اور یہودی باہر سے ناجائز داخلے کے ذریعے تقریباً ۷ لاکھ ہو گئے۔

۳۰ سال کی قلیل مدت میں یہودی باہر سے ۶ فیصدی سے ۳۳ فی صدی ہو گئے۔ یہ حیران کن اکثریت باہر سے آنے والے نو آبادکاروں پر مشتمل تھی۔ جن میں سے کثیر تعداد غیر قانونی طور پر آئی تھی

اس سُرعت کے ساتھ فلسطین میں یہودی کیسے جمع ہو گئے؟ اس سوال کا جواب ہے : "یہودی کی تنظیم کا سرمایہ اور جذبۂ ایثار" "سیاسی طاقتوں کی ملی بھگت اور مجرمانہ خاموشی ۔ اور عربوں کی غفلت اور آپس کی پھوٹ۔"

برطانوی ڈپلومیسی

پہلی جنگ عظیم کی ابتدا ہی میں فلسطین ترکوں کے ہاتھوں سے چھین لیا گیا ۔ شام کے علاقے فرانسیسی حکومت کے زیر اقتدار چلے گئے ۔



فلسطین کو برطانیہ نے براہ راست اپنے قبضہ میں لے لیا ۔ شرق اردن میں امیر عبداللہ، عراق میں امیر فیصل اور مکہ میں شریف حسین کو اقتدار دے کر بالواسطہ اپنا تسلط قائم کر لیا۔

سولھویں صدی سے ارضِ مقدس ترکوں کے زیر اقتدار تھی ۔ اور یہ زمانہ ارضِ مقدس کی تاریخ میں نہایت اطمینان کا تھا ۔ عیسائی، یہودی اور مسلمان (سارے عرب) پر امن زندگی گذار رہے تھے ۔ مگر برطانوی سیاست داں یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ عثمانی اقتدار اس قدر وسیع اور پُر امن ہو ۔ چنانچہ اس نے عربوں کے اندر وطنیت کا بت کھڑا کر دیا ۔ یہاں تک کہ عرب اپنے بھائی ترکوں کی حکومت کے خلاف ہو گئے ۔ ۱۹۱۳ء میں پیرس کے اندر عرب کانگریس کا اجلاس ہوا ۔ اور عربوں کی آزادی کا پروگرام بنایا گیا۔

دوسری طرف شریف حسین کو سر ہنری میکموہن (برطانوی ہائی کمشنر) نے اور عبداللہ کو لارڈ کچنر (برطانوی کمشنر) نے ہموار کیا ۔ چنانچہ حجاز اور ارضِ مقدس میں ترکوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند ہو گیا ۔ ترکوں کے بالمقابل انگریزی فوجیں اور عرب بھائی تھے ۔ آخر کار دسمبر ۱۹۱۷ء میں جنرل ایلن بی نے بیت المقدس پہ مکمل

قبضہ کرلیا اور بیک وقت عرب اور ترک دونوں کو نکال باہر کیا۔ ۱۹۲۰ء میں اتحادیوں کی اعلیٰ کونسل نے برطانیہ کو فلسطین کا انتداب (MANDATE) عطا کر دیا اور جولائی ۱۹۲۲ء میں لیگ آف نیشنز نے توثیق کر دی۔

برطانیہ پہلے عربوں سے وعدے ضرور کر چکا تھا لیکن پہلی جنگ عظیم میں اس پر یہود کی امداد کا بڑا احسان تھا۔ علاوہ بریں معاشی بحران کے وقت یہودی بینک اور یہودی سرمایہ داروں نے جنگی قرضے اور چندے دے کر آڑے وقت برطانیہ کا ساتھ دیا تھا۔ برطانوی مدبر اور سیاستدان یہودیوں سے ذاتی تعلقات اور نجی مراسم کے باعث بھی انہیں ناخوش نہیں کرنا چاہتے تھے۔ تمام سازشوں اور گٹھ جوڑ کا اثر یہ ہوا کہ برطانوی وزیر خارجہ مسٹر بالفور نے نومبر ۱۹۱۷ء کے اعلان کے ذریعہ رضامندی ظاہر کی کہ حکومت برطانیہ ارض مقدس میں یہود کا قومی وطن بنانے میں تعاون کرے گی۔ ساتھ ہی عربوں کو یقین دلایا کہ وہ ان کے حقوق کی نگہداشت بھی پیش نظر رکھے گی۔ اور ان کے مفاد کو نقصان نہیں پہنچائے گی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ تمام ممالک کے یہودی ہزاروں کی تعداد میں فلسطین میں آباد کئے جانے لگے۔ عربوں کی زمین دھڑا دھڑ خریدی جانے لگی۔ زمینوں کی کاشت اور منڈیوں کی تجارت سے عرب بے دخل کئے جانے لگے۔ ۱۹۲۰ء میں عربوں نے کئی بار یروشلم کی چھاؤنی پہ حملے کئے۔ مگر کسی طرح حالات پر قابو نہ پایا جاسکا۔ چونکہ اس وقت فلسطین میں برطانوی ہائی کمشنر سر ہربرٹ سیموئیل مذہباً یہودی تھا۔ اور صیہونیت کا پر جوش حامی تھا۔ اس نے تو ارض مقدس پہنچتے ہی صاف صاف کہہ دیا کہ "منشاء برطانیہ کی اس پالیسی کو بروئے کار لانے کے لیے میں آیا ہوں۔ وہ یہودیوں کے درآمد کی اس وقت تک ہمت افزائی کرتی ہے جب وہ گھڑی آن پہنچے خواہ ۵۰ سال میں ہو۔ (جیسے آج کا ۱۹۶۷ء) یا سو ہی سال میں ہو"۔۔۔ اس پر عربوں کی بے چینی بڑھ گئی ۱۹۲۱ء میں مسلمان اور فلسطینی عیسائیوں کا متحدہ وفد فلسطین کی پالیسی کی وضاحت کے لیے لندن گیا تو برطانیہ کی طرف سے وفد کو ہدایت دی گئی کہ وہ اس یہودی کمیشن سے گفت و شنید کرے جو صیہونی ادارے کی طرف سے فلسطین میں قائم ہوگیا ہے۔ ۱۹۲۸ء میں دونوں کے تعلقات اس قدر خراب ہوگئے کہ برطانوی حکومت کو بحری و ہوائی جہاز بھیج کر امن بحال کرنا پڑا عربوں کو شکایت تھی کہ یہودیوں کو زمین کی خریداری کی قانونی اجازت دے دینے سے عربوں کی بقا خطرے میں پڑگئی ہے عربوں کی یہودیوں سے کوئی مخالفت نہیں تھی۔ وہ صرف صیہونیت کے مخالف تھے۔

۱۹۳۳ء میں سامی دشمنی کے باعث نازی جرمنی نے بے شمار یہودیوں کا اخراج کیا اور ان کی درآمد پر عرب سخت خلاف ہوگئے۔

۱۹۲۹ء میں شاکمیشن نے تو یہ بیان دیدیا تھا کہ ملک میں جذب کرنے میں اتنی طاقت وصلاحیت

نہیں ہے اس سے زیادہ یہودی درآمد کر دیئے گئے لیکن باوجود اس وضاحتی بیان کے عربوں نے دیکھا کہ انتداب سے دس سال کی مدت میں جتنی تعداد میں یہودیوں نے نام رجسٹر کرائے تھے۔ ان سب کو ۱۹۳۴ء و ۱۹۳۵ء میں فلسطین میں مستقلاً آباد ہونے کی اجازت حاصل ہوگئی ان کی تعداد ۱۰ر۴۹۳۲۱۳ تھی تمام عرب ممالک کو اس بات کا احساس تھا کہ یہودی درآمد پر اگر کوئی پابندی نہ لگائی گئی تو یہ رویہ فلسطینی عربوں کو ایک کمزور اقلیت میں تبدیل کر دے گا۔ دوسری طرف غیر صیہونی یہودی بھی صیہونیت کی حمایت میں نعرہ بلند کرنے لگے کہ اگر یہودیوں کے داخلہ پر پابندی لگائی گئی تو یہ ان کے قومی وطن کے تصور کے خلاف ہوگا۔

اس دوران میں یہودیوں کو بے شمار اسلحہ پہنچایا گیا اکتوبر ۱۹۳۵ء میں تل ابیب کے ایک یہودی کے نام کئی سو سیمنٹ کی بوریاں آئیں مگر اتفاق سے محکمہ کسٹم کے افسروں نے انھیں کھول کر دیکھا تو ان میں ۳۰۰ رائفلیں ۵۰۰ سنگینیں اور ۴ لاکھ کارتوس نکلے۔ لیکن اس کے باوجود برطانیہ نے یہودی تنظیموں پر کوئی کڑی سختی نہ کی اور بالآخر یہودی مشرقِ وسطیٰ کے سینے کا ناسور اور امنِ عالم کے لیے چیلنج بن گئے۔

بقیہ اسرائیل - صیہونیت کی پناہ گاہ

تک مصر سے خروج کی یاد میں منایا جاتا ہے۔

ٹیشا باو

پہلے اور دوسرے ہیکل کی تباہی کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ عبادت خانے میں کتاب نوحہ پڑھی اور ماتمی رسوم ادا کی جاتی ہیں۔

ہفتہ وار چھٹی سبت کے روز ہوتی ہے۔

سبت کا دن (جمعہ) غروب آفتاب کے وقت شروع ہوتا ہے۔ اور ہفتے کے روز غروب آفتاب تک رہتا ہے۔ اس دوران میں سرکاری دفاتر، پبلک ادارے، دکانیں، تفریح گاہیں، ہوٹل اور ریسٹوران بند رہتے ہیں۔ شہروں میں ٹیکسیوں کے سوا ٹرانسپورٹ بھی رک جاتی ہے۔ کوئی اخبار شائع نہیں ہوتا، البتہ ٹیلی فون سسٹم کام کرتا رہتا ہے۔ تاہم کٹر مذہبی اسرائیلی نہ تو فون کرتے ہیں، نہ کسی فون کا جواب ہی دیتے ہیں۔

بقیہ اقوام کی فوج کی واپسی

اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ اس کا سارا انحصار مصر اور اقوام متحدہ کے درمیان خیر سگالی پر ہے؟

کیا لوگوں کو اس بات کا علم نہیں کہ اقوام متحدہ کی امن فوج کا مقصد ۱۹۵۷ء میں یہ قرار دیا گیا تھا کہ وہ اسرائیل فرانس اور برطانوی فوجوں کی جگہ لے جنہیں اخراج کا حکم دیا گیا تھا۔ انہوں نے بڑے واضح طور پر کہا ہے کہ اس دستاویز میں کوئی نئی بات نہیں کہی گئی تھی جو اعلیٰ توجہ کی محتاج ہوتی جو باتیں کہی گئی تھیں وہ محض ذاتی رائے کا اظہار تھیں۔ سرکاری اور قانونی حیثیت ہرگز نہیں رکھتی تھیں۔

اسرائیل — ایک عالمی خطرہ

یہودی قوم ایک الگ چیز ہے اور صیہونی تحریک ایک دوسری چیز۔ جیسے جرمن قوم ایک وجود کا نام ہے اور نازی تحریک ایک دوسرے وجود کا یا ہندو فرقہ ایک خاص اجتماعی تشخص رکھتا ہے لیکن آر ایس ایس ایک دوسرا ہی وجود ہے۔ ان سب فرقوں اور تحریکوں میں ایک بات مشترک ہے کہ یہ تحریکیں ان کے اپنے فرقوں یا قوموں کے علاوہ کہیں اور پروان نہیں پا سکتیں مثلاً آر ایس ایس ہندوؤں میں، صیہونی تحریک یہودیوں میں یا نازی تحریک جرمن قوم ہی سے اپیل کر سکتی ہے کسی اور سے نہیں۔

اسی کے ساتھ ہمیں یہ بھی فرق کرنا پڑے گا کہ جس طرح ہر ہندو آر ایس ایس کا ممبر نہیں اسی طرح ہر یہودی صیہونی تحریک کا ممبر یا حامی نہیں۔ یہودی ایک مسلک اور گروہ کو ماننے والے گروہ کا نام ہے جبکہ صیہونی ایک ایسی جماعت اور تحریک ہے جو اس گروہ کو ہر قیمت پر برسر اقتدار لانا چاہتی ہے۔

قدیم بیت المقدس میں ایک پہاڑی کا نام صیہون ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے وہاں اپنی عبادت گاہ تعمیر کی تھی۔ اسی وقت سے یہ پہاڑی متبرک شمار ہوتی ہے۔ اسی کی مناسبت سے اسرائیل کے قیام سے بہت پہلے یہودیوں میں ایک تحریک "صیہونیت" شروع کی گئی۔ جس کا مقصد یہ قرار پایا کہ یہودیوں کی بکھری ہوئی بھیڑوں کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے اور وہ جگہ فلسطین ہو۔ پھر فلسطین کی ریاست کو توسیع دی جائے۔ اور عراق سے مصر سویز تک اس کی سرحدیں پھیلا دی جائیں۔ ۲۹ جولائی ۱۹۵۱ء کو اسرائیلی پارلیمنٹ میں لیبر لیڈر ڈاکٹر عاری الکمان نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ بکھرے ہوئے یہودیوں کو جمع کر دینے کا مطلب ہے پچاس لاکھ یہودیوں کو دس سال کے اندر اندر اسرائیل میں اکٹھا کر دینا ہے مگر اسرائیل کے مالی وسائل اس کے متحمل نہیں اس لئے ہماری خارجہ پالیسی میں یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ اسرائیل کی پوری سرزمین کو دوسروں سے خالی کرایا جائے۔ پھر ۱۳ مارچ ۱۹۵۲ء کو انہی ڈاکٹر الکمان نے عظیم تر اسرائیل کی تشریح کرتے ہوئے کہا:۔

"عظیم تر اسرائیل عراق سے سویز تک پھیلا ہوا ہے۔ یہی وہ طاقتور ریاست ہو سکتی ہے جو مشرق وسطیٰ میں اندرونی اور بیرونی امن و استحکام

کی ضمانت دے سکے، ہمارا فرض ہے کہ دنیا سے صاف صاف کہہ دیں کہ فلسطین میں دنیا بھر کے یہودیوں کو جمع کر کے فوجی بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اسرائیل کی سرحدوں کو عراق سے سویز تک وسیع کر دیا جائے اسی کے بعد اسرائیل مشرقِ وسطیٰ میں جمہوریت کا گہوارہ بن کر اپنے آپ کو تباہی سے بچا سکتا ہے"۔

بات غیر متعلق نہ ہوگی اگر ہم یہاں یہ بھی مطالعہ کر لیں کہ جمہوریت سے صیہونی تحریک کے بانیوں کی منشا کیا ہے اس تحریک کے ایک ممتاز لیڈر اور مفکر تھیوڈر ہرزل اپنی کتاب "یہودی ریاست" میں لکھتا ہے :-

"عوام جمہوریت کے لیے موزوں نہیں ہیں اور آئندہ بھی نہیں ہو سکتے معقول اور پختہ پالیسیاں عوامی اور پارلیمنٹری اداروں کا عطیہ نہیں ہوا کرتیں۔ بلکہ ایسی شخصیتیں جو تاریخ کی پیداوار کہی جا سکیں، وہ عوام کی امنگوں کی ترجمانی اور ریاست کے مفادات وتحفظ کی حفاظت کرتی ہیں۔ عوام نہیں بلکہ انہی کی مرضی کو بالآخر غالب آنا چاہیئے"

صیہونی تحریک کا یہ منصوبہ ڈھکا چھپا نہیں بلکہ اسرائیلی پارلیمنٹ یہ موٹو اپنا چکی ہے کہ :-

"اے اسرائیل! تیری سرحدیں فرات سے نیل تک پھیلی ہوئی ہیں"۔

یہی نہیں بلکہ مستقبل کی یہودی سلطنت کی حدود میں پورا شام، پورا لبنان اور پورا اردن، عراق کا بڑا حصہ، کویت، ترکی کا ایک حصہ، سینا، بالائی نجد اور مدینہ منورہ تک شامل ہے۔

ہمارے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہودی قوم اور صیہونی تحریک میں دنیا کو فرق کرنے کی ضرورت ہے بسا اوقات لوگ یہ خیال قائم کر لیتے ہیں کہ ہم یہودیوں کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دینے کے حق میں ہیں، یہ بات صحیح نہیں ہے۔ دنیا میں جو قومیں آباد ہیں وہ اپنی صلاحیت یا عدم صلاحیت کی وجہ سے بڑھتی یا فنا ہوتی ہیں۔ کسی نسل، ذات، قومیت، مذہب کی بنا پر کسی کو فنا کرنا ہمارے اصول و عقیدہ سب کے خلاف ہے ہاں اس تصور اور تحریک سے ضرور ہماری جنگ ہے جو کسی فرقے کو کسی مخصوص فرقے سے تعلق رکھنے کی بنا پر غالب اور مسلط کرنے کے درپے ہو۔ یہ صیہونی تحریک مغربی ایشیا کے لیے تو خطرہ ہے ہی لیکن ہم چاہتے ہیں کہ مغربی ایشیا میں امریکہ اور برطانیہ اور فرانس اور مشرقی ممالک میں روس اور چین اس کے خطرات کو محسوس کریں، جنگِ عظیم اوّل کے بعد نازی جرمنی کو وجود میں لا کر مغربی طاقتوں نے جو حماقت کی تھی اب صیہونی اسرائیل اس سے بڑا اور اس سے کہیں زیادہ مہیب خطرہ بن کر سامنے آ رہا ہے۔

دنیا کے اکثر ملکوں میں اسی مزاج کی تحریکیں سے اس کا رشتہ قائم ہونا بھی کوئی پوشیدہ راز نہیں ہے۔ کیا ہی اچھا ہو تا کہ .... بھی غور کرتا کہ جس طرح نازی

اسرائیل — صیہونیت کی پناہ گاہ

یہودیوں کے نزدیک اسرائیل محض ایک قومی وطن نہیں ہے، وہ اسے اپنی قومی اور مذہبی احیاء کا مرکز بھی قرار دیتے ہیں۔ صیہونی تحریک نے ان کے اندر صرف قوم پرستی کا جذبہ پیدا کیا بلکہ انھیں اپنے ماضی کے ساتھ وابستہ کرنے کی گوناگوں تدبیریں بھی کیں۔ اس سلسلے میں ایک نمایاں تدبیر عبرانی زبان کا احیاء ہے۔ ایک مردہ زبان کے احیاء نے یہودیوں کا رشتہ اپنے ماضی کے ساتھ گہرا کرنے میں اہم حصہ لیا ہے۔ یہ کارنامہ لتھوینیا کے ایک صحافی الیعذر بن یہودا کا ہے جو اس نے صیہونی تحریک سے جوش و جذبہ پاکر انجام دیا۔ الیعذر بڑا جوشیلا اور سرگرم صیہونی تھا۔ انیسویں صدی کے اواخر میں فلسطین آیا۔ سب سے پہلے اسی کو یہ خیال آیا کہ اگر یہودی فلسطین واپس گئے تو انھیں ایک مشترکہ قومی زبان کی ضرورت پڑے گی۔ چنانچہ اس نے اپنی بقیہ زندگی عبرانی زبان کو زندہ کرنے میں صرف کر دی۔

عبرانی صدیوں سے دعا اور عبادت کی زبان چلی آتی تھی۔ روزمرہ کی زندگی سے وہ بالکل کٹ چکی تھی۔ عبرانی کے عہد نامہ عتیق میں صرف ۷۷۰۴ الفاظ کا ذخیرہ ملتا تھا۔ بن یہودا نے پرانی کاغذوں پر لکھے ہوئے قدیم مخطوطات کی چھان بین کی اور ہزاروں الفاظ جو گم ہو چکے تھے تلاش کیے۔ پھر عبرانی الفاظ کے اصول یعنی ROOT استعمال کرکے نئے الفاظ وضع کیے۔ بن یہودا خود بھی عبرانی زبان بولتا تھا اور اپنے بیوی بچوں کو بھی عبرانی بولنے کی تاکید کرتا تھا۔ اس نے اپنے اخبار کے ذریعے عبرانی کو عام کیا اور کئی ہزار نئے اور پرانے الفاظ پر مشتمل ایک لغت مرتب کی۔ بن یہودا کا بڑا لڑکا اتامر بن آوی پہلا یہودی بچہ تھا جس نے عبرانی کو اپنی مادری زبان کے طور پر سیکھا۔ کہتے ہیں بن یہودا نے اسے کئی سال تک گھر میں مقفل کیے رکھا تاکہ اس کے کانوں میں کوئی اور زبان نہ پڑنے پائے۔ آخر بن یہودا اپنے مقصد میں کامیاب ہوا۔ ایک حلقہ ایسا پیدا ہو گیا جس نے اس زبان کو مزید ترقی دینے اور پھیلانے کا کام جاری رکھا۔ بالآخر صدیوں کی مری ہوئی زبان بیسویں صدی کی ترجمانی کرنے لگی۔ ۱۹۲۵ء میں یہودیوں نے بیت المقدس میں عبرانی یونیورسٹی قائم کی جس میں سائنس، قانون، آرٹ اور جیوش علوم کی تعلیم عبرانی زبان میں دی جاتی تھی۔ اسرائیل قائم ہوا تو عبرانی مملکت کی سرکاری زبان قرار پائی۔ ۱۹۴۸ء سے اب تک کئی لاکھ یہودی عبرانی سیکھ چکے ہیں۔ نوآبادکار یہودیوں کو عبرانی سکھانے کے لیے وزارت تعلیم اور جیوش

ایجنسی نے کورسز کا اہتمام کر رکھا ہے۔

عام تعلیمی نصاب قوم پرستی اور مذہبیت کے امتزاج پر مبنی ہے۔ ملک میں مختلف سوسائٹیاں اور حلقے ہیں جن میں بائبل کے عہد نامۂ عتیق پر بحث و مذاکرات اور مذہبی موضوعات پر انعامی مقابلے ہوتے ہیں۔ ہر بستی میں معبد قائم ہیں۔ یروشلم میں چار سو معبد ہیں۔ میدانِ جنگ میں بھی عبادت کا التزام کیا جاتا ہے۔

یہودیوں نے ماضی کے تاریخی مقامات پر نئی زندگی کا آغاز کیا ہے وادیٔ ایلہ میں یمن سے آنے والے یہودیوں کو آباد کیا گیا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں داودؑ نے جالوت کو قتل کیا تھا۔ بحرِ مُردار کے ساحل پر مسّادا کے نزدیک یہودا کے بیابان میں ایک یوتھ ہوسٹل تعمیر کیا گیا ہے۔ یہاں ۷۳ء میں سلطنت یہودیہ کی فوجوں نے رومیوں سے آخری جنگ لڑی تھی۔ بیر شیبہ، جہاں حضرت ابراہیم نے تمرس کا پودا اپنے دستِ مبارک سے لگایا تھا، آج اسرائیل کے صحرائی صوبہ نقب کا دارالحکومت ہے۔

مذہبی و قومی تہوار بھی اس جذباتی تعلق کو گہرا کرتے میں اہم حصہ لیتے ہیں۔ ہر تہوار کے پس منظر میں یہودی تاریخ کا کوئی نہ کوئی اہم واقعہ ہوتا ہے۔ ان تہواروں پر ملک بھر میں تعطیل ہوتی ہے۔ چند اہم تہواروں کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

یوم کپّور

یوم کفارہ۔ یہودی سال کا مقدس ترین دن ہے۔ اس دن یہودی اپنے آپ کو دینِ موسوی کے لیے وقف کرنے کا عہد کرتے ہیں۔ اس روز اسرائیل میں کاروبار معطل ہوجاتا ہے۔ ہوٹل اور ریسٹوران تک نہیں کھلتے۔ اسرائیل ریڈیو بھی چھٹی کرتا ہے۔ صرف ایمرجنسی تاریں بھیجی جاسکتی ہیں۔

سکّوت

اسرائیلیوں کی چالیس سالہ صحرانوردی کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ اس موقعہ پر یہودی گھروں سے نکل آتے ہیں اور باہر کھلے میدانوں میں گھاس پھوس کے چھپّر بنا کر رہتے ہیں۔

شمشد تورات

موسمِ خزاں میں تورات کی سالانہ تلاوت ختم کرنے پر منایا جاتا ہے۔ اس روز یہودی معبد خانوں میں تورات کے نسخے جلوس کی صورت میں لے کر جاتے ہیں۔

ھنوکہ

۲۵ دسمبر سے ۲ جنوری تک منایا جاتا ہے اس تاریخی فتح کی یاد میں جو ۱۶۴ء میں مکابی کو اسوریوں پر ہوئی تھی۔ اور یہودیوں نے ہیکل کو پاک صاف کرکے دوبارہ آباد کیا تھا۔ ان دنوں میں ہر روز دن کے وقت چراغ روشن کیے جاتے ہیں۔ یہ گویا اس امر کا اعلان ہوتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی روز ہیکل سلیمانی کو پھر سے آباد کریں گے۔

پیساخ

مارچ اور اپریل کے مہینے میں ایک ہفتے

بقیہ صفحہ ۸۹ پر

اقوامِ متحدہ کی فوج کی واپسی

عربوں اور اسرائیل کے درمیان باقاعدہ جنگ ہونے سے پیشتر برطانیہ کے اخبارات میں جس واقعہ کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی تھی وہ مصر اور اسرائیل کی سرحد سے اقوامِ متحدہ کی امن فوج کی واپسی تھی۔ برطانوی حکومت اور پریس دونوں نے یہاں عوام میں یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی کہ عربوں اور اسرائیل کے درمیان جنگ کی سب سے اہم فوری وجہ اقوامِ متحدہ کے سیکریٹری جنرل اوتھانٹ کا یہ فیصلہ تھا کہ امن فوج کو واپس بلا لیا جائے یہ دوسری بات ہے کہ برطانیہ کے سنجیدہ سیاسی حلقے اور دو ایک اپنی آزاد رائے رکھنے والے اخبارات کا نقطۂ نظر اس سے ذرا مختلف تھا مثال کے طور پر اقوامِ متحدہ کی امن فوج کی واپسی کے کوئی آٹھ دن بعد ۲۸ مئی کو اخبار سنڈے ٹائمز کے نامہ نگار مقیم قاہرہ فلپ نائٹلے نے اطلاع دی کہ صدر ناصر نے اوتھانٹ سے ملاقات کے دوران میں اس بات کی تجویز پیش کی تھی کہ مصر اقوامِ متحدہ کی فوج کو دوبارہ واپس لینے کے لیے تیار ہے لیکن چند شرائط کے ساتھ۔

اس اشاعت میں اخبار سنڈے ٹائمز نے ایک بڑا معلوماتی مقالہ شائع کیا جس کی ترتیب میں چھ افراد نے حصہ لیا تھا۔ یہ مقالہ ٹائمز کے قاہرہ کے نامہ نگار تل ابیب کے نامہ نگار، نیویارک کے نامہ نگار، ماسکو کے نامہ نگار اور لندن میں اس کے سیاسی وقائع نگار کے مشترکہ ناموں سے شائع ہوا۔ ٹائمز کے ان نامہ نگاروں کی مشترکہ رائے یہ تھی کہ مصر میں اوتھانٹ اور صدر ناصر کی بات چیت نے جنگ کے خطرے کو دور کر دیا اور صدر ناصر کی اس پیشکش کے بعد کہ مصر اقوامِ متحدہ کی امن فوج کو چند شرائط کے تحت واپس لینے کے لیے تیار ہے اب جنگ کا امکان باقی نہیں رہا ہے قاہرہ کے ٹائمز کے نامہ نگار نے تو یہاں تک لکھا کہ انہیں معلوم ہوا ہے کہ قاہرہ میں ہندوستانی سفیر نے اپنی حکومت کو تار دیا ہے کہ اب ناصر اور اوتھانٹ کی بات چیت کے بعد مشرقِ وسطیٰ کے بحران کو ختم سمجھنا چاہیئے۔

نکتہ چینی کا مقصد کیا ہے

ان باتوں کے پیشِ نظر اقوامِ متحدہ کی امن فوج کی واپسی کو جنگ کا سبب قرار دینا سیاسی

دیانت داری کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ برطانوی حکومت اور برطانیہ کے اخبارات کی اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل کے فیصلہ کے خلاف تلخی کی تہہ میں وہی بات نظر آتی ہے جس کا اظہار کنزرویٹو اخبار ڈیلی ٹیلیگراف نے کیا تھا کہ "اقوام متحدہ کی امن فوج کی موجودگی نے اسرائیل کو یہ آزادی دے رکھی تھی کہ اگر وہ شام پر حملہ کرتا تو اس کی جنوبی سرحد حملے سے محفوظ رہتی"۔ امریکہ میں جنرل سکریٹری اوتھانٹ کے خلاف اور زیادہ ناراضگی اور غصے کا اظہار کیا گیا اور اس ناراضگی نے آہستہ آہستہ ایک مہم کی صورت اختیار کر لی۔ برطانوی اخباروں میں اس مہم کے متعلق جو خبریں شائع ہوتی رہی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا واضح مقصد خاص طور پر یہ تھا کہ سکریٹری جنرل اوتھانٹ کی ذاتی حیثیت کو نقصان پہنچایا جائے۔ اگر اس طرح اقوام متحدہ کا وقار بھی کم ہوتا ہے تو اس سے انہیں کم از کم اس سلسلہ میں کوئی غرض نہ تھی۔ ۲۵ جون کو آبزرور کے نیویارک کے نامہ نگار نے لکھا کہ "اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل پر اس قسم کے ذاتی اور تلخ حملے کئے جا رہے ہیں جیسے ۱۹۶۰ء میں ان کے پیش رو ہیمرشولڈ پر کئے گئے تھے ۱۹۶۰ء میں یہ حملے سابق روسی وزیر اعظم مسٹر خروشچیف کی طرف سے کئے گئے تھے۔

آبزرور کے نامہ نگار نے یہ بھی لکھا کہ "اقوام متحدہ کے وقار کو کم کرنے کی کوشش کرنے والے عناصر امریکی حکومت کے اندر ہیں اور انہیں برطانیہ و اسرائیل کی حمایت حاصل ہے"۔

اس امریکی مہم کا مرکز وہ دستاویز ہے جسے ہیمرشولڈ میمورنڈم کہتے ہیں اور جو سب سے پہلے "انٹرنیشنل لیگل میٹریلز" نامی جریدے میں شائع ہوئی تھی اسے بعد ازاں نیویارک ٹائمز کی ۲۰ جون کی اشاعت میں بھی چھاپا گیا برطانوی اخباروں سے پتہ چلا ہے کہ جریدے کے لئے دستاویز مہیا کرنے والے امریکہ کے ایک قانون دان مسٹر ارنسٹ گراس تھے جو نیویارک میں وکالت کرتے ہیں وہ اس سے پہلے اقوام متحدہ میں امریکی وفد کے ایک رکن تھے اب مسٹر گراس نے امریکی اخباروں کو ایک بیان دیا جس میں انہوں نے کہا کہ خود سابق سکریٹری جنرل مسٹر ہیمرشولڈ نے اس دستاویز کی نقل انہیں دی تھی۔

جس وقت موجودہ سکریٹری جنرل اوتھانٹ نے مصر کی اس رسمی درخواست پر فیصلہ صادر کیا کہ اقوام متحدہ اور مصر کے درمیان معاہدہ اور اس سے متعلق کاغذات تھے جب مصر سے اقوام متحدہ کی فوج کے انخلاء کے بارے میں اوتھانٹ نے فیصلہ کیا تو وہ اپنے پیشرو مسٹر ہیمرشولڈ کے میمورنڈم کے وجود سے بے خبر تھے۔ اقوام متحدہ کی سرکاری فائلوں میں اس کی کوئی نقل موجود نہیں تھی۔ اس موقع پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ میمورنڈم کی سیاسی حیثیت اور اس سے اتفاق و اختلاف سے قطع نظر نہ تو اس کی کوئی سرکاری حیثیت ہے اور نہ قانونی آج تک اس میمورنڈم کے جتنے حوالے دیئے گئے ہیں اس کی اصل کاپی شاید سویڈن میں ہیمرشولڈ کے ذاتی کاغذات

کے ساتھ بند ہے جنہیں ابھی تک شائع نہیں کیا گیا۔

ہیمر شولڈ میمورنڈم

سوال یہ ہے کہ اس میمورنڈم میں کیا ہے؟ مسٹر گراس کا کہنا ہے کہ ۱۹۵۶ء میں ناصر ہیمر شولڈ کانفرنس کے بعد اس کی ترتیب ہوئی تھی۔ مسٹر گراس کا کہنا ہے کہ مسٹر ہیمر شولڈ نے اس کی نقل انھیں بھی دی اور کہا کہ "اسے رکھو ہو سکتا ہے کہ یہ آئندہ کام آئے" میمورنڈم کی بنیادی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ مصر سے امن فوج کو ہٹانے کا اختیار نہ تو مصر کو ہے اور نہ اقوام متحدہ کے کسی عہدیدار کو۔ اس کا فیصلہ صرف جنرل اسمبلی کر سکتی ہے۔ یادداشت میں لکھا ہے کہ اگر مصر نے کبھی امن فوج کو ہٹانے کی درخواست کی تو اس کا طریقہ کار یہ ہوگا کہ اس معاملے کو جنرل اسمبلی میں پیش کیا جائے اگر اسمبلی نے یہ محسوس کیا کہ امن فوج نے اپنا کام مکمل کر لیا ہے تو فوج واپس بلائی جائے گی۔ اور اگر جنرل اسمبلی نے یہ محسوس کیا کہ کام مکمل نہیں ہوا ہے اور مصر نے فوج کی واپسی پر اصرار کیا تو جنرل اسمبلی اور مصر کے درمیان معاہدے کو توڑنے کی ذمہ داری مصر پر ہوگی۔

'اوتھانٹ کا موقف'

ایک مشہور صحافی نے نیویارک سے لکھا ہے کہ جس انداز سے ہیمر شولڈ میمورنڈم کو پیش کیا گیا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا مقصد ایسے وقت اقوام متحدہ کے وقار کو کم کرنا تھا جب اس ادارے کو اعلیٰ قیادت کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ ہیمر شولڈ میمورنڈم کا تذکرہ ایسے وقت شروع ہوا ہے جب برطانیہ اور امریکہ میں امن فوج کو واپس بلانے کے فیصلے پر نکتہ چینی کم ہونے لگی تھی۔ اس صحافی نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے غالباً سکریٹری جنرل کے خلاف مہم کا آغاز امریکی حکومت کے ایماء پر کیا گیا ہے۔

امریکہ میں نہ صرف اسے میمورنڈم کو جگہ جگہ شائع کیا گیا بلکہ بے شمار متعلقہ لوگوں کے بیانات شائع ہوئے ہیں۔ اخبارات میں مقالات اور مضامین کی بھی بھرمار ہو گئی اور ان سب کا مقصد اوتھانٹ کے وقار کو کم کرنا تھا۔ اس سلسلے میں اقوام متحدہ میں مصری وفد کے لیڈر اور خود اوتھانٹ نے جن کی دیانتداری، جرأت اور غیر جانبداری کے سب قائل ہیں۔ شدید حیرت اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اوتھانٹ عام طور پر اخباری بیانات دینے سے گریز کرتے ہیں لیکن اس دستاویز کے بارے میں بیان دینا انھوں نے بھی ضروری سمجھا۔ انہوں نے کہا اس دستاویز کی کوئی سرکاری حیثیت نہیں ہے۔ یہ اقوام متحدہ کے ریکارڈ میں بھی موجود نہیں ہے۔ اور اس کے وجود سے اقوام متحدہ کے کسی ادارے کو سرکاری طور پر باخبر نہیں کیا گیا۔ اس یادداشت کو نہ ناصر کے پاس کبھی بھیجا گیا اور نہ سرکاری طور پر آج تک مصری حکومت کو اس کی اطلاع دی گئی۔

'امن فوج کا مقصد'

اوتھانٹ نے کہا کہ اس دستاویز کو دیکھ کر کیا لوگوں کو

بقیہ صفحہ ۸۴ پر

مصری فضائیہ کا المیہ

برطانیہ کے مشہور اخبار ڈیلی ٹیلی گراف نے اسرائیل اور عربوں کی حالیہ فضائی جنگ کے بارے میں ایک تفصیلی مضمون شائع کیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ چھ دن کی اس جنگ کا پانسہ اسرائیل کے حق میں کیونکر پلٹا۔ اور اسرائیل نے فضائی جنگ میں کیا حربے اختیار کئے جن سے نہ صرف عربوں کی فضائی قوت تباہ ہو گئی بلکہ وہ بالآخر اسرائیل کی قطعی فتح کا بھی سبب بنے۔ قارئین "الیؔ مؤ" کے لئے اس مضمون کا ترجمہ ذیل میں درج کر رہے ہیں (یہ مضمون سابق برطانوی وزیر اعظم چرچل کے بیٹے اور پوتے نے لکھا ہے)

پیر ۵ جون کی صبح کو ۷ بجکر ۴۵ منٹ پر یعنی قاہرہ کے وقت کے مطابق ۸ بجکر ۴۵ منٹ پر اسرائیلی ہوائی جہازوں نے مصر کے دس ہوائی اڈوں میں سے نو پر بیک وقت حملہ کیا۔ دسویں ہوائی اڈہ فعید پر چند منٹ دیر سے حملہ ہوا۔ اس وقت نہر سویز پر ہلکا سا کہرا چھایا ہوا تھا۔ اپنے اپنے نشانوں پر بیک وقت حملہ کرنے کی غرض سے اور مصریوں کو اچانک دھاوے سے بوکھلا دینے کی خاطر اسرائیلی ہوائی جہاز باقاعدہ وقفے وقفے سے اڑائے گئے۔ ہر حملہ میں بیک وقت چار چار ہوائی جہازوں نے حملے کئے۔ حملے عین ہدایات کے مطابق ہوئے۔ اور ہر ہوائی جہاز نے اپنے بم بڑی کامیابی سے گرائے۔

مصری فوج کا بڑا حصہ زمین ہی پر تباہ کیا گیا

اس وقت مصر کی فضا میں صرف چار تربیتی ہوائی جہاز پرواز کر رہے تھے۔ ایک میں انسٹرکٹر تھا اور تین میں اس کے شاگرد۔

اسرائیلیوں نے ۷ بجکر ۴۵ منٹ کا وقت حملہ کے لئے کیوں مقرر کیا تھا اس کی بھی وجوہات ہیں۔ مصریوں کے نزدیک ممکنہ ہوائی حملے کے خلاف کارروائی کرنے کے لئے تیار رہنے کا انتہائی مقررہ وقت گذر چکا تھا۔ صحرائے سینا میں جب سے مصری فوج لیس کھڑی تھی۔ اس وقت سے مصری مگ ۲۱ ہوائی جہاز ہوائی اڈہ پر ۵ منٹ کے نوٹس پر اڑنے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ کبھی کبھی مگ ۲۱ ہوائی جہاز علی الصباح ایک دو فضا میں اڑتے کیونکہ دشمن کی طرف سے حملے کا خطرہ ایسے ہی وقت تھا۔

قیاس کیا گیا ہے کہ چونکہ کسی کی کیفیت غیر معینہ مدت

تک تو برقرار نہیں رہ سکتی تھی صبح ہونے کے دو تین گھنٹے بعد بھی جب کوئی حملہ نہیں ہوا تو قدرتی طور پر مصری ہوائی فوج نے چوکسی میں تساہل برتا۔ اور ان کے بعض راڈروں کی دیکھ بھال سے اسرائیلیوں نے اندازہ لگایا کہ قاہرہ کے وقت کے مطابق "۸ بجکر ۳۰ منٹ" ایسا وقت ہے جب تمام مصری ہواباز آرام کی فکر میں ہوں گے۔ لیکن ہوابازوں کو تین گھنٹے قبل سے تیاری کرنی ہوتی ہے۔ گویا انہیں نصف شب سے بیدار رہنا پڑتا ہے۔ اکثر صورتوں میں تو ساری رات جاگنا پڑتا ہے، ۷ بجکر ۴۵ منٹ حملے کا وقت مقرر کرنے سے ہوابازوں کو چار بجے صبح تک آرام دیا جا سکتا تھا۔ اس موسم میں دریائے نیل پر عموماً دھند چھائی رہتی ہے یہی حال ڈیلٹا اور نہر سوئز کا ہوتا ہے۔ مگر ۷ بجکر ۳۰ منٹ تک کہر چھٹ جاتا ہے۔ آٹھ بجے تک سورج چمکنے لگتا ہے اور زمین صاف نظر آنے لگتی ہے۔ ہوا خاموش ہو جاتی ہے یہ ساری باتیں بموں کو نشانے پر گرانے میں مدد دیتی ہیں۔ اور رن وے آسانی سے تباہ کئے جا سکتے ہیں اسرائیل میں جب ۷ بجکر ۴۵ منٹ ہوتے ہیں تو مصر میں ۸ بجکر ۴۵ منٹ کا وقت ہوتا ہے مصری اپنے اپنے دفتروں کو ۹ بجے جاتے ہیں۔ ۹ بجے سے ۱۵ منٹ قبل حملہ کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ مصری جنرل اور فضائیہ کے کمانڈر دفتر جا رہے ہوں گے۔ ہواباز اور فضائیہ کا عملہ تربیتی نصاب کی تکمیل اور دیگر کارروائیوں کیلئے چل پڑا ہو گا۔

مصر کے ہوائی جہازوں کا پیٹرول کرنے والا آخری دستہ فضا میں بلند ہوا تو اس وقت اسرائیلی فضائیہ کے کمانڈر جنرل ہاڈ اپنے کمانڈ سنٹر میں تھے۔ ہوائی جہاز جب اسرائیلی راڈر پر نمودار ہوئے تو انہوں نے اپنی اسٹاپ واچ کا بٹن دبا دیا۔ انہیں معلوم تھا کہ مگ ہوائی جہاز فضا میں کتنی دیر منڈلا سکتے ہیں۔ ۷ بجکر ۴۵ منٹ پر انہیں اترنا ہی پڑے گا کیونکہ پیٹرول ختم ہو چکا ہو گا۔

اسرائیل کے پہلے فضائی حملہ کا مقصد رن وے تباہ کرنا اور زیادہ سے زیادہ مگ ہوائی جہازوں کو برباد کرنا تھا کیونکہ مگ ہوائی جہاز ہی اسرائیلی فضائیہ کو حملوں سے روک سکتے تھے۔ علاوہ ازیں مصر کے دور مار بمباروں سے ڈر تھا کہ وہ اسرائیلی شہری آبادی کو تباہ نہ کر دیں۔ چنانچہ اسرائیلی ہوائی جہازوں نے مگ ۲۱ ہوائی جہازوں کے ہوائی اڈے پر کھڑے آٹھ دستوں کو تباہ کر دیا۔

مصر کے اصل ہوائی اڈے قاہرہ اور نہر کے آس پاس ہیں۔ چنانچہ ان اڈوں سے مگ ۱۲ اور مگ ۱۹ جہازوں کو جو علی الترتیب بارہ اور آٹھ تھے، ہٹوانے میں اسرائیلی ترکیب کارگر ثابت ہوئی۔ اس کے لئے انہوں نے خلیج عقبہ کے جنوب کی طرف دیکھ بھال کے لئے اپنے ہوائی جہاز بھیجنے شروع کئے۔ مصریوں نے خیال کیا کہ اسرائیلی جزیرہ نما سینا کے جنوب میں حملے کے لئے سوچ رہے ہیں۔ حالانکہ بحیرہ روم کی سیدھی جانب حملے کی زیادہ توقع تھی۔ چنانچہ مصریوں نے وہ مگ ہوائی جہاز قاہرہ سے ہٹا کر غزہ بھجوا دیئے۔ جب اسرائیلیوں نے قاہرہ کے آس پاس کے ہوائی اڈوں پر حملہ کیا۔ تو یہ ہوائی جہاز منگوائے گئے اور جب وہ وہاں پہنچے تو ہوائی اڈے اور ان کے رن

وہ سب تباہ کیے جا چکے تھے۔ یہ بھی دھوکے کا شکار ہوئے۔

تاہم ۲ طیارے دوبارہ فضا میں آئے اور انہوں نے اسرائیل کے دو ہوائی جہاز مار گرائے لیکن خود بھی اسرائیل کا نشانہ بنے۔

اسرائیلی ہوائی جہاز چار چار کی ٹکڑیوں میں مختلف راستوں سے آئے قاہرہ نہر سویز اور سینائی کے ہوائی اڈوں پر چکر کاٹ کر سمندر کی جانب سے اور دوسری ٹکڑیاں شمالی مصر کے اڈوں پر سیدھی پہونچ گئیں۔

بریگیڈیر جنرل ایزر ویزمن نے جو اسرائیلی جنگی کارروائی کے چیف تھے کہا "ہم سیدھے اپنے نشانوں تک پہونچے۔ ہمارے ہوائی جہاز زمین کی سطح یا سمندر کی سطح سے صرف ۳۰ فٹ کی بلندی پر اڑے تاکہ مصری راڈر کی زد سے بچ جائیں نہ صرف مصری بلکہ اسرائیلیوں کو نہ روسی اور نہ امریکی راڈروں کا بھی خوف تھا۔

"جنگ کے دوران سارے راڈر پوری قوت سے کام کر رہے تھے۔ مصریوں کے چھ راڈر اسٹیشنوں کے علاوہ جو جزیرہ نما سینا کے لئے تھے اور بھی راڈر چاروں طرف سے گھور رہے تھے۔ امریکی چھٹے بحری بیڑے کے جہازوں کے علاوہ روسی بحری بیڑے کے جہاز بھی تھے قبرص کے اونچے پہاڑ سے برطانوی راڈر بھی نگرانی کر رہا تھا۔"

پیر کو سہ پہر تک اسرائیلی طیاروں نے مصر کے سولہ راڈروں کو جو سینا میں تھے اور دیگر ۷ راڈروں کو تباہ کر دیا تھا۔ اس طرح جملہ ۲۳ مصری راڈر تباہ ہو چکے تھے راڈروں کی کارگزاری میں مداخلت کے لئے اسرائیلیوں نے ای۔ سی۔ ایم کا استعمال بھی کیا۔

راڈروں کے خلاف اس موثر کارروائی کا پہلی بار دوسری جنگ عظیم میں آغاز ہوا تھا۔

شاہ حسین یکم جولائی کو نیویارک سے واپسی پر لندن بھی ٹھہرے تھے۔ اور بی بی سی ٹیلی ویژن پر ان کا انٹرویو بھی ہوا تھا۔ انہوں نے ای سی ایم کے استعمال کی توثیق کی تھی۔

اسرائیلی ہوائی جہازوں نے جب پہلا کامیاب حملہ کیا تو ہوائی جہازوں کی دوسری ٹکڑی حملے کے لیے آ رہی تھی۔ اور تیسری اسی وقت فضا میں بلند ہوئی ہر دس منٹ بعد یہ ٹکڑیاں فضا میں پہنچ رہی تھیں۔ چار طیاروں پر مشتمل ہر ٹکڑی کو اپنے اپنے نشانوں پر حملے کے لئے صرف سات منٹ کا وقت دیا گیا تھا اور تین منٹ اڑان کی غلطیوں کو ٹھیک کرنے کے لیے۔

ہوائی اڈوں سے اڑ کر حملہ کی کارروائی ختم کر کے ٹھکانوں پر واپس آنے تک انہیں صرف ساڑھے سترہ منٹ کا وقت دیا گیا تھا۔ اس طرح گویا پہلے حملے کے بعد دوسرا حملہ ایک گھنٹہ کے وقفہ سے ہوتا رہا۔ مصری فضائیہ کی مکمل تباہی کا سبب نہ صرف اچانک حملہ تھا بلکہ ایک بات یہ بھی تھی کہ اسرائیلیوں نے رن وے کی تباہی کے لیے خاص قسم کا بم بھی خود تیار کیا تھا۔ یہ بم نہ صرف رن وے کی مضبوط سطح میں جا کر دھنس جاتا تھا بلکہ وقفے وقفے سے پھٹتا بھی تھا۔ جس کی وجہ سے رن وے کی دوبارہ مرمت جو عام حالات میں آسان سمجھی جاتی ہے ناممکن ہو گئی تھی چنانچہ شاہ حسین نے نیلا بیٹ کے نامہ نگار کو انٹرویو دیتے ہوئے

کہا کہ وقفہ وقفہ سے پھٹنے والے بموں کی وجہ سے مرمت کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔

اس عجیب بم کی خصوصیت یہ ہے کہ ہوائی جہاز سے رن وے پر بہت نیچے آ کر گرتے ہیں حالانکہ دوسرے بموں کو اگر اس طرح گرایا جائے تو وہ اچھلتے ہیں اور نقصان معمولی سا ہوتا ہے۔

مصری ہوائی اڈوں پر ہوا مار توپیں چلائی جا رہی تھیں۔ لیکن اسرائیلیوں کی توقع کے خلاف وہ ہلکے قسم کی تھیں۔ اور ان کا نشانہ صحیح نہیں تھا۔ مصریوں نے زمین سے فضا میں مار کرنے والے روسی میزائیل الیس اے ۲ بھی خوب چلائے لیکن ایک بھی اسرائیلی نشانہ نہ بن سکا۔ جتنی بلندی پر اسرائیلی ہوائی جہاز اڑ رہے تھے، وہاں تک میزائیل پہنچ ہی نہ سکے۔ چونکہ یہ میزائیل آہستہ آہستہ اوپر کو جاتے ہیں۔ اس لیے ۴۰۰۰ فٹ سے نیچے کی بلندی کے لئے غیر موثر ہیں۔ ایک اسرائیلی ہوا باز نے اسے اپنے ہوائی جہاز کی طرف آتے دیکھا اس نے اپنے ہوائی جہاز کو اس کے قریب کر کے بلند کر لیا میزائیل نیچے سے گزر گیا۔

فضائی جنگ ۸۰ منٹ تک جاری رہی اور اسرائیلی فضائیہ نے مصر کے تمام ہوائی اڈے تباہ کر دیئے۔ دس منٹ کے وقفہ کے بعد اسرائیلیوں نے مزید ۸۰ منٹ تک حملے کئے۔ اس طرح کل دو گھنٹے ۵۰ منٹ کے فضائی حملوں کے بعد ہی انھوں نے جنگ جیت لی۔

مصری فوج کی کمر ٹوٹ چکی تھی۔ پیر کی صبح کو ۷ بجکر ۴۵ منٹ اور ۱۰ بجکر ۵ منٹ کے درمیان پہلے دو حملوں میں جن مصری ہوائی اڈوں پر حملے ہوئے ان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

العریش، بیر جفجفہ، بیر صمدا، جبل لبنیٰ، ابو سویر، ویلز سابئر، فعید، کبریت، المنصورہ، انچاس، انگامل، مغربی قاہرہ، حلوان، قاہرہ انٹرنیشنل (یہاں کے ہوائی جہازوں کو منتشر کرنے کے بعد) بنی سویف، المینا، لکسور، راس باناس اور غردقہ۔

اسرائیل کی فضائیہ کے تخمینہ کے مطابق اسرائیلی ہوائی جہازوں نے ۳۴۰ مصری طیاروں میں سے ۳۰۰ تباہ کر دیئے۔ ان میں مصری دو درجن ٹی یو ۱۶ بمبار بھی شامل تھے۔

صحرائے سینا کا بڑا ہوائی اڈہ العریش ایسا ہے جس کے رن وے تباہ نہیں کئے گئے کیونکہ اسرائیلیوں کا منصوبہ یہ تھا کہ اسے اگلی فوجی سپلائی اور مرنے اور زخمی ہونے والوں کو واپس بھیجنے کے لیے استعمال کیا جائے

یہ امر قابل ذکر ہے کہ مصر کے کئی ہوائی اڈوں پر کھڑے کئی طیارے اسرائیلی ہوائی جہازوں نے تباہ کر دیئے لیکن ان مصنوعی ہوائی جہازوں کو دھکا نہیں پہنچایا جو دھوکے کے لئے ٹین بنا کر کھڑے کئے گئے تھے۔ جب اس بارے میں ویزمین سے سوال کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ اسرائیلی سراغ رسانوں نے ہمیں صحیح اطلاع دی تھی ساتھ یہ بھی کہا کہ ابو سویر کے ہوائی اڈہ پر جو اسمٰعیلیہ کے قریب ہے، حقیقی اور مصنوعی دونوں قسم کے ہوائی جہازوں کو تباہ کیا گیا۔

جنرل ہاڈ نے بتایا کہ ہم مصری فضائیہ کی کمر توڑ نے کے بعد، اردن، شام اور عراق کی ہوائی فوج سے نمٹنے کے لئے تیار تھے۔ پیر کی دوپہر کو ان ملکوں کے ہوائی جہازوں نے سمندری تفریحی مقام دنت یانا پر بمباری کی اور کیفر سرکن کے اسرائیلی ہوائی اڈے پر جو اردن کی سرحد پر ہے، حملے کئے۔

لیکن اس وقت تک اسرائیلیوں نے مصری فضائیہ کا کام تمام کر دیا تھا۔ اور نئے حملہ آوروں سے نمٹنے کے لئے تیار تھے۔ چنانچہ شام اور اردن کی طاقت کا خاتمہ ۲۵ منٹ میں کر دیا گیا۔

پیر کو شام سے پہلے پہلے اسرائیلی ہوائی جہاز ۲۳ تباہ شدہ ہوائی اڈے دیکھنے کے لیے پھر گئے تھے۔ اور وقفہ وقفہ سے پھٹنے والے بم گرا کر آئے تھے تاکہ رن وے کی مرمت نہ ہو سکے۔ یہی نہیں بلکہ ساری رات وہ بمباری کرتے رہے۔

۵ رجون کی نصف شب گذرنے پر ۷ رجون کو اسرائیلیوں نے مصری نقصانات کا جائزہ لیا جس کی رو سے ۴۱۶ ہوائی جہاز برباد کیے گئے۔ جن میں سے ۳۹۳ طیارے زمین ہی پر تباہ کئے گئے۔ متحدہ عرب فوج کے مجموعی نقصانات کا اندازہ کیا گیا تو دو دن میں ۵۰ کروڑ ڈالر کی الیت کے ہوائی جہاز تباہ ہو چکے تھے۔ صرف طیارے ہی نہیں بلکہ زمین پر نصب کئے ہوئے مختلف آلات اور مصر کے ۲۳ راڈر بھی تباہ کاری کا نشانہ بنے۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ فضائی جنگ میں مصر کے ۲۵۰ ہوا بازوں میں سے ۱۰۰ مارے گئے۔

بقیہ... اور آگ برستی رہی

فلسطین آج آنسوؤں اور آہوں کی سرزمین ہے۔ آنسو جو پلکوں پر آکر خشک ہو جاتے ہیں اور آہیں جو سینوں کے اندر ہی گھٹ کر دم توڑ دیتی ہیں۔ بوڑھے جوان عورتیں اور بچے سب اذیت ناک کرب میں مبتلا ہیں۔ ہزیمت نے ان کے اندر تلخیاں بھر دی ہیں۔ ان کے لیے زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ ایک اردنی صحافی بوڑھی دادی کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ ہزیمت کی خبر خاتون کو مل چکی ہے اس کی بے نور آنکھوں میں آنسو تیر رہے ہیں۔ وہ دیر تک خاموش رہتی ہے پھر پوتے سے کہتی ہے:

"بیٹے! میں نے اپنی زندگی میں ترکیہ کی جنگ دیکھی، دوسری عالمگیر جنگ دیکھی فلسطین میں پچھلے چالیس سال میں جتنے انقلابات آئے اور ہنگامے ہوئے انھیں بھی دیکھا اپنی ساری زندگی میں، میں نے کبھی موت کی تمنا نہیں کی۔ . . . لیکن آج جی چاہتا ہے کہ زمین پھٹے اور اس میں سما جاؤں — اے کاش آج سے پہلے مجھے موت آگئی . . . "

ان پڑھ مگر حساس بڑھیا خاموش ہو جاتی ہے اس کی بے نور آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگتے ہیں۔ صحافی یوں محسوس کرتا ہے جیسے پورے عالم عرب کے آنسو بہہ نکلے ہیں۔

... اور آگ برستی رہی

بیروت کے ہفت روزہ "الجمہوریہ الجدیدہ" کا نامہ نگار جنگ بندی کے بعد چھپ کر مقبوضہ عرب علاقے میں گیا۔ اس نے وہاں جو کچھ دیکھا اور سنا اور عربوں پر کیا گزری، اس کا اندازہ اس مضمون سے کیا جا سکتا ہے۔

مشرقِ وسطیٰ کے سیاسی افق پر جو تیرہ و تار بادل پچھلے ڈیڑھ دو ماہ سے منڈلا رہے تھے ۵ جون کی صبح کو اچانک برس پڑے۔ فلسطین آگ اور خون کے سمندر میں ڈوب گیا۔ ۱۹۴۸ء کے بعد یہ دوسرا بڑا زخم تھا جو عالمِ عرب کو لگا۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ۲۷ لاکھ یہودیوں سے گیارہ کروڑ عرب شکست کھا جائیں گے۔ عرب عوام کے لیے تو یہ ایک سخت ہوش رُبا ناگہانی ضرب تھی۔ ہر شخص دم بخود ہو کر رہ گیا۔ آج پانچ ہفتے بعد بھی القدس میں، بیت لحم میں، رام اللہ میں، نابلس میں، غزہ میں، غرض شہر شہر گلی گلی اور گھر گھر میں لوگ حیران و مضطرب پوچھ رہے ہیں — یہ کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ وہ اپنے مقدس مقامات پر اسرائیلی پرچم لہراتا دیکھتے ہیں تو انھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا۔ رہ رہ کر یہی سوال ان کی زبان پر آجاتا ہے یہ کیسے ہوا؟ اور کیوں ہوا؟ غم و الم کا پہاڑ ان پر ٹوٹ پڑا ہے وہ رونا چاہتے ہیں مگر آنکھوں کے سوتے خشک ہو گئے ہیں وہ گلی کوچوں اور بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں مگر صامت خاموش جیسے قوتِ گویائی ان سے چھِن گئی ہے، مل کر بیٹھتے ہیں تو بھی چپ چاپ، کوئی بات کرتے ہیں تو اسی اندازِ خاموشی میں۔ اسرائیلی فوجی جب پاس سے گذرتے ہیں تو ایک عجیب کیفیت ان پر طاری ہو جاتی ہے ان کی آنکھوں میں مایوسی کی پرچھائیاں اور گہری ہو جاتی ہیں۔

وہ چار جون کی رات کو آزاد سوئے تھے زندگی کے ولولوں سے سرمست ۵ جون کو اٹھے تو دشمن ان پر شبخون مار چکا تھا — اور پھر تین دن کے اندر اندر زمین و آسمان بدل گئے تین دن پہلے یہودی بے یقینی کی کیفیت سے دوچار تھے۔ جن حوصلوں کے ساتھ انھوں نے اسرائیل میں زندگی کا آغاز کیا تھا وہ پست ہو چکے تھے۔ خوشنما امیدیں دم توڑ چلی تھیں، اس سے

پوری زندگی متاثر ہو رہی تھی۔ اقتصادی ترقی کی رفتار رک گئی تھی، بیرونی ملکوں کے یہودیوں نے امداد میں کمی کر دی تھی یہودی آباد ہونے کے لیے اسرائیل کا رخ کرنے سے ہچکچانے لگتے تھے ۱۹۴۹ء میں ۲۳۹۴۲۴ یہودی اسرائیل آئے تھے ۱۹۶۶ء میں یہ تعداد صرف ۱۲ ہزار رہ گئی۔ اس کے برعکس اسرائیل چھوڑنے والے یہودیوں میں اضافہ ہو گیا ۱۹۶۶ء میں گیارہ ہزار یہودی بوریا بستر باندھ کر اسرائیل سے چلے گئے تھے۔ اکثر یہودی دانشور غزہ کے علاقے میں داخل ہوتے عربوں کا دروازہ کھٹکھٹاتے ان سے وعدہ لیتے کہ عرب فوجوں کے حملے کی صورت میں وہ انھیں اپنے ہاں پناہ دیں گے —
۵ جون کا سورج طلوع ہوا تو معاملہ الٹ ہو چکا تھا۔ اب عرب یہودیوں کی حمایت اور تائید کے محتاج تھے۔ یہودیوں میں اضطراب کی جگہ اطمینان نے لے لی تھی۔

عرب گلی کوچوں میں اب بھی چلتے پھرتے نظر آتے ہیں مگر سحر زدہ انسانوں کی طرح کھوئے کھوئے گم سم وہ اکثر سوچتے ہیں دشمن سے طاقتور ہونے کے دعوے محض افسانہ تھے؟ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہے تھے۔ ان کے کانوں میں اپنے رہنماؤں کی پرجوش تقریریں اور ہوا کی لہروں سے کھیلتے ہوئے رجزیہ نغمے گونجنے لگتے ہیں وہ چند لمحات کے لیے ان تقریروں اور نغموں میں کھو جاتے ہیں لیکن جلد ہی تلخ حقیقت انہیں جھنجوڑ کر اس خیالی دنیا سے نکال لاتی ہے۔ ان کے ذہن کی تختی پر پھر سوچوں کے دائرے ابھرنے لگتے ہیں یہ دائرے رفتہ رفتہ پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی سوچ بچار کی قوت بالکل جواب دے جاتی ہے۔

رات گویا رحمت کا پیغام لے کر آتی ہے چاروں طرف لہراتے ہوئے اسرائیلی پرچم چند گھنٹوں کے لیے ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں وہ سب ریڈیو کے گرد بیٹھ جاتے ہیں اور کان اسی کی آواز پر لگا دیتے ہیں شاید کوئی خبر آ جائے . . . شک و ریب اور مصلحتوں سے پاک، یقین افروز خبر . . . جو انہیں بتائے کہ جنگ دوبارہ شروع ہو گئی ہے . . . یا پھر . . . "اے لوگو! اب کبھی جنگ نہیں ہو گی"

ریڈیو کی لہروں پر ابھرتے ہوئے نغمے بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کے دل جوش و جذبات سے تہی ہو چکے ہیں۔ شجاعت کی آگ سرد پڑ چکی ہے . . . . اور اس آگ کو پھر سے بھڑکانے کا شوق و جذبہ بھی جاتا رہا ہے —

ریڈیو کی سوئی اسرائیلی اسٹیشن پر آ کر رکتی ہے اور وہ "سنیے، حاکموں" کے ریڈیو سٹیشن پر کان لگا دیتے ہیں . . . . احکام صادر ہو رہے ہیں احکام، مختلف امور کے بارے میں۔

— تم کہاں جا سکتے ہو اور کہاں نہیں؟

— دینار چلیں گے یا اسرائیلی پونڈ؟

— موٹروں میں سفر کر سکتے ہو یا نہیں؟

— روٹی اور بچوں کے لیے دودھ ملے گا یا نہیں؟
— کیا اپنے عزیزوں کی خیر و عافیت دریافت کرنے کے لیے برقی تار بھیجے جا سکتے ہیں؟

احکام ختم ہوتے ہیں، تو لوگ ریڈیو بند کر کے باتوں میں لگ جاتے ہیں۔

باتیں ... لاشوں کی باتیں جن سے ملحقہ سڑکیں اور میدان پٹے ہوتے ہیں۔ ان لاشوں کا تذکرہ ہر جگہ ہو رہا ہے۔ بیت لحم میں، القدس میں، رام اللہ میں، نابلس میں، الخلیل میں ہر جگہ ہر شہر میں ان کا ذکر ہے۔

القدس میں کتنے لوگ مارے گئے؟

کون کون مارے گئے؟

کیسے مارے گئے؟

ہر جگہ لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں۔

راستے بند پڑے ہیں۔ بس اکا دکا لوگ آجا رہے ہیں اور خبریں انہی کے ذریعے ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل ہو رہی ہیں خبریں کہتی ہیں، القدس کے گلی کوچے لاشوں سے پٹے پڑے ہیں، انہیں دفن کرنے والا کوئی نہیں ... لاشیں گل سڑ رہی ہیں، ان کی بدبو اور سڑاند فضا میں پھیل رہی ہے گدھ اور مردار خور جانور انہیں نوچ رہے ہیں۔ لاشیں دفن کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے ملک کا دفاع کرتے ہوئے جان دی ہے اسرائیلی چاہتے ہیں کہ دوسرے لوگ ان سے عبرت پکڑیں اور اگر اپنے وطن کو ان کے چنگل سے چھڑانے کا کوئی خیال اب بھی ان کے دماغ میں باقی ہے تو اسے نکال دیں چنانچہ انھوں نے ان لاشوں کو کھلے میدان میں دھوپ سے گلنے سڑنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔

راہگیر چلتے چلتے رک جاتے ہیں۔ ایک نظر بکھری ہوئی گلی سڑی لاشوں پر ڈالتے ہیں، کچھ دیر مرنے والوں پر اشک فشانی کرتے ہیں اور پھر رومال سے چہرہ ڈھانپ کر آگے چل پڑتے ہیں۔

پھر وہی سوال ان کی زبان پر آجاتا ہے، یہ کیا ہوا، کیسے ہوا؟

باتیں پھر ہونے لگتی ہیں... باتیں سرفروشی اور شجاعت کی باتیں۔ شکست کا رد عمل بے شک بڑا سخت ہوا ہے۔ کل جن دلوں میں ولولے پل رہے تھے آج وہ مایوسی اور حسرت و اندوہ کی گہرائیوں میں ڈوب چکے ہیں مگر اس حسرت و مایوسی کے باوجود وہ شرمسار نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنی جبیں پر بزدلی اور دشمن کے مقابلے میں فرار کا رسوا کن داغ لگنے نہیں دیا۔ اردن کی افواج اور اس کے عوام ڈٹ کر لڑے ہیں۔ انھوں نے ایک ایک شہر ایک ایک گاؤں اور القدس میں تو ایک ایک انچ کے لیے جنگ کی ہے۔ دشمن ان کی لاشوں ہی پر سے گذر سکا ہے انھوں نے سرفروشی اور شجاعت کی بہت سی داستانیں تاریخ کے سپرد کی ہیں۔ داستانیں جنہیں آنے والی نسلیں اپنی چوپالوں، قہوہ خانوں اور نغموں میں فخر سے

دہرائیں گی ۔ جاں سپاری اور شوقِ شہادت کی ان داستانوں کا جب ذکر چھڑتا ہے تو پھر یہ سوال ذہنوں میں کلبلانے لگتا ہے کہ یہ سب کچھ کیوں اور کیسے ہوا؟

"اگر فضائی تحفظ مل جاتا تو ہم شکست نہ کھاتے"

ایک کونے سے دبی دبی غم آلود آواز بلند ہوتی ہے ۔

فضائی تحفظ ؟ فضائی تحفظ . . . وہ قاہرہ کی طرف دیکھتے رہے ، مگر قاہرہ فضائی تحفظ نہ دے سکا ۔ وہ تو خود طلوعِ سحر سے پہلے فضائی تحفظ سے محروم ہو چکا تھا ۔ حقیقتِ حال سے بے خبر اردنیوں کی نگاہیں قاہرہ پر مرکوز ہیں ۔ فضا سے اسرائیلی طیارے آگ برساتے رہے زمین سے ان کی توپیں شعلے اگلتی رہیں اردن کے بہادر لوگ آگ کے بھڑکتے ہوئے جہنم میں محصور لڑتے رہے ۔

ان داستانوں میں سب سے نمایاں داستان شاہ حسین کی ہے ۔

۵ ؍ جون کی صبح کا سورج ابھی طلوع نہیں ہوا شاہ حسین کو خبر ملتی ہے اسرائیل نے مصر پر حملہ کر دیا ہے ۔ وہ پچھلے کئی روز سے مضطرب ہیں ۔ ان کے ذرائع نے خبر دی ہے کہ اسرائیل عربوں پر ۵ اور ۸ ؍ جون کے درمیان کسی وقت بھی حملہ کر دے گا ۔ شاہ یہ خبر قاہرہ کو دیتے ہیں مگر قاہرہ مطمئن اور پُرسکون ہے اسے امریکہ اور روس دونوں نے اطمینان دلایا ہے کہ عربوں نے پہل نہ کی تو اسرائیل حملہ نہیں کرے گا ۔ قاہرہ مطمئن رہتا ہے ۔ اور اسرائیل دس سال پہلے کی طرح جارحانہ حملہ کر دیتا ہے ۔ سورج نکلنے سے پہلے مصر کی فضائی قوت تباہ ہو جاتی ہے حملے کی خبر سنتے ہی شاہ حسین بھی اعلانِ جنگ کر دیتے ہیں ۔ حسین اور جنگ میں شرکت کسی کو یقین نہیں آتا ۔ پروپیگنڈے کے دھوئیں نے ان کا چہرہ سیاہ کر دیا ہے ۔ جو بھی سنتا ہے حیرت زدہ ہو کر رہ جاتا ہے اس سے بڑھ کر حیران کن بات یہ کہ شاہ حسین جنگ کے محاذ پر صفِ اول میں پہنچ جاتے ہیں ۔ وہ اپنی افواج کے دوش بدوش لڑتے ہیں ۔ کبھی ایک محاذ پر جاتے ہیں کبھی دوسرے محاذ پر دشمن کے گولے ان کے گرد و پیش گرتے اور پھٹتے ہیں مگر وہ اپنے مورچوں سے نہیں ہٹتے ۔ اسرائیل کے ٹینک آگ اگلتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں شاہ ان کی زد میں آجاتے ہیں ۔ لیکن وہ اپنے مورچے میں جمے رہتے ہیں ان کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے فوجی افسر ہر چند کہتے ہیں کہ شاہ پہلی دفاعی لائن چھوڑ کر پیچھے چلے جائیں ۔ مگر وہ انکار کر دیتے ہیں ۔ میں بھی دوسرے فوجیوں کی طرح ایک فوجی ہوں میں آخر دم تک ان کے ساتھ رہوں گا ۔ دشمن سر پر پہنچ جاتا ہے ۔ شاہ دشمن کو پیٹھ دکھانے کے بجائے مر جانے کا فیصلہ کر چکے ہیں ۔ ٹینک سے نکلا ہوا ایک گولہ عین ان کے مورچے کے قریب پھٹتا ہے ۔ ایک فوجی افسر جست لگا کر سینہ سپر ہو جاتا ہے ۔ بڑھتے ہوئے خطرے کے پیشِ نظر فوجی افسر انہیں زبردستی مورچے سے نکال لے

ہیں، اور پچھلی صفوں میں فوجی ہیڈ کوارٹر میں لے جاتے ہیں۔ اس سارے عرصے میں وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوتے۔ محاذ پر لڑنے والی فوجوں سے رابطہ برقرار رکھتے ہیں اور عمان اس وقت لوٹتے ہیں جب جنگ بالکل بند ہو جاتی ہے۔

شاہ حسین کی بہادری اور دلیری کے ساتھ ساتھ اردن کی بری اور فضائی جوانوں کی شجاعت کے کارنامے بھی لوگوں کی زبان پر ہیں۔ ایک بہادر ہواباز اسرائیل کے حملے کے دوران میں دشمن کے پانچ طیارے گراتا ہے چھٹی مرتبہ خود اس کا اپنا طیارہ گر جاتا ہے۔ ہواباز فوراً پیراشوٹ کے ذریعے کود جاتا ہے۔ زمین پر پہنچتے ہی وہ روپوش ہو جاتا ہے رات کے وقت پناہ گاہ سے نکلتا ہے اور اردن کی طرف چل کھڑا ہوتا ہے، وہ اپنے ہیڈ کوارٹر پہنچتا ہے اور پھر فضائی مہم پر روانہ ہو جاتا ہے۔

ایک فوجی محاذ جنگ سے گھر پہنچتا ہے اس کی آنکھیں سرخ ہیں اور چہرہ اُترا ہوا۔ لوگ اس سے جنگ کا حال پوچھتے ہیں۔

"میرے سب ساتھی شہید ہو گئے"، وہ جواب دیتا ہے۔ وہ سب کے سب اپنے مورچوں میں ۔ ۔ ۔ بس میں اکیلا بچا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں برابر تیس گھنٹے تک اپنے مورچے میں دشمن پر گولے برساتا رہا ۔ ۔ ۔ اس عرصے میں نہ تو میں سویا اور نہ پانی کا ایک گھونٹ ہی میرے حلق میں گیا ۔ ۔ ۔ ۔ طیارے ہمارے سر پر آگ برسا رہے تھے اور سامنے سے توپیں آگ اگل رہی تھیں دنیا ایک جہنم نظر آتی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
ایک مرتبہ دن بھر کی گولہ باری کے بعد توپیں خاموش ہو گئیں تقریباً پانچ منٹ کے لیے میں نے اپنے مورچے سے سر اٹھا کر دیکھا ہر طرف دھواں اور آگ تھی۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو آواز دی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مصطفےٰ، علی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نزار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سہیل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
کوئی جواب نہ ملا۔

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور نظر دوڑائی پاس کے مورچے میں علی خون میں لت پت پڑا تھا ۔ ۔ ۔ مصطفےٰ کا سر دھڑ سے الگ ہو چکا تھا۔ ۔ ۔ ۔
وہ سب اپنے دین و وطن پر قربان ہو چکے تھے میرے سوا کوئی بھی زندہ نہ بچا۔ ۔ ۔ ۔

ٹینک کی آواز قریب تر آتی جا رہی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ وہ تھوڑی دور رہ گیا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے اپنی گن کی طرف دیکھا اب ایک گولی بھی باقی نہ رہی تھی۔ میں پہلی مرتبہ اپنے مورچے سے باہر نکلا اپنے ساتھیوں کو چھوڑا اور چلا آیا۔

ایک اور فوجی نے تو مورچہ بھی نہ چھوڑا۔

وہ ایک پہاڑی پر مورچے میں تنہا ڈٹا رہا اسکے ساتھی ایک ایک کر کے شہید ہو گئے ۔ ۔ ۔ صرف وہی باقی رہ گیا۔ بمبار طیارے آئے تو وہ طیارہ شکن توپ سے گولے پھینکتا وہ بھاگ کھڑے ہوتے تو گن سنبھال لیتا۔ پورے تین گھنٹے وہ اکیلا دشمن کا مقابلہ کرتا رہا۔ آخر چھاتا فوج کے ایک سو اسرائیلی جوان فضا سے اترے اور پہاڑی کو گھیر لیا۔ اب وہ پوزیشن

ایسی شجاع بہادر فوج کیوں کر شکست کھا گئی

جو بھی ان واقعات کو سنتا ہے حیران ہو کر یہی پوچھتا ہے ...... حیرت اس پر ہے کہ ان لوگوں نے دفاعی تحفظ کے بغیر بھڑکتے ہوئے دوزخ میں گھر کر دشمن کا مقابلہ کیسے کر لیا؟

اردن، سعودی عرب اور اسرائیل کے مقبوضہ اردنی علاقے کے ہسپتال زخمیوں سے بھرے ہوئے ہیں زخمیوں میں زیادہ تر آگ سے جھلسے ہوئے لوگ ہیں آگ جو نیپام بموں سے بھڑکی جس سے سارا محاذ کرۂ نار بن گیا۔

نیپام بم کیا چیز ہے؟ کوئلے کی طرح جلے ہوئے

لے کر پہاڑی پر چڑھنے لگے اس نے فائرنگ شروع کر دی پہاڑی پر پہنچتے پہنچتے آدھے یہودی ختم ہو چکے تھے۔ مورچے کو گھیرے میں لے کر یہودیوں نے حکم دیا کہ وہ باہر نکل آئے اور ہتھیار ڈال دے۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا پچاس فوجی سنگینیں تانے بڑھے چلے آتے تھے اس کے پاس ایمونیشن ختم ہو چکا تھا۔ وہ اٹھا مورچے سے نکلا اور خالی گن لیے یہودیوں کی طرف دوڑا۔ اچانک گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی اور وہ چھلنی چھلنی ہو کر گر پڑا۔

اس بہادر اردنی کی داستان خود اسرائیلی فوجیوں نے سنائی۔

جسموں اور چہروں کو دیکھ کر بھی اس ہولناک ہتھیار کا ٹھیک ٹھیک تصور نہیں کیا جا سکتا۔

ایک صحافی نے نیپام بموں کو آسمان سے برستے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا اس کا بیان سن کر انسان لرز اٹھتا ہے:

"جون کی ۷ تاریخ تھی اردنی فوج بیت لحم اور القدس کے درمیان، دیر مار الیاس کے علاقے میں اسرائیلیوں سے نبرد آزما تھی۔ قلت تعداد کے باوجود اس نے دشمن کو سخت نقصان پہنچایا تھا۔ میں چند فرلانگ کے فاصلے پر ایک اونچی منزل میں کھڑا تھا۔ اچانک طیاروں کی گڑگڑاہٹ سے فضا گونج اٹھی۔ دور آسمان پر شب دیجور کی طرح کالے سیاہ طیارے جھپٹتے ہوئے نظر آئے۔ چشم زدن میں وہ قریب پہنچ گئے۔ اور بمباری کرنے لگے لیکن مجھے بم گرنے کی کوئی آواز سنائی نہ دی چند لمحے بعد ایک پہاڑ کو آگ لگ گئی اور اردنی فوج اس آگ کی لپیٹ میں آگئی۔ اب اس کیلئے ہتھیار ڈالنے یا بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا اردنی سپاہی اس جہنم سے نکلے تو اسرائیلیوں نے ان پر گولہ باری شروع کر دی۔

دو روز کے بعد میں بیت لحم کے شفاخانہ ملک حسین میں گیا وہاں تین فوجی سپاہیوں کو دیکھا جو اس ہولناک تباہی سے زندہ بچ نکلے تھے ان کا رنگ کوئلے کی طرح سیاہ ہو چکا تھا۔ ایک کی آنکھ جاتی رہی تھی اور دوسرے کے ہاتھ بیکار ہو گئے تھے جس پہاڑ پہ نیپام بم برسائے گئے وہ بھی جل کر کوئلہ ہو گیا۔

وہ ایک سرسبز و شاداب پہاڑ، مگر اب سبزہ کا نام و نشان تک نہ تھا۔"

القدس ۔۔۔ پیغمبروں کی سرزمین ۔۔

۔۔۔۔ امت مسلمہ کا قبلہ اول ۔۔۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر معراج کی پہلی منزل ۔۔۔ وہ سرزمین جس کے ذرے ذرے پر تیرہ صدیوں کی اسلامی تاریخ کے نقوش ثبت ہیں ۔۔۔

اس مقدس شہر پہ کیا گذری؟ یہ داستان ہر شخص کی زبان پر ہے جسے وہ اشکبار آنکھوں کے ساتھ سناتا ہے ——

سپیدۂ سحر نمودار ہو چلا ہے القدس کے باشندوں نے پچھلی دو راتیں آنکھوں میں کاٹی ہیں نوجوان ہاتھوں میں خنجر، لاٹھیاں، تلواریں اور بندوقیں لیے گلی کوچوں کے ناکوں پر پہرہ دے رہے ہیں اردن اور عراق کی فوجوں کی مزاحمت دم توڑتی جارہی ہے ۔ دشمن آگے بڑھ رہا ہے ، ۷ جون کی صبح پیغمبروں کی سرزمین پر طلوع ہو رہی ہے ، خون میں نہائی ہوئی صبح اچانک مسجد اقصیٰ کے مینار سے اذان کی آواز گونجتی ہے اسی مینار سے موذن اہل ایمان کو صدیوں سے بلاوا دیتے آئے ہیں "آؤ نماز کی طرف دوڑو فلاح و کامرانی کی طرف" لیکن آج موذن کی پکار بے پناہ درد و اضطراب میں ڈوبی ہوئی ہے ۔ خون کے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی پکار کا ایک ایک لفظ دلوں پر قیامت ڈھا رہا ہے ۔ اب موذن کی آواز سسکیوں میں تبدیل ہو گئی ہے اور جب وہ کہتا ہے حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ " (نماز کی طرف دوڑو) تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے اس کی ہچکیاں لاؤڈ سپیکر پر گونج رہی ہیں ۔ ان ہچکیوں کی آواز جہاں تک پہنچتی ہے لوگ رونے لگتے ہیں ۔ آج انہیں محسوس ہوا ہے کہ موذن انہیں فوز و فلاح کی کس راہ کی طرف بلاتا رہا ہے اور وہ اس سے کس طرح اعراض کرتے رہے ہیں ۔ آج یہ اس کی آخری پکار تھی ۔ جو بیت المقدس کی فضا میں گونج رہی تھی تقریباً پونے ۹ سو برس پہلے بھی القدس پر ایک دور ایسا آیا تھا جب اس فضا اذان سے محروم رہی یہ عرصہ پورے ۹۰ برس پر محیط تھا مسلمانوں کو اس عرصے میں بے انتہا قربانیاں دینی پڑیں تب کہیں صلاح الدین ایوبی کی قیادت میں وہ اس مقدس شہر اور اس کے مقدس مقامات کو غاصبوں کے چنگل سے نجات دلانے میں کامیاب ہو سکے ۔

اب یہ فضا پھر اس پکار سے کتنی مدت محروم رہے گی؟ اور اس پاک سرزمین کو غاصب یہودیوں کے چنگل سے چھڑانے کے لیے عالم اسلام کو کتنا خون دینا پڑے گا ۔

اردنی فوجوں کی قوت مزاحمت ختم ہو چکی ہے اکثر سپاہی اپنی جانیں نچھاور کر چکے ہیں باقی پیچھے ہٹ آئے ہیں ۔ گاہے گاہے گولہ باری کی آواز اب بھی آجاتی ہے یہودی فوجوں نے بیت المقدس کو گھیر لیا ہے ۔ شہریوں کی زبردست مزاحمت کے بعد ان کے دو دستے سینٹ سٹیفن گیٹ اور دمشق گیٹ سے شہر میں داخل ہو گئے ہیں اور وسط شہر کی طرف بڑھ رہے ہیں مسلمان قدم قدم پر ان کی مزاحمت کرتے ہیں ۔ بالاخانوں اور کھڑکیوں سے گولیاں برس رہی ہیں ۔ اسرائیلی ٹینک گنوں اور مارٹر

توپوں کے منہ کھول دیتے ہیں دو گھنٹے کے اندر اندر شہریوں کی یہ مزاحمت دم توڑ دیتی ہے القدس پر قیامت گذر گئی ہے گلی کوچوں میں ہر طرف لاشیں بکھری ہوئی ہیں گھروں اور ہسپتال میں لاشوں کے انبار لگے ہیں۔

نزارہ کے مشن ہسپتال میں غیر ملکی رپورٹر ایک امریکی رپورٹر کی لاش لینے پہنچے ... کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کمرے میں دیواروں کے ساتھ ساتھ فرش سے چھت تک لاشوں کے انبار لگے ہیں ہسپتال کا بوڑھا پادری کہتا ہے:

"تم ایک شخص کی لاش لینے آئے ہو۔ ہمارے پاس تو بے شمار لاشیں ہیں ... تمہیں بس ایک لاش کی فکر ہے اور بھی لو نہ .. ... یہ کہہ کر وہ فرش پر لگے ہوئے ایک ڈھیر پر سے کمبل ہٹا دیتا ہے گڑیوں کی طرح چھوٹے چھوٹے اردنی بچوں کے خون میں لت پت ٹوٹے پھوٹے ڈھانچے بڑا ہی دردناک منظر پیش کر رہے ہیں ان بچوں کے درمیان ایک اردنی خاتون ہاتھ پھیلائے اس طرح پڑی ہے جیسے وہ انہیں آسمان سے برستی ہوئی آگ سے بچانے کی کوشش کر رہی ہو۔

دشمن نے ہزاروں لاشوں پر سے گذر کر القدس فتح کر لیا ہے۔ جو لوگ بچ گئے ہیں ان میں سے اکثر زخموں سے چور ہیں مگر ان کے دل اب بھی غیر مفتوح ہیں جگہ جگہ کمین گاہیں قائم ہیں جہاں سے اسرائیلیوں پر گاہے بگاہے فائرنگ ہوتی رہتی ہے۔ اسرائیلی شہر پر قابض ہونے کے باوجود اپنے آپ کو محصور تصور سمجھتے ہیں۔ سر فروش نوجوان کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ اسرائیلی آچکے ہیں اپنے ایک ایک زخمی اور مرنے والے کا انتقام دس دس بارہ بارہ اردنیوں سے لیتے ہیں، مگر حملوں کے واقعات میں کمی آنے نہیں پاتی۔ تحریک مزاحمت کے نوجوان ڈھونڈ ڈھونڈ کر گرفتار کیے جا رہے ہیں۔

یہودی فوج ایک نوجوان یوسف قمر کی تلاش میں ہے۔ ایک دستہ ایک دو منزلہ مکان کو گھیر لیتا ہے فوجی افسر دروازہ پر دستک دیتا ہے ایک بوڑھا عرب دروازہ کھولتا ہے۔ اسرائیلی دندناتے اندر گھس جاتے ہیں مکان کا کونا کونا چھانتے ہیں اور یوسف قمر کو ڈھونڈ نکالتے ہیں۔

فوجی گاڑی اسے لے کر روانہ ہو جاتی ہے۔ یوسف قمر ہتھکڑی پہنے درمیان میں ہے اور اس کے دائیں بائیں آگے پیچھے اسرائیلی فوجی رائفلوں پہ سنگینیں چڑھائے بیٹھے ہیں دور ایک دو منزلہ مکان سے آل معلمی کا ایک نوجوان کھڑا یہ منظر دیکھ رہا ہے معلمی یوسف قمر کا بچپن کا دوست ہے دونوں سکول میں ایک ساتھ پڑھتے رہے ہیں۔ دونوں القدس کی فضا میں ایک ساتھ پروان چڑھے ہیں اور دونوں یہودیوں کے ساتھ لڑے جانے والے معرکوں میں دوش بدوش حصہ لیتے رہے ہیں۔ معلمی کے ہاتھ میں دستی بم ہے۔ بم کا پن اس نے نکال دیا ہے وہ چاہتا ہے کہ آنے والی فوجی گاڑی پر دے مارے مگر یوسف قمر کو دیکھ کر رک

جاتا ہے اس کا دماغ کہتا ہے: "بم مارو" لیکن دل آڑے آجاتا ہے بچپن کا ساتھی مارا جائے گا ... ...

گاڑی قریب تر آتی جارہی ہے معلمی فرض اور محبت کی کشمکش میں مبتلا ہے اب اسرائیلی یوسف قمر کو لیے بالکل قریب پہنچ جاتے ہیں یوسف کی نگاہیں بے اختیار اپنے دوست کے مکان کی طرف اٹھ جاتی ہیں وہ دیکھتا ہے کہ معلمی کھڑکی میں کھڑا ہے اور بم اس کے ہاتھ میں ہے فوراً سمجھ جاتا ہے کہ معلمی کس کشمکش میں ہے وہ اشارے سے کہتا ہے۔

"ہچکچاؤ مت .... بم پھینک دو ..... میری پرواہ مت کرو!"

معلمی انکار کر دیتا ہے۔ فوجی گاڑی اب کھڑکی کے عین نیچے پہنچ گئی ہے اسرائیلی یوسف قمر کے آنکھوں کے اشارے سے چوکنے ہو جاتے ہیں۔ ان کی نگاہیں اوپر اٹھتی ہیں اور وہ معلمی کو ہاتھ میں بم لیے دیکھ لیتے ہیں۔

ایک فوجی اپنی بندوق جھپٹتا ہے، مگر ابھی وہ گھوڑا دبانے بھی نہیں پاتا کہ معلمی بم دے مارتا ہے۔ بم ایک خوفناک دھماکے کے ساتھ پھٹتا ہے فوجی گاڑی اور اس میں سوار سب لوگوں کے پرخچے اڑ جاتے ہیں۔

معلمی کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں، مگر اپنے دوست کی موت پر آنسو بہانے کا وقت کہاں ہے ... ... چند لمحے بعد فوج کی زبردست جمعیت بلڈوزر لے کر پہنچ جاتی ہے معلمی کا مکان مسمار کیا جارہا ہے۔ مکینوں کو باہر نکلنے کی مہلت بھی نہیں دی گئی۔ مکان اپنے مکینوں سمیت زمین کے برابر کر دیا جاتا ہے جو لوگ مکان کے ملبے تلے زندہ دفن ہو گئے ہیں ان میں ایک بچہ بھی ہے جو صرف تیس دن پہلے پیدا ہوا تھا۔

القدس میں کئی روز سے قتل و غارت کا سلسلہ جاری ہے اسرائیلیوں کے ہاتھ سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔ بوڑھے نہ جوان نہ بچے عورتیں اپنے گوہر عصمت سے محروم کی جا چکی ہیں۔ بوڑھوں کو گھروں سے ہانک کر لے جاتے ہیں اور ان سے دھوپ میں دوڑ لگواتے ہیں یہ سب کچھ اسرائیلی فوج کے اعلیٰ افسروں کے سامنے ہو رہا ہے بعض غیر ملکی نامہ نگار اسرائیلی فوجیوں کی چیرہ دستیوں کا ذکر جب اسرائیلی ہائی کمان سے کرتے ہیں تو انہیں جواب ملتا ہے: "آخر ہمارے فوجی انسان ہی تو ہیں" یہ انسان وہ سب کچھ کر رہے ہیں جن کا مجرم یہودی نازیوں کو گردانتے ہیں۔

رات کے وقت کرفیو لگا دیا جاتا ہے۔ کوئی شخص اپنے گھر سے نکل نہیں سکتا۔ اس دوران میں یہودی فوجی دکانوں کے دروازے توڑ کر گھس جاتے ہیں اور جو چیز بھی ہاتھ لگتی ہے فوجی گاڑیوں میں لاد کر لے جاتے ہیں کھانے پینے کی اشیا تو بالکل نہیں چھوڑتے عبادت گاہوں کی حرمت، کی نظر میں سرے سے ہے ہی نہیں۔ بیت لحم کی مسجدوں اور کلیساؤں کو اسرائیلی طیاروں نے

تاک تاک کر تباہ کیا ہے۔ سطروں ان کے علاقے میں تو مساجد اور گرجا گھروں کا بالکل صفایا کر دیا ہے فتح کے بعد انہوں نے مسجد اقصیٰ کے صحن میں جشن مے نوشی منایا۔ القدس کے آگستا وکٹوریا ہسپتال پر صلیب احمر اور اقوام متحدہ کے پرچم لہرا دیے گئے تھے مگر اسرائیلی بمبار طیاروں نے نیچی اڑان کر کے اس پر بم برسائے اور اسے تباہ کر دیا۔

القدس کے لوگ ریڈیو پر جب اسرائیلیوں کا یہ دعویٰ سنتے ہیں کہ انہوں نے مقدس مقامات کی بے حرمتی نہیں کی تو اس سفید جھوٹ پر تڑپ اٹھتے ہیں۔ اپنے اس جھوٹ کی شہادت انہوں نے حرم اقصیٰ کے شیخ عبد الحمید السائح سے دلوانا چاہی تھی اسرائیلی فوجی انہیں گھر سے کھینچ کر ریڈیو سٹیشن پر لے گئے لیکن اس مرد حق نے ان کا کہنا ماننے سے انکار کر دیا۔

"تمہیں کہنا پڑے گا۔" فوجی افسر نے کہا اور رائفل کی نالی ان کی پیشانی سے لگا دی۔ شیخ نے فوجی افسر کی طرف دیکھا اور بڑی پرسکون آواز میں کہا۔

"ہاں! گولی مار دو ...... میں نے ان آنکھوں سے جو کچھ دیکھا ہے، اس کے بعد زندگی کی خواہش نہیں رہی۔ جلدی کرو، جلدی۔ گھوڑا دباؤ تاکہ میں اس زندگی سے نجات پا جاؤں۔"

شیخ عبد الحمید السائح اس وقت کہاں ہیں؟ جام شہادت نوش کر چکے ہیں یا اسرائیلیوں کی قید میں ہیں، القدس، القدس کے رہنے والوں کو کچھ پتہ نہیں ہے، تاہم ان کی حق گوئی اور استقامت کا ذکر ہر زبان پر ہے۔

اردن کا سرحدی شہر قلقیلیہ آج لق و دق میدان میں تبدیل ہو چکا ہے۔ قلقیلیہ کو یہ سزا دوسرے عرب شہروں کو عبرت دلانے کے لیے دی گئی ہے۔ گزشتہ اٹھارہ انیس برس سے قلقیلیہ عرب حریت پسندوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ یہودی جب بھی چھاپہ مارتے تھے، قلقیلیہ کے نوجوان ان کے مقابلے میں ڈٹ جاتے تھے۔ اور انہیں سخت نقصان پہنچاتے تھے ایک مرتبہ تو یہودی شہر میں گھس بھی آئے تھے اور ہزاروں شہریوں کو تہ تیغ کر دیا اس کے باوجود قلقیلیہ آزاد اور سربلند تھا۔ ۵ جون کو یہودیوں نے قلقیلیہ پر حملہ کیا۔ دو دن تک سخت لڑائی ہوتی رہی ۷ جون کو قلقیلیہ سرنگوں ہو گیا طیاروں کی بمباری سے قلقیلیہ پہلے ہی کھنڈر بن چکا تھا اسرائیلی فوجوں نے قبضہ کرتے ہی شہر کے باشندوں کو زبردستی ان کے گھروں سے نکال دیا اور رہی سہی عمارتوں کو ڈائنامیٹ سے تباہ کر دیا، پھر بلڈوزر منگوا کر ملبہ صاف کر دیا گیا قلقیلیہ کا آج نام و نشان بھی نہیں ہے۔ اس کے باشندے نابلس کی مسجدوں، گرد و نواح کے پہاڑوں اور زیتون کے باغات میں کھلے آسمان کے نیچے مقیم ہیں۔ اکثر کے پاس کھانے کو روٹی ہے نہ پہننے کو کپڑا۔ نابلس کے فوجی گورنر سے دو کئی بار درخواست کر چکے ہیں کہ انہیں اپنے شہر میں جانے اور مکانات تعمیر کرنے کی اجازت دی جائے۔ مگر شنوائی نہیں ہوئی۔"

بقیہ صفحہ ۹۶ پر

پورٹ توفیق پر کیا بیتی؟

پورٹ توفیق میں جہاں کچھ روز پہلے زندگی رواں دواں تھی۔ آج موت کا سناٹا چھایا ہوا ہے۔ تاحدِ نظر شکستہ مکانات کے ڈھیر نظر آتے ہیں جن پر انسانی خون کے دھبے نظر آ رہے ہیں۔ ہر طرف ایک خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ جو کبھی کبھی ان ماؤں کے بین اور چیخوں سے ٹوٹ جاتی ہے جن کے بچے بربریت کا شکار ہو گئے ہیں۔ پورا شہر ایک وسیع قبرستان نظر آتا ہے۔

پورٹ توفیق کا دردانگیز منظر ایجنسی فرانس پریس کے نامہ نگار مائیکل نے پیش کیا ہے جو پورٹ توفیق کا دورہ کر کے آئے ہیں۔ پورٹ توفیق میں ۱۴ ستمبر کو مصری اور اسرائیلی فوجوں کے درمیان خوفناک جنگ ہوئی تھی جس میں ۴۰ سے زائد مصری ہلاک اور ۷۰ زخمی ہوئے۔ مرنے اور زخمی ہونے والوں میں عورتوں اور بچوں کی اکثریت ہے۔

نامہ نگار نے لکھا ہے کہ پورٹ توفیق سے صرف دو سو گز کے فاصلہ پر اسرائیلی سپاہی نظر آ رہے ہیں۔ انھیں دیکھنے کے لیے کسی دوربین کی ضرورت نہیں تھی۔ اسرائیلی ٹینکوں کی توپوں کا رخ اب بھی شہری آبادی کی طرف تھا۔ اور سپاہی سب مشین گنیں ہاتھوں میں تھامے "جوابی کارروائی" کے لیے تیار نظر آ رہے تھے۔

"پورٹ توفیق میں نہر سویز کو کنٹرول کرنے والی عمارت اب ملبہ کا ڈھیر بن چکی ہے۔ پورٹ توفیق کو قاہرہ سے ملانے والی سڑک کے مشرقی کنارے پر ہر طرف خندقیں نظر آتی ہیں۔ جہاں مصری فوجی اپنی پوزیشنیں لیے ہوئے ہیں۔ کنٹرول اسٹیشن کی عمارت پر متحدہ عرب جمہوریہ کا جھنڈا لہرا رہا ہے۔ دوسری طرف مشرقی کنارے پر اسرائیلی جھنڈا نظر آتا ہے۔ یہ جھنڈا ایک کنارے سے پھٹا ہوا ہے۔ شاید کسی کو اسے درست کرنے کا ابھی تک خیال نہیں آیا۔

مائیکل لکھتا ہے کہ میں ویران سڑکوں سے گزر رہا ہوں میرے سامنے ایک سن رسیدہ عورت ہے جو چیخ چیخ کر کہتی ہے "کاش میں مر جاتی" اس کی آنکھ سے آنسو رواں ہیں۔ اس کی جوان بیٹی اور تین پوتے اسرائیلی گولہ باری سے شہید ہو گئے ہیں۔ وہ سینے پر ہاتھ مار مار کر بربریت کے خلاف احتجاج کر رہی ہے۔ اور

بقیہ صفحہ ۱۰۹ پر

آخری سپاہی تک جنگ جاری رہی

اردن کی فوج اور عوام نے بیت المقدس کا دفاع آخری لمحے تک جس بے جگری سے کیا اس نے مینن گراڈ اور لاہور کے دفاع کی یاد تازہ کر دی اردن کی فوج کی جانبازی کو برطانیہ اور امریکہ کے اسرائیل نواز اخبار نویسوں اور اخبارات نے بھی تسلیم کیا ہے اور لکھا ہے کہ عملی طور پر بیت المقدس کی ایک ایک اینچ زمین کے لئے اردنی فوجوں نے سینکڑوں جانیں قربان کیں۔ اور جب تک ایک بھی سپاہی زندہ رہا۔ اسرائیلیوں کو آگے بڑھنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ اور جب ایک ایک سپاہی شہید ہو گیا۔ تب اسرائیل کی فوجیں بیت المقدس میں داخل ہو سکیں۔

برطانیہ کے مشہور جنگی نامہ نگار چارلس ڈگلس ہوم نے بیت المقدس کی لڑائی کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ جس ہوٹل میں چار دیگر برطانوی اور امریکی اخبار نویسوں کے ہمراہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ اسکی دیواریں ٹینک توپوں اور بموں کے دھماکوں سے مسلسل لرز رہی رہی تھیں۔ اور اخبار نویس ہوٹل کے فرش پر لیٹے ہوئے سوچ رہے تھے کہ باہر کیا قیامت برپا ہے۔

اردن کی فوج اور بدو قشانے باز ایک ایک اینچ زمین کے لئے جان کی بازی لگا رہے تھے۔ اور ہر عمارت میں اپنے مورچے قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اسرائیلی کے میسٹر اور میرتیج لڑاکا بمبار طیارے مسلسل چوبیس گھنٹے تک اردن کی فوجوں اور ان کے مورچوں پر بمباری اور راکٹنگ کرتے رہے۔ اس تمام عرصے میں اردن کی فضائیہ کا ایک طیارہ بھی نمودار نہیں ہوا اور اردن صرف طیارہ شکن توپوں سے آگ برساتا رہا۔ غالباً اردن کی چھوٹی سی فضائیہ اس سے پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ اردن نے طیارہ شکن توپوں سے بیت المقدس پر دو بمبار مار گرائے۔ ان مغربی اخبار نویسوں کا خیال تھا کہ اسرائیلی فوجیں بیت المقدس پر قبضہ نہیں کر سکیں گی۔ اسی لیے جب صبح کو انہوں نے ہوٹل

انٹر کونٹی نینٹل کے سامنے۔ ایک ٹینک کی گڑگڑاہٹ سنی تو یہ سمجھے تھے کہ یہ ٹینک اردن یا عراق کا ہوگا۔ لیکن جب ہوٹل کے منیجر نے جلدی سے دیوار پر آویزاں شاہ حسین کی تصویر اتار کر ایک سفید نپکن کھڑکی سے باہر لٹکایا تو معلوم ہوا کہ اسرائیلی فوجیں بیت المقدس پر قابض ہو چکی ہیں۔

اس کے باوجود چھوٹے ہتھیاروں سے فائرنگ بدستور جاری تھی اور اسرائیل کی فوج کو ہر کھڑکی اور ہر عمارت کے دروازے پر سخت فائرنگ کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ ان مجاہدین کی امداد کے لئے بھاری توپ خانہ نہیں رہا تھا جو گذشتہ چوبیس گھنٹے سے اسرائیل کی فوج پر جہنم کی آگ برسا رہا تھا۔

برطانوی اخبار نویس کا بیان ہے کہ اردن نے اسرائیل سے جس طرح مقابلہ کیا ہے اس سے اتنے شدید مقابلے کی توقع نہیں تھی اسرائیل کا خیال تھا کہ اسے اردن کی طرف سے کوئی خاص مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ خاص طور پر اردن کی فضائی قوت ختم کرنے کے بعد اسرائیل بہت خوش تھا لیکن ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ فضائی قوت ختم ہونے کے بعد اردن کی فوج میدان میں زیادہ جانبازی سے لڑنے مرنے پر تیار ہو گئی تھی۔ اور بیت المقدس کی ایک ایک انچ زمین کے لیے جس جذبات اور جس بے جگری سے لڑی ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسرائیل صحرائے سینا میں مصر پر اپنا پورا دباؤ نہیں ڈال سکا تھا۔ اردن کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر بیت المقدس میں اس کا ایک سپاہی بھی موجود رہتا تو وہ آخری گولی ختم ہونے تک اپنی جگہ چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوتا کیونکہ اردنی مسلمان اس مقدس شہر کو ہر قیمت پر بچانے کا تہیہ کئے ہوئے تھے۔

بقیہ پورٹ توفیق پر کیا بیتی؟

اخباروں کے فوٹوگرافروں اور ٹیلی ویژن کیمرہ مینوں کا ہجوم پورٹ توفیق کی تباہی کی منظر بندی میں مصروف ہے۔ شہر کا ایک نواحی ہسپتال زخمیوں سے بھرا ہوا ہے جس میں پندرہ سال کی عمر کے ۲۰ کے قریب بچے بھی ہیں جو تکلیف سے کراہ رہے ہیں اور نرسیں انھیں دلاسہ دے رہی ہیں۔ ہر طرف ایک سناٹا طاری ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ آئندہ کیا ہوگا۔"

احسان دانش

یہ کیسا تغیر ہے؟

یہ کیسا تغیر ہے یہ کیا رنگ فضا ہے
جو شخص مسلماں ہے گرفتارِ بلا ہے
رسوائی ہے، عسرت ہے، ندامت ہے، دغا ہے
لیکن اثر انداز دوا ہے نہ دعا ہے
جو قریہ روایاتِ مقدس کا امیں تھا
اس وقت وہ اک شہرِ خاموشانِ وفا ہے
تقدیس کا افلاس ہے بشروں سے نمایاں
ہاتھوں پہ عقائد کا سسکتا سا دیا ہے
جس شہر کا ہر گھر تھا طرب گاہِ تمدن
اس شہر میں ہر گام پہ چیخوں کی صدا ہے
جو پھول کھلاتی تھی گلستاں میں شب و روز
آندھی کے حصاروں میں وہی بادِ صبا ہے
ساحل بھی ہے خاموش تلاطم بھی ہے گم سم
جو موج ہے دریا کی وہ زنجیر بپا ہے
آنکھوں میں تحیر ہے دماغوں میں تذبذب
سینوں میں مگر شورش بے صوت و صدا ہے
رکتے نہیں آنکھوں سے سلگتے ہوئے آنسو
سینہ ہے کہ تپتے ہوئے زخموں سے بھرا ہے
اب ریگ بیاباں ہے بھڑکتی ہوئی بارود
ہر شخص یہاں حشر کے میداں میں کھڑا ہے

بندوں پہ نہ کر بند الٰہی درِ توبہ
مانا کہ یہ اعمال و عقائد کی سزا ہے
اللہ انھیں فکر و بصیرت بھی عطا کر
چمنی کے دھوئیں کو جو سمجھتے ہیں گھٹا ہے
ان رہروانِ غمِ دوراں پہ کرم کر
جن کو نہیں معلوم کہ کس رُخ کی ہوا ہے
ہم لاکھ خطا کار و گنہگار ہیں لیکن
بے رحمیٔ ماحول کا شکوہ بھی بجا ہے
کل تک تھے جو ہمدردیٔ انساں کے مبلغ
اب ان کے تصور میں خودی ہے نہ خدا ہے
یوں خوار و زبوں ہو ترے محبوب کی اُمت
آخر تری توہین نہیں ہے تو یہ کیا ہے
وہ قوم ترے نام پہ دھبہ ہے سراسر
جس قوم کا کردار درندوں سے سوا ہے
تُو قادر و قیوم ہے تُو مالک و مختار
قبضے میں ترے کارگہِ ہر دوسرا ہے
اے وائے ہو دُنیا میں ترے دین کی تحقیر
یہ جبر بھی کیا تری مشیّت کو روا ہے
اس زہر کو تریاق بنا دے مرے مولا!
جس زہر سے مسموم زمانے کی فضا ہے
ہم اپنی نظر میں بھی گنہگار ہیں لیکن
دُنیا یہ سمجھتی ہے مسلماں کا خدا ہے

رئیس الشاکری

غمِ پنہاں

حالات نے وہ آگ مرے دل میں لگادی ... کچھ دیر کو میدانِ غزل چھوڑ دیا ہے
کہیے تو فسانہ غمِ پنہاں کا سناؤں ... ذکرِ گل و بلبل سے قلم روک لیا ہے

انسان کی فطرت میں تلوّن ہے ازل سے ... انسان بنایا گیا جس طرح کہ سیماب
ہے آج جو پستی میں تو کل عرش پہ پہونچا ... ذرہ جو کبھی ہے تو کبھی غیرتِ مہتاب

اغیار پہ الزام تو کچھ ٹھیک نہیں ہے ... خود اپنے ہی ہاتھوں سے ہوئی اپنی تباہی
ممکن ہی نہیں ترچھی نظر سے کوئی دیکھے ... تاریخ بھی موجود ہے دینے کو گواہی

یوں عالمِ اسلام کو پہنچا ہے جو صدمہ ... قدرت کا یہ منشا ہے مسلمان ہو بیدار
ورنہ یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں اے دوست ... ناپاک سے ہاتھوں میں رہے مرکزِ انوار

یہ ظلم و ستم اور یہ بے حرمتیٔ قدس ... ہاں صبر ذرا غیب سے سامان ہے کچھ اور
آتی ہے سحر کہتے ہیں تاروں کے لہو سے ... مضمون تو کچھ اور ہے عنوان ہے کچھ اور

طاغوت کے قبضہ میں ہے ہر شے چلو تسلیم! ... مانا کہ ہر سمت ہے دنیا میں اندھیرا
اللہ کی رحمت سے نہ مایوس ہو پھر بھی ... ممکن ہے کہ ہو جائے بہت جلد سویرا

گونج اٹھے اگر نعرۂ توحید سے دنیا ... سرکار کی سنّت رہے ہر ایک عمل میں
واللہ بدل جائیں زمانے کی ادائیں، ... تبدیل ہو تاریکیٔ شب نورِ سحر میں
دنیا میں کوئی آنکھ ملائے نہیں ممکن ... مضبوط ہو آپس میں جو ایمان کا رشتہ
قدموں پہ جھکے عظمتِ کونین خود آکر، ... ہو جائے جو قرآں سے مسلمان کا رشتہ
آرام کی خواہش نہیں دنیائے وفا میں ... کانٹوں کی تمنا میں ارم چھوڑ دیا ہے

شاعر نے بھی حالات کے دلدوز اثر سے
"تلوار اٹھالی ہے قلم چھوڑ دیا ہے"

عربوں کی شکست کی فوجی وجوہ

حالیہ عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کی شکست کا بہت بڑا سبب یہ ہے کہ امریکہ اور برطانیہ نے یکایک خاموش طریقہ پر اسرائیل کو غیر معمولی فوجی امداد دی۔ مندرجہ ذیل مضمون سے امریکی اور برطانوی امداد اور جنگی چالوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے (یہ مضمون سٹیٹس مین بیروت سے ماخوذ ہے) (مدیر)

۱۹۵۶ء میں مصر پر اسرائیل برطانیہ اور فرانس کے مشترکہ حملہ کی طرح اس بار بھی اسرائیلی چاہتے تھے کہ جنگ شباب پہ آنے سے پہلے ہی متحدہ عرب جمہوریہ کی ہوائی فوج کو بے حرکت بنا دیں۔ ۱۹۵۶ء کی سازش کے بارے میں سابق برطانوی وزیر مسٹر انتھونی نٹنگ کے انکشافات تاریخ کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔ جو اُن کی شائع ہونے والی کتاب "ایک سبق کا خاتمہ نہیں ہوا" میں درج ہیں۔ امور خارجہ میں اس سابق برطانوی وزیر ریاست کے بیان کے مطابق اس وقت اسرائیلی وزیر اعظم ڈیوڈ بن گورین چاہتے تھے کہ جب اسرائیلی ڈیمیں حملہ کریں تو ہم (برطانیہ اور فرانس) مصر کی ہوائی فوج کی خبر لیں ورنہ تل ابیب اور دوسرے اسرائیلی شہر صدر ناصر کے ایلیوشن روسی بمباروں کے حملہ سے نیست نابود ہو جائیں گے۔

یہ منصوبہ اس لئے پروان نہیں چڑھا کہ برطانیہ ہوائی حملوں سے مصری ہوائی اڈوں پر ضرب لگانے سے پہلے الٹی میٹم دینے کی رسمی کارروائی کرنا چاہتا تھا۔ اور وزیر اعظم ڈیوڈ بن گورین کا اصرار تھا کہ ایکا ایکی ہوائی حملہ کیا جائے۔

آخر برطانیہ نے یہ بات مان لی کہ وہ اسرائیل کے شہروں پر بمباری روکنے کے لئے وہ سب کچھ کرے گا جو اسرائیل چاہتا ہے اور مصر کے ہوائی اڈوں کے خلاف کارروائی کی جائے گی۔

بالکل وہی طریقہ کار

اس بار بھی وہی ہوا۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس بار فرانس کی جگہ جنگ میں بڑا فریق امریکہ ہے۔

"آبزرور" کے دفاعی نامہ نگار اینڈریو ولس نے ۱۱ جون کو لکھا تھا کہ اسرائیل کی شروع کی کامیابیوں کا سبب یہ تھا کہ اسرائیلی ہوائی جہاز بحیرہ روم پر اڑ کر مصری دفاعات کی پشت پر حملہ کرنے کے لئے پہنچ گئے تھے۔ اور مصریوں کو اچانک آلیا تھا۔

"ٹائمز" نے بھی ۲ جون کو یہ بات مان لی کہ اسرائیل کی جانب سے حملہ کے آغاز کا ثبوت یہ ہے کہ اکثر عرب ہوائی جہاز اڈوں ہی پر رکھے رکھے تباہ ہو گئے تھے مگر اخبار نے یہ کہہ کر معاملہ کو نظر انداز بھی کر دیا ہے کہ اسرائیل کی مغلوب کرنے والی زبردست فتح کے پیش نظر یہ سوال صرف کتابی نوعیت کا ہے۔

جارحیت کرنے والے کی نشاندہی کے بعد اب اس کے مقاصد کا جائزہ لینا چاہیئے۔ زیادہ تر عذر یہ پیش کیا جا رہا ہے کہ اسرائیل پہلے حملہ نہ کرتا تو وہ ان عرب فوجوں کے ہاتھوں نیست نابود ہو جاتا جنہوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔ معنی خیز بات یہ ہے کہ یہ عذر وہ لوگ پیش کرتے ہیں جو اسرائیلی فوجوں کو حملہ آور قرار دینے کی تردید بھی کرتے ہیں۔ ۱۹۵۶ء کے حملہ کے وقت بھی اسرائیل برطانیہ اور فرانس کی سازباز کی پرزور تردید ہوئی تھی اس وقت بھی یہی کہا گیا تھا کہ اسرائیل اپنے کو بچانے کے لئے پہلے سے حملہ کرنے کے لئے مجبور تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر دس برس کے بعد اسرائیل مغربی طاقتوں کی مدد سے حملہ کر کے مزید عرب علاقوں کو ہڑپ کرنا چاہتا ہے۔

"اس مرتبہ بھی اسرائیل کو یہ امداد حاصل تھی امریکی جہاز لبرٹی نے اپنے ' نازک آلات کے ذریعہ متحدہ عرب جمہوریہ کے تمام ہوائی اڈوں اور راکٹ مرکزوں کا پتہ لگایا تھا اور جانچ پڑتال کے لئے ۴ جون کو متحدہ عرب جمہوریہ پر ایک حملے کا ڈھونگ رچایا گیا۔ جب مصر کے راکٹ اڈوں سے راکٹ داغے گئے تو ان راکٹ اڈوں کا پتہ چل گیا۔ یہ معلومات اور رضاکار ہوا باز اسرائیل کو حقیقی حملہ کرنے کیلئے دیئے گئے۔ ایجنسی فرانس پریس اس سے قبل یکم جون کو واشنگٹن سے خبر دے چکا تھا کہ امریکہ نے اسرائیل کو ہوائی تحفظ اپنے چھٹے بحری بیڑے کے ذریعے فراہم کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ کیونکہ ویت نام سے ہوائی جہاز نہیں ہٹا سکتا۔

اس سے بھی بہت پہلے ۲۱ مئی کو متحدہ عرب جمہوریہ کے راڈار نے مغربی ملکوں سے اسرائیل کے ہوائی اڈوں پر ہوائی جہازوں کی آمد کا پتہ لگایا تھا۔

۲۰ مئی کو برطانیہ کے ہوائی اڈوں سے اسرائیل کے جہاز بھلک مہیتا لیکن واپس آئے پھر دوران جنگ بھی امریکی ہوائی اڈوں کے راستے برطانیہ اور امریکہ کے ہوائی جہاز اسرائیل کو برابر رسد پہنچا رہے تھے جنگ چھڑنے کے بعد بھی سلسلہ برابر جاری رہا امریکی جہاز لیبیا سے اسپین لے جا کر صحرائی رنگ میں رنگے گئے تھے

گرفتار ہونے والے اسرائیلی ہوا بازوں نے اعتراف کیا ہے کہ ان کے ہیلی کوپٹروں سے امریکی بحری جہازوں پر لے جایا گیا۔ وہاں سے اڑ کر حملہ کرنے کے لئے آئے تھے۔

اسرائیل اور امریکہ کے درمیان یہ سازباز خلیج عقبہ کی ناکہ بندی سے بہت پہلے فروری میں شروع ہو گئی تھی۔ جب اسرائیل کے وزیر خارجہ ابا ایبان نے واشنگٹن کا دورہ کیا تھا اور خفیہ معاہدہ کے ذریعہ

ان کو بڑی تعداد میں امریکی جہاز ملے تھے ۔

بین الاقوامی اندازوں کے خلاف اسرائیل کی ہوائی طاقت کا یہ حال تھا کہ اس نے مصر پر ۶۰۰ سو طیاروں سے اور اردن پر ۴۰۰ طیاروں سے حملہ کیا۔ یہ اس کی اپنی طاقت سے تین گنا زیادہ ہوائی طاقت تھی آخر یہ طاقت اسے کہاں سے ملی ہے ؟

۲۰ مئی کو نیویارک ٹائمز نے اسرائیل کو امریکی ہوائی جہازوں کی فراہمی کے متعلق لکھا تھا کہ یہ عربوں کی سرزنش کیلئے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ عربوں کو خوفزدہ کیا جائے اور شام متحدہ عرب جمہوریہ کو خاص طور پر نشانہ بنایا جا سکے ۔

احتیاط کیسے ممکن تھی؟

یہ سوال ہو سکتا ہے کہ امریکی برطانوی سازشوں کے علم کے باوجود صدر ناصر نے احتیاط سے کام کیوں نہیں لیا۔ مغربی ملک چاہتے تھے کہ جنگ کرا کے مشرق وسطیٰ کا نقشہ ہی بدل دیں گے !

اس کا جواب یہ تاریخی سچائی ہے کہ ایک حد سے آگے افراد اور ملکوں کے لئے احتیاط سے کام لینے کے معنی موت کے ہیں۔ متحدہ عرب جمہوریہ بلکہ ساری عرب دنیا کے سامنے یہی چارہ کار تھا کہ خطرہ کا کھل کر مقابلہ کیا جائے اور اسے ختم کر دیا جائے۔

...... اگر صدر ناصر ۱۳ مئی کو شام کی مدد کرنے نہ کھڑے ہوتے تو بھی فوجی مہم کا نتیجہ یہی رہتا جو بعد میں نکلا۔ مگر عرب عوام کا حال زیادہ برا نہ ہوتا۔

سیاسی اور نفسیاتی اعتبار سے ان کو خیال آتا کہ ان کی تقدیر میں یہ ہے کہ ایک کے بعد دوسرے حملہ آور کے سامنے سر ٹیک دیں۔

اسرائیل کو امریکہ سے جو مسلسل حوصلہ افزائی ملی ہے اس کا ثبوت اسرائیلی وزیراعظم لیوی اشکول کا وہ انٹرویو بھی ہے جو یو ایس نیوز اینڈ ورلڈ رپورٹ کے مئی کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ ان سے دریافت کیا گیا کہ آپ کو عربوں کے خلاف امریکہ برطانیہ اور فرانس کی امداد کی توقع ہے، انہوں نے جواب دیا کہ یقیناً اسرائیل سے جو سارے وعدے ہوئے ہیں ان کے پیش نظر یہ ضرور ہے کہ امریکہ نے ہم سے کہا ہے کہ جب تک ہم وہاں ہیں اور چھٹا بحری بیڑہ ہے۔ وہاں سے اپنا خرچ نہ کرو۔ آخر میں اردن کے خلاف اسرائیل کی جانب سے نیپام بموں کے عام استعمال کا معاملہ ہے۔ بیروت میں امریکی یونیورسٹی کے ہسپتال کے ایک سینیئر سرجن ڈاکٹر طسکال بخاری نے بتایا ہے کہ اردن کے ۷۰۰ سو کے قریب زخمیوں کے ۵۰۰ کے زخم نیپام بم سے آئے تھے۔ زیادہ زخمی میدان جنگ سے بھی اٹھائے گئے تھے۔ مغربی حلقوں نے بتایا ہے کہ اسرائیل نے ریڈ کراس اور اس کی علامات والے ہسپتالوں پر بھی اندھا دھند کسی امتیاز کے بغیر گولہ باری کی اور بم برسائے۔

لارڈ بوا کولے

آخری فتح عربوں کی ہوگی

عرب اسرائیلی تنازعہ بین الاقوامی معاملات میں ایسا مسئلہ ہے جس کا حل آسان نہیں ہے یہودیوں کا دعوی ہے کہ تاریخی اعتبار سے فلسطین ان کا ہے۔ لیکن ایسی تاریخ کو جو جگہ جگہ سے کٹی پھٹی ہو کوئی حق تسلیم کرانے کا جواز نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ فلسطین میں ۱۹۶۴ قبل از مسیح تک یہودی آباد تھے۔ اور پھر اسے سلطنت روما نے فتح کر لیا۔ اس لئے اگر موجودہ قبضے کے لئے پچھلی باتوں کو بنیاد بنایا جائے تو آج دنیا کا نقشہ کچھ اور ہی ہو گا۔

فلسطین پر یہودیوں کا دعوی دو بنیادوں پر کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ عیسائیوں اور یہودیوں کے لئے فلسطین کی مذہبی حیثیت ہے

پھر یہودی یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ان کی قوم وہاں آباد تھی۔ یہ دونوں ہی باتیں ایسی ہیں کہ ان کی وجہ سے گذشتہ دو ہزار برس کی تاریخ تبدیل نہیں کی جا سکتی یہودی اگر فلسطین کو اپنے باپ دادا کا گھر سمجھتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بے گھر رہے ہیں۔ پورے مسیحی عہد میں وہ ایسے لوگ رہے ہیں جن کا کوئی گھر نہیں تھا۔ اور وہ ساری دنیا میں بکھرے پڑے تھے۔ ان پر نسلی مظالم بھی ڈھائے گئے۔ صرف ہٹلر نے ۶۰ لاکھ یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس لیے ان کی نظریں فلسطین پر لگی ہوئی تھیں!

پہلی عالم گیر جنگ کے دوران برطانیہ کو سیاسی اور مالی طور پر دنیا کے یہودیوں کی مدد درکار تھی۔ اس وقت کے وزیر خارجہ چیم وائزمین نے صیہونی تحریک کے سربراہ سے وعدہ کیا تھا کہ فلسطین ان کو دے دیا جائے گا۔ لیکن اس سے پہلے برطانیہ عربوں سے وعدہ کر چکا تھا کہ مشرق وسطی کی سرزمین ان کے حوالے کر دی جائے اس لئے جب برطانیہ نے فلسطین یہودیوں کے حوالے کیا تو عربوں نے بجا طور پر اسے برطانیہ کی غداری قرار دیا۔

جنگ کے بعد لیگ آف نیشنز نے

فلسطین کو برطانیہ کی نگرانی میں دے دیا تھا۔

اس کے بعد امیر یہودیوں، خاص طور پر امریکی یہودیوں کی مدد سے یہودی فلسطین پہنچنا شروع ہو گئے۔ اور ان کے لئے روپوں کی تھیلیوں کے منہ کھول دیئے گئے۔ عربوں نے یہودیوں کی بڑے پیمانے پر فلسطین میں آمد کی مخالفت کی۔ اور دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ نے جو عرب قوموں کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہودیوں کی آمد پر پابندی لگا دی۔

ادھر فلسطین میں پہنچنے والے یہودیوں کے انتہا پسند عنصر نے عربوں اور برطانوی حکام کے خلاف سازشیں شروع کیں اور کئی لوگوں کو شہید اور قتل کیا گیا۔ اور جب فلسطین پر برطانوی نگرانی کی مدت پوری ہو گئی تو یہودیوں نے فلسطین کو اپنی ریاست قرار دیدیا اسے اسرائیل کا نام دیا گیا۔ پورے فلسطین پر عربوں کا حق تھا۔ یہودیوں نے فلسطین سے دس لاکھ عربوں کو ان کے مکانات سے نکل جانے پر مجبور کیا اور طرح طرح کے مظالم ڈھائے۔ یہ عرب گذشتہ ۱۸ برس سے اقوام متحدہ کی نگرانی میں پناہ گزینوں کے کیمپوں میں رہ رہے ہیں اس کے بعد سے عربوں اور اسرائیل میں مسلسل تصادم ہوتا رہا ہے۔ ۱۹۵۶ء میں مصر نے نہر سویز کو قومی ملکیت میں لے لیا اور فرانس اور برطانیہ نے اسرائیل کے ساتھ سازش کر کے مصر پر حملہ کر دیا۔ اس حملے کے خاتمے کے بعد سرحد کی مصری جانب اقوام متحدہ کی فوج تعینات کر دی گئی۔ اسرائیل نے اپنی سرحد پر فوج رکھنے سے انکار کر دیا تھا۔

اقوام متحدہ کی فوج خلیج عقبہ پر کنٹرول کرتی تھی۔ اسرائیل کی بندرگاہ ایلہ سے بحر احمر میں جانے کے لیے یہ خلیج گذرگاہ ہے۔ اسرائیل کے لیے مشرق اور افریقہ سے تجارت اور ایران سے تیل حاصل کرنے کے لئے یہ راستہ اہمیت رکھتا ہے۔ تنازعہ کی ایک اور وجہ دریائے اردن ہے۔ یہ لبنان سے نکلتا ہے لیکن اس کے پانی کو یہودیوں نے صحرائے نجیف میں آبپاشی کے لئے اپنی طرف موڑ لیا ہے۔ عربوں نے اردن اور لبنان میں آبپاشی کے لئے اس کا رخ موڑنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ جس پر عمل کیا جارہا ہے۔ موجودہ بحران کا سبب مصر کی جانب سے خلیج عقبہ کی ناکہ بندی کو بتلایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں مصری سرحد سے اقوام متحدہ کی فوج کے ہٹائے جانے کے بعد مصری اور اسرائیلی ایک دوسرے کے آمنے سامنے آگئے۔ مصر کا کہنا ہے کہ اسرائیل نے شام پر حملے کی جو دھمکی دی تھی۔ اس کے جواب میں اس نے یہ قدم اٹھایا تھا۔ فی الحقیقت اسرائیل کے وزیر

اعظم نے شام پر حملے کی دھمکی دی تھی ۔

ان حقائق کو اگر اُلجھا ہوا تسلیم کر لیا جائے تو بھی اصل مسئلہ اسرائیل کا وجود ہے ۔ عرب قومیں اسرائیل کو امریکہ اور برطانیہ کی مسلط کردہ یہودی نوآبادیت قرار دیتی ہیں ۔ وہ اسرائیل کے ہاتھوں بے گھر کئے جانے والے ۱۰ لاکھ فلسطین کے عربوں کا حوالہ بھی دیتی ہیں ۔ اسرائیل یقینی طور پر نسل پرستوں کا ملک ہے ۔ صیہونی تحریک نے کبھی عرب قوموں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی ۔ یہودی اگر فلسطین میں عربوں کے ساتھ مفاہمت کر سکتے تو شاید عرب انہیں برداشت کر لیتے لیکن ان کا مقصد اسے یہودی ریاست بنانا تھا ۔ جس میں وہ عربوں کو محکوم رکھنا چاہتے تھے ۔

اس طرح مسئلہ یہ ہے کہ اسرائیلی زندہ رہنے کے حق کا شور مچاتے ہیں ۔ اور عرب اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کا عزم کئے ہوئے ہیں ۔ اس کے ساتھ ساتھ دس لاکھ فلسطینی مہاجرین کا بھی مسئلہ ہے ۔ جنہیں ان کے وطن سے نکالا گیا ہے، انہیں وہاں بسنے کا حق ہے ۔ امریکہ اور برطانیہ خلیج عقبہ میں جہاز رانی کی آزادی کی باتیں کر رہے ہیں ۔ لیکن یہ خلیج بین الاقوامی آبی گزرگاہ نہیں ہے ۔ یہ ایسی اندرونی آبی گذرگاہ ہے جو بحر احمر میں جا ملتی ہے ۔ اور اس کا سمندر معربی علاقائی پانیوں میں ہے ۔ اگر یہ مسئلہ حل ہو بھی گیا تو اسرائیل کے وجود سے عربوں کے جو جذبات مشتعل ہوئے ہیں وہ سرد نہیں ہو سکتے ۔ پورے مشرق وسطی میں عربوں کا غلبہ ہے اور اسرائیل کا وجود ان کے رحم و کرم پر ہے ۔ شاید اس کا تصفیہ ایک ایسی فیڈریشن ہو جس میں فلسطین بھی شامل ہو اور جس میں عرب اور یہودی ساتھ ساتھ رہ سکیں ۔ وہاں یہودیوں کے اپنے مذہبی جذبے کی تسکین کے لئے بھی کوئی راستہ نکالا جا سکے !

مغرب کے لئے اس معاملے میں جو چیز سب سے اہم ہے وہ یہ کہ اسے مشرق وسطی میں غلط فریق کی حمایت نہیں کرنی چاہیئے ۔ ترقی پسند مستقبل عربوں کے ساتھ ہے ۔ جو وہاں انقلاب کی رہنمائی کر رہا ہے یہ انقلاب مشرق وسطی میں شاہی کو ختم کر رہا ہے ۔ عربوں کی تیل کی دولت کو خوشحالی کے لئے استعمال کر رہا ہے اور جمہوری نظام قائم کر رہا ہے ۔ روشن خیال مغرب اسکے ساتھ وابستہ ہونا پسند کرے گا ۔ برطانیہ کو خاص طور پر عدن اور جنوبی افریقہ کی طرفداری سے دستبردار ہو جانا چاہیئے ۔ اسے اسرائیل کے مسئلے پر غلط لوگوں کا ساتھ نہیں دینا چاہیئے ۔ کیونکہ فتح عرب انقلاب کی ہوگی ۔ مغرب اور اسرائیل کو یہ جان لینا چاہیئے ۔

جشنِ فتح منانے والا جانسن بازی ہار جائے گا

خرطوم کانفرنس کی کامیابی سے واشنگٹن میں فاتحانہ اعتماد کی فضا یکسر معدوم ہو گئی ہے۔

"ایوننگ پوسٹ" مورخہ ۲۹ جولائی میں امریکہ کے مشہور صحافی اسٹوارٹ آلساپ نے "دی جام دی آران" کے عنوان سے یہ بات تسلیم کی ہے کہ "وہائٹ ہاؤس میں سرگرم بیان امریکی سربراہوں کو خاموش بیٹھا دیکھ کر وہ چھوٹے بچے یاد آتے ہیں جو منہ بسورے امی سے شکایت کرتے ہیں۔ میں کسی کو نہیں بھاتا ساری دنیا مجھے دھتکارتی ہے میں باہر مٹی کھانے جارہا ہوں"

اسٹوارٹ آلساپ "پوسٹ" کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے واشنگٹن میں مقیم ہیں وہ لکھتے ہیں۔ "ہمارے حلیف (اسرائیل) نے مشرق وسطی میں جنگ جیتی اور واشنگٹن نے چند روز تک دل کھول کر فتح کا جشن منایا۔ پھر بہت جلد حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آئی کہ اسرائیل کی فتح کو کسی طرح امریکی فتح قرار نہیں دیا جاسکتا۔ واشنگٹن کا سنجیدہ حلقہ قائل ہو گیا ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد آج تک ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آیا جب امریکہ نے یہ محسوس نہ کیا ہو کہ وہ پوری دنیا میں بالکل اکیلا ہے۔"

آلساپ نے اعتراف کیا ہے کہ اس دنیا میں شاید ہی اس کو کوئی پسند کرتا ہو اس کے برعکس ہم سے نفرت کرنے والوں کا شمار ہی نہیں کیا جاسکتا خصوصیت کے ساتھ عرب تو ہم سے نفرت کرتے ہیں اور دردناک بات یہ ہے کہ ہمارے حکام اس نفرت کو عربوں کا وقتی جوش کہہ کر ٹال دیتے ہیں ان کے خیال میں یہ سب امریکہ کے خلاف مصر کے زہریلے پروپیگنڈے کا نتیجہ ہے۔

آلساپ کے خیال میں یہ بات کسی حد تک تو درست ہے لیکن اس کے چند اور بنیادی اسباب بھی ہیں۔

یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ یہودیوں نے ۱۹۴۸ء میں ارض مقدس کے زرخیز و شاداب حصّے پر قبضہ کر کے عربوں کو نہ صرف یافہ اور حیفہ جیسے شہروں زرخیز کھیتوں اور باغات سے بلکہ اس سرزمین سے بھی بے دخل کیا جس میں وہ صدیوں سے آباد تھے اور جسے آہن پوش صلیبی سورماؤں کی مسلسل یلغار سے محفوظ رکھنے کی خاطر ان کی نسلیں یکے بعد دیگرے ڈیڑھ ہزار سال سے بے دریغ قربان ہوتی چلی آرہی ہیں۔

آلساپ کے اس تجزیے کی صداقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہودیوں کے غاصبانہ قبضے کے بعد تقریباً ۱۴ لاکھ فلسطینی عرب بیس سال سے متعفن کیمپوں میں کسمپرسی کی زندگی گذار رہے ہیں حالیہ جنگ کی وجہ سے

بیت المقدس ، رملہ ، لدہ ، اریحا اور نابلس کے مزید لاکھوں عرب بے خانماں ہو کر ان میں آ ملے ہیں ۔ تازہ دم مہاجروں میں زیادہ تر عورتیں اور یتیم بچے شامل ہیں اور اکثریت ایسے زخمیوں کی ہے جو سر سے پاؤں تک نیپام بموں کی آگ میں جھلسے ہوئے ہیں انہیں دیکھ کر دنیائے اسلام کے پرانے زخم تازہ ہو گئے ۔ اور اگر وہ اسرائیل سے نفرت کرتے ہیں تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے ؟

اسٹوارٹ آلساپ کے بقول چھ روزہ جنگ کے دوران میں تو امریکی حکمرانوں اور عوام کو فتح کے سرکاری جشن سے فرصت ہی نہ ملی انہیں یقین تھا کہ روس امریکہ کے بھانسے میں آ کر عربوں کو اس بات پر راضی کر لے گا کہ وہ اسرائیل کو تسلیم کر لیں ۔ اور نہر سویز اور خلیج عقبہ کو اسرائیلی جنگی بیڑے کے رحم وکرم پر چھوڑ دیں ۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس سوال پر صدر جانسن اور وزیر اعظم کوسی گن میں تلخ کلامی کی نوبت تو نہ آئی لیکن وہ کسی بات پر متفق بھی نہ ہوئے ۔

نہر سویز اور خلیج عقبہ کو امریکی ، برطانوی اور اسرائیلی جہازوں کو بند ہوئے پانچواں مہینہ جا رہا ہے اس زمانے میں کسی عرب ملک نے مغرب کی طرف رجوع کرنے کی خفیف سی رغبت بھی ظاہر نہ کی نہ صرف اردن اور مصر کے عوام بلکہ فلسطین کے لاکھوں مہاجروں کو بھی معمول کے مطابق کھانا پانی بدستور مل رہا ہے ان کا اتحاد اور عزم روز بروز ناقابل شکست ہو رہا ہے اور اب تو بیت المقدس میں آباد مسلمانوں نے باقاعدہ سول نافرمانی کی تحریک بھی شروع کر دی ہے ۔ دو مہینے کے اندر اندر اسرائیلی حکومت کو یکے بعد دیگرے چار گورنر بدلنے پڑے اور غزہ میں گوریلا جنگ شروع ہو چکی ہے ۔ وہ دن بہت جلد آنے والا ہے جب اسرائیلی فتح پر ناز کرنے والے اپنی حماقت پر پچھتائیں گے ۔

ماضی کی تمام کامیابیوں کی طرح اسلام دشمن قوتوں کی یہ کامیابی بھی بالکل عارضی ہے ۔ عرب آج تک نہ صرف زندہ وقائم ہیں بلکہ ناکامی نے ان میں کامیابی کی نئی اُمنگ بیدار کر دی ہے وہ اس وقت بھی نہ گھبرائے جب ایک مسلمان کے مقابلہ پر دس دس دشمن سپاہی میدان میں صف آرا ہوتے تھے ۔ لیکن آج تو پندرہ عربوں کے حصے میں صرف ایک یہودی آتا ہے نہر سویز اور خلیج عقبہ پر آج بھی ان کی ملکیت قائم ہے پھر روئے زمین کا تیل اور اعاویر (مراکش) سے علی مسجد (مغربی پاکستان) تک پھیلا ہوا لق ودق بری خطہ دشمن چوکیوں سے محفوظ ہے ۔ اس خطے کی یک جہتی اور وحدت کی فوجی اہمیت کو دنیا کی کوئی قوم بھی نظر انداز نہیں کر سکتی ۔

یہی تیل اور عالم اسلام کی وحدت عربوں کا ایسا کارگر حربہ ہیں جو مغربی دنیا کے خلاف ان کی سیاسی اور فوجی کامیابی کے ضامن ہیں ۔ روس کے علاوہ فرانس بھی عربوں کی حمایت پر مجبور ہو گیا ہے امریکہ نے اس بات پر بڑا زور مارا تھا کہ فرانس بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا کر خلیج عقبہ اور نہر سویز میں

اسرائیلی جہازوں کے داخلے کی حمایت کرے لیکن صدر ڈیگال نے نہ صرف صاف صاف انکار کر دیا بلکہ اپنے پرانے حلیف اسرائیل کو اسلحہ کی ترسیل پر بھی پابندی لگا دی اور اب واشنگٹن کو پتہ چلا ہے کہ فرانس کی تیل کمپنیاں حکومت کے اشارے پر عرب ملکوں میں اینگلو امریکی اجارہ داروں کی جگہ لینے والی ہیں تو وہائٹ ہاؤس اور ۱۰! ڈاؤننگ اسٹریٹ میں کہرام مچ گیا اور ایک سرکردہ امریکی افسر نے ٹھنڈی سی آہ بھر کر کہا" اگر صدر ڈیگال نے واقعی ایسا کیا تو ہم فرانس کے ساتھ سفارتی تعلقات توڑ دیں گے۔"

صرف عرب اور ایشیا کے حریت پسندوں ہی نہیں، یورپ کی بہت سی قومیں خصوصیت کے ساتھ فرانس بھی امریکہ کو ناپسند کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اس نے معاہدہ شمالی اوقیانوس سے الگ ہو کر یورپ میں امریکی وقار پر کاری ضرب لگائی ہے۔ آلساپ کے مطابق " معاہدہ شمالی اوقیانوس کی موت بھی یقینی ہے" جرمنوں کی امریکہ سے دوستی جو کسی زمانہ تک چٹان کی طرح ناقابل شکست سمجھی جاتی تھی اب ریت کا گھروندہ ثابت ہوئی ہے۔ مشرق وسطی کے تیل پر اینگلو امریکی اجارہ داری کو ختم کرنے کے لیے روس اور فرانس کے علاوہ جرمنی جاپان اور اٹلی بھی بے چین دکھائی دیتے ہیں۔

صرف برطانیہ امریکہ کا واحد دوست ہے جس نے خلیج عقبہ میں اسرائیلی جہاز رانی کے منصوبے کی کھل کر حمایت کی۔ سویز سے سنگاپور تک روبہ زوال برطانوی سلطنت کے سارے مفادات امریکہ سے وابستہ ہیں لیکن امریکہ اور برطانیہ میں پھوٹ پڑنے کا نازک لمحہ سر پر آگیا ہے۔ اگر مشرق وسطی کا تیل انگریز کے ہاتھ سے نکل گیا تو برطانیہ کی کمر ٹوٹ جائے گی اور وہ صدر ڈیگال کی من مانی شرطوں پر یورپ کی مشترکہ منڈی میں شامل ہونے پر مجبور ہو جائے گا۔ اس منڈی میں برطانیہ کو شامل کرنے کے لیے صدر ڈیگال کی کم سے کم شرطیں کیا ہیں؟

اینگلو امریکی اتحاد کی بے وقت موت اور اگر انگریز نے بھی امریکہ کا ساتھ چھوڑ دیا تو پھر پوری دنیا میں امریکہ بالکل تنہا رہ جائے گا۔ اور سچ پوچھیں تو واشنگٹن پر چھائی ہوئی اداسی اور خاموشی میں اس ناگزیر خطرے کی جھلک آسانی سے دیکھی جا سکتی ہے پھر اسرائیلی فتح نے تو امریکہ کو ایسی الجھن میں مبتلا کر دیا ہے جس سے باہر نکلنے کے تمام آبرومندانہ راستے بند ہو چکے ہیں۔ اسٹیوارٹ آلساپ کے خیال میں "اس سے تو اچھا تھا کہ صدر ناصر تل ابیب میں یا صدر ہوچی من سائیگون میں فاتحانہ داخل ہو جاتے" امریکہ کے مٹھی بھر "عقابوں" نے صدر جانسن کو اس مصیبت میں پھنسا دیا ہے کہ وہ لاکھ ضدی بچوں کی طرح منہ بسور کے یہ کہیں کہ میں کسی کو نہیں بھاتا، اپنے بیگانے مجھے دھتکارتے ہیں۔ میں باہر مٹی کھانے جا رہا ہوں تو بھی ان کی مشکلیں آسان نہ ہوں گی۔"

الشیخ عبد اللہ الخیاط
خطیبِ حرمِ کعبہ

مادّی سہاروں پر اعتماد کا نتیجہ

بندگانِ خدا! عمل پر جزاء کا مرتب ہونا ہی اللہ کا قانون ہے۔ یہی اللہ کا عدل ہے۔ وہ اپنے بندے کا جب مواخذہ کرتا ہے تو اس کے ہی عمل کی بنیاد پر کرتا ہے۔ اور جب کسی قوم کو عذاب میں مبتلا کرتا ہے تو یہ بھی اس کے اجتماعی عمل ہی کا پھل ہوتا ہے۔ جو اس کے سامنے آتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

"یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے، بے شک اللہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔"

"اور ہم نے انھیں ان کی سرکشی کا بدلہ دیا"

"تمہیں جو مصیبت بھی پہنچتی ہے۔ وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے۔"

غزوہ احد میں جب کچھ مجاہدین حکمِ رسولؐ کی پوری پوری پابندی نہ کر سکے تو انھیں ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا کہ لوگ حیران رہ گئے۔ پھر اللہ نے اس ہزیمت کے اسباب کی نشاندہی کی ہے۔۔۔

"اور جب تم ہزیمت سے دوچار ہوئے تو کہنے لگے یہ کہاں سے آئی ہے۔ کہو یہ تمہارے اپنے پاس سے آئی ہے۔ اور رسول کی نافرمانی کے باعث آئی"

اور اب یہودیوں کے ساتھ معرکے میں جو ہزیمت ہوئی اور یہودیوں کو جو غلبہ حاصل ہوا ہے اس کے اندر بھی مکافاتِ عمل کے ہی بنیادی خدائی قانون کا ہاتھ ہے۔ یہ ہزیمت اب خود زبان سے اپنے عوامل کو بیان کرتے ہوئے کہہ رہی ہے :۔

"کیا تم لوگوں میں ایسے لوگ نہیں تھے، جو خدا کے دین کا انکار کر رہے تھے۔ اپنے عقیدہ کو پس پشت ڈال کر کھلے الحاد کا نعرہ لگا رہے تھے۔ اور (معاذ اللہ) اللہ کے بارے میں یہ نہیں کہتے تھے کہ عجائب گھر میں رکھی جانے والی گڑیا ہے۔ اور کیا وہ لوگ بھی نہیں تھے، جن لوگوں نے دین کے مخلص خادموں کے حرام خون کو حلال کیا۔ قانون کی تلوار سے اموال کو سلب کیا، مسلمانوں کو فتنوں میں مبتلا کیا۔ اور مجبور کیا کہ اپنے رب کی کتاب سے منہ موڑیں الٰہی قوانین کے بدلے وضعی قوانین کو ان کے اندر فیصلوں کی بنیاد بنایا۔ اور کیا تم میں وہ لوگ نہیں

تھے، جنھوں نے برائیوں سے پیار کیا، نہ دین کا خیال کیا نہ ضمیر کی ملامت کا۔ یہاں تک کہ پاؤں کے نیچے کی زمین چیخ پڑی۔ یہ انحطاط اور دینی روح سے اعراض معاشرہ میں عام ہوتا رہا۔ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا پرچم سرنگوں ہوتا گیا۔ اللہ کی حرمتوں کا دامن چاک ہوتا رہا۔ دین میں تغیر اور تبدیل کی کوششیں ہوتی رہیں، لیکن نہ کسی داعی حق کی آواز اس کے خلاف بلند ہوئی۔ اور نہ کسی عالم یا عابد کے ماتھے پر بل پڑے۔ اللہ کے قانون کے مطابق اب اس کا انجام بھی سامنے آرہا ہے۔ اللہ کے دشمن یہود کے ہاتھوں یہ بدترین ہزیمت اسی انجام کے سوا اب کیا ہے!

مسلمان حالات وظروف کے پیش نظر اس وقت کامیابی سے محروم رہ گئے ہیں جب کہ انھیں اللہ کی مدد واعانت کی شدید ضرورت تھی۔ اور یہ اس لئے ہوا کہ معصیت کی راہ اپنا کر دین کی راہ چھوڑ کر ان لوگوں نے اللہ کی مدد سے اعراض کیا تو اللہ نے بھی ان کی مدد نہیں کی انہیں چھوڑ دیا اور ان کے حق میں اللہ کا وہ وعدہ پورا نہیں ہوا۔ جو ان کے اسلاف کے حق میں پورا ہو چکا ہے۔ اس لئے کہ ان کے اسلاف اللہ کے ساتھ تھے۔ اللہ کی راہ پر تھے، تو اللہ ان کے ساتھ تھا۔

"... اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ اور تمہیں ثابت قدمی عطا فرمائے گا۔"

ایک حدیث قدسی میں بیان کیا گیا ہے۔

"جب مجھے جاننے والے میری نافرمانی کرتے ہیں تو میں ان لوگوں پر ایسے لوگوں کو مسلط کردیتا ہوں جو مجھے نہیں پہچانتے۔"

بنی اسرائیل کے بعض انبیاءؑ نے جب زمین کے بعض مطلق العنان سربراہوں کے قتل وغارت کو دیکھا تو اپنے رب سے عرض کیا:

"بار الٰہا! ہمارے عمل کی پاداش میں تُو نے ہم لوگوں پر ایسے لوگوں کو مسلط کردیا ہے جو نہ تجھے پہچانتے ہیں اور نہ ہم پر رحم کھاتے ہیں۔"

جزاء اور عمل سے متعلق یہ آیات اور احادیث مسلمانوں کو آمادہ کرتی ہیں کہ وہ ماضی کی غلطیوں کو درست کریں، اللہ کی طرف رجوع کریں، اس پر بھروسہ رکھیں اور انحراف ولغزشوں سے اوپر اٹھنے کی کوشش کریں۔ یہ انحراف اور لغزشیں خواہ عقیدہ سے متعلق ہوں یا اخلاق سے۔ اور ہدایت کی اس راہ پر گامزن ہوجائیں جن کی نشاندہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے۔ اپنے قول وعمل کو اس کے دائرے میں مقید کرلیں۔ اور خواہشات کی تابعداری کرنے کی بجائے ان کو مضبوطی سے پکڑیں۔

اس شخص سے زیادہ گم کردہ راہ کون ہوگا جو اللہ کی ہدایت کو چھوڑ کر نفس کی پیروی کرتا ہے۔ پس اسی راہ ہدایت کی پیروی ہر مفہوم کے لحاظ

سے ترقی کی منزل پر پہنچ سکتی ہے اور جب مسلمان یہ راہ اپنائیں گے اور جس دن ماضی کے غبار کو لپیٹے سے دور کر دیں گے۔ اور اپنے سروں کو زمین کی طرف گھمانے کی بجائے آسمان کی طرف اٹھائیں گے، اسی دن وہ اللہ کی مدد و نصرت، اللہ کی معیت و تائید سے خوش ہوں گے۔ اور قبلۂ اول کو واپس لینے کی راہ میں کوئی طاقت مزاحم بن کر ان کی شکست کا سبب نہ بن سکے گی۔ خواہ وہ اپنی تعداد، ساز و سامان اور اعوان و انصار کے لحاظ سے کتنی ہی عظیم طاقت کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ جسے اللہ کی مدد اور تائید حاصل ہوتی ہے اسے غلبہ نصیب ہوتا ہے۔

پس بندگانِ خدا! اللہ کے تقویٰ کی راہ اختیار کرو۔ اللہ سے اپنے عہد کی تجدید کرو، اپنی غفلتوں اور دین سے دوری پر توبہ کرو کہ یہی دین ابدی دین ہے۔ یہ ہر زمانہ اور ہر جگہ کے لئے قابلِ عمل ہے۔ مادی تیاریوں کے ساتھ ساتھ اللہ کے اعتماد کو بھی بڑھاؤ۔ یہی راستہ تمہیں کامیابی سے ہمکنار کر سکتا ہے۔ لیکن اگر اللہ پر اعتماد کے بجائے تم نے صرف مادی طاقتوں اور سہاروں پر اعتماد کیا تو اس کا ایک انجام تمہارے سامنے آچکا ہے اور آئندہ بھی اسی انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اللہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ اور جو نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا۔ اگر تم نے مادی تیاریوں کے ساتھ اللہ کا سہارا بھی پکڑ لیا، اس نے اچھے مومن بندوں کے ساتھ جو کیا ہے۔ اسے وہ تمہارے ساتھ بھی پورا کرے گا۔

"— جو لوگ ایمان اور عمل صالح کی راہ اپناتے ہیں۔ اللہ کا ان سے وعدہ ہے کہ وہ انھیں زمین میں اسی طرح خلیفہ بنائے گا۔ جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے۔ اور ان کے لئے ان کے اس دین کو اسی مضبوط بنیادوں پر قائم کر دے گا، جسے اللہ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے۔"

بقیہ حقیقت کھل جانے کے بعد

دنیا میں باعزت وفاق ثابت ہونے کے لیے ایک اور قسم کی تیاری کی بھی ضرورت ہے اس تیاری کا تعلق اخلاقی زندگی سے ہے۔ افراد جب تک عملاً دیانت داری محنت اور شرافت کی قدر نہیں پہچانیں گے اس وقت تک ان کے عقیدے ان کی حفاظت کے لئے کافی نہ ہوں گے۔ انفرادی حد تک یورپ کے انسان کی اخلاقی زندگی عموماً پاکیزہ ہوتی ہے مگر ہم اچھے عقیدے رکھنے کے باوجود ان فضیلتوں سے محروم ہیں جن سے یورپ کا فرد بہرہ ور ہے غرض پاکیزہ اور شریفانہ زندگی اور اخلاقیت کا عمل اس تیاری کا جزو لازم ہے جو ہمیں درپیش ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

عالمِ عرب کا المیہ

بہت سے پُرجوش اور انتہا پسند لوگ اپنی تقریریں اور مقالات اللہ کے نام (بسم اللہ) کے بجائے عربی قومیت اور عربی عزت و وقار کے نام سے (باسم القومیۃ العربیہ اور باسم الکرامۃ العربیہ) شروع کرنے لگے۔ جس کے لکھنے والوں کو اسلام دشمنی، اس سے بغاوت و سرکشی اور استغنا و بے نیازی کے اظہار میں کوئی باک نہ تھا۔

بعض اہلِ قلم نے نئے عرب انسان کو ایک ایسے سرکش و دریدہ دہن وجود کی حیثیت سے پیش کیا جو تمام آسمانی مذاہب، بنیادی عقائد اور تمام اخلاقی و روحانی قدروں کا منکر ہے۔ اس طرزِ فکر کو ایک عربی مضمون نگار نے ایک بڑی عربی حکومت کے سرکاری فوجی رسالے میں پوری جسارت کے ساتھ پیش کیا اور ان سب فوجی افسروں اور قومی لیڈروں اور سیاسی رہنماؤں کی نمائندگی کی جو اس طرز پر سوچتے ہیں۔ وہ اپنے مضمون میں لکھتا ہے:

"عرب قوم نے الٰہ (معبود) سے مدد طلب کی اسلام اور مسیحیت کی قدروں کو ٹٹولا۔ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام سے مدد چاہی۔ ازمنۂ وسطیٰ کے نظاموں کا تجربہ کیا۔ لیکن ان سب سے اس کو ذرہ برابر فائدہ نہ ہوا۔ اس کے بعد عرب قوم نے اپنی کمر ہمت کس لی۔ اور اپنی نظر بلند کر کے بہت دور نظر دوڑائی۔ اور اپنے اس نوزائیدہ بچے کو دیکھنے کی کوشش کی جو اس سے آہستہ آہستہ قریب ہو رہا ہے۔ یہ نوزائیدہ بچہ نیا اشتراکی "عرب انسان" ہے۔

وہ تمام بیمار دل اقدار جو معاشرہ میں پائی جاتی ہیں دراصل جاگیرداری، سرمایہ داری اور استعمار کی پیدا کردہ ہیں۔

وہ قدریں جنہوں نے "عرب انسان" کو ایک سست و کاہل، پست ہمت، معطل اور تقدیر کے سامنے سر جھکا دینے والا انسان بنا دیا ہے۔ ایک ایسا انسان جس کو بس صرف لاحول ولا قوۃ الا باللہ العظیم کہنا آتا ہے۔

نئی قدریں جو نیا عرب انسان پیدا کریں گی وہ خود اس ستم رسیدہ اور بائی انسان کے اندر سے ابھری ہیں۔ ایک بھوکے، ایک نئے انقلابی۔ اور

اشتراکی انسان کے وجود سے پیدا ہوتی ہیں۔ جو انسان اور صرف انسان پر عقیدہ رکھتا ہے۔

عربوں کی تہذیب کی تعمیر اور عربی معاشرے کی تشکیل کا واحد راستہ ایک نئے اشتراکی عرب انسان کی تخلیق ہے جس کا عقیدہ یہ ہو کہ اللہ، مذاہب اور جاگیرداری و سرمایہ داری، استعمار غرض وہ ساری قدریں جو قدیم سوسائٹی پر حکمران تھیں۔ صرف تاریخ کے میوزیم کی ممی کی ہوئی لاشیں ہیں۔۔

جب ہم یہ شرط لگاتے ہیں کہ ہمارے نئے انسان کو ساری سابق قدروں کا انکار کردینا چاہیے تو ہم پر یہ بھی لازم ہے کہ اس کو کچھ نئی متعین قدریں دیں۔ اور وہ ہے نئے قدری انسان پر ایمان مطلق"، وہ انسان جو صرف اپنے وجود پر، اپنے عمل پر اور اس چیز پر جو وہ انسانیت کو عطا کرتا ہے۔ اعتماد رکھتا ہے۔ اس لئے کہ وہ جانتا ہے اس کا لازمی انجام موت ہے، موت کے سوا کچھ نہیں۔ پھر نہ دوزخ ہوگی نہ جنت بلکہ وہ ایک ذرہ ہوجائے گا۔ جو زمین کے ساتھ گردش کرتا رہے گا۔ اس لئے کہ وہ اس پر مجبور ہے کہ جو کچھ اس سے ہوسکے وہ بلا کسی اجرت اور معاوضہ کے (مثلاً جنت میں کوئی چھوٹی سی جگہ) اپنی قوم اور انسانیت کو پیش کردے"۔

(ماخوذ از مقالہ "الانسان العربي الجديد
از ابراہیم خلاص رسالہ جیش الشعب) (دمشق)

اس قومیت کا نشہ تمام عربوں میں اپنے تناسب اور فرق مراتب کے ساتھ عام ہے۔ اور ان کے لیڈروں اور فکر و ادب و سیاست کی ممتاز شخصیتوں نے اپنی ساری صلاحیتیں اور طاقتیں اس پر مرکوز کردی ہیں حالانکہ یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور غصہ کو کھینچنے والی اور اس کی نصرت و تائید کو ختم کرنے والی ہیں۔ قرآن مجید نعمت کو ٹھکرانے والوں اور ناشکری کی راہ اختیار کرنے والوں پر وعید وبال کی آیتوں سے بھرا ہوا ہے۔

واذ تاذن ربکم لان شکرتم لازیدنکم
ولان کفرتم ان عذابی لشدید۔

ترجمہ:۔ "اور اعلان ہے تمہارے پروردگار کا اگر تم نے شکر کی راہ اختیار کی تو میں اپنی نعمتوں میں اور اضافہ کروں گا اور تم کفران و ناشکری کی راہ پر چلے تو ایسوں کے لیے میرا عذاب بہت شدید ہے"۔

جب کہ اسلام کی نعمتوں سے بڑھ کر اور کوئی نعمت اور ایمان کی دولت سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے،

واذکروا نعمت اللہ علیکم اذ کنتم
اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم
بنعمتہ اخوانا وکنتم علی شفا حفرۃ
من النار فانقذکم منہا کذالک

يبيّن الله لكم ايٰته لعلكم تهتدون ہ"

ترجمہ: "اور یاد کرو اس نعمت کو جس سے اللہ نے تم کو نوازا جبکہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ تو اللہ کی عنایت سے تم بھائی بھائی ہو گئے۔ اور تم بالکل جہنم کے کنارے پر تھے (قریب تھا کہ اس میں جا گرتے۔) تو اللہ نے تم کو اس سے نکال لیا۔ اللہ اسی طرح اپنی آیات تم سے بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت کی راہ اپنالو"

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

: تم نے کیا ان تباہ کاریوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے اللہ کے احسان کو ناشکری سے بدل دیا اور اپنی قوم کو تباہی کے گڑھے میں اتار دیا"

تیسرا سبب تقریباً ہر عربی ملک میں فوجی حکومت کا قیام، انقلابات اور بغاوتوں کا وہ سلسلہ ہے جو ختم ہونے کو نہیں آتا۔ ان منحوس مسلسل اور پے در پے انقلابات نے ان ملکوں کو اپنے بہترین فوجی قائدین اور سیاسی لیڈروں سے۔ (جو اپنی تجربہ کاری فائق اور سیاست و جنگ دونوں کے سرد گرم جھیلے ہوئے اور دونوں کے نشیب و فراز سے اچھی طرح آشنا تھے۔) محروم کر دیا۔ اور ان جنگ آزمودہ اور تجربہ کار فوجی و سیاسی شخصیتوں کی ایک بہت بڑی تعداد ان انقلابات اور مطلق العنان جابرانہ حکومتوں کی نذر ہو گئی۔ ان میں بہت سے قتل کر دیئے گئے جو باقی بچے وہ جلاوطن کر دیئے گئے۔ یا اپنی جان و ایمان اور عزت و آبرو لے کر خود اپنے ملک سے نکل گئے اور اس کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ گئے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج یہ ملک سخت قسم کے قحط الرجال کا شکار ہیں۔ اور ان کے یہاں ممتاز و فائق قائدین کا ایک مستقل مسئلہ پیدا ہو گیا ہے اب وہاں صرف ایک پارٹی اور ایک ٹولی کی حکومت ہے۔ اور صرف ایک نقطۂ نظر کو پھیلنے پھولنے کی اجازت ہے۔ ان مطلق العنان اور آمرانہ حکومتوں نے (جو انتہا پسندانہ اشتراکی حکومتوں کی شاگرد اور مقلد تھیں) سب سے بڑا کام اپنے پیش نظر یہ رکھا کہ ملک میں ہر اٹھتی ہوئی آواز ہر دھڑکتے ہوئے دل اور ہر چلتی ہوئی نبض کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا جائے اور وہ کانٹا ہی نکال دیا جائے جو پہلو میں چبھ سکتا ہو۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورے پورے ملک ایسے فوجی کیمپ بن گئے جس میں صرف ایک یونیفارم اور ایک نظام کی اجازت تھی یا ایک بہت بڑا قید خانہ جس میں نہ کوئی زندگی تھی نہ تنوع۔ ریڈیو اور صحافت صرف سرکاری احکام و اعلانات اور حکومت

کے موقف کی تبلیغ کا ایک ایسا بے زبان ذریعہ تھا جس کا کام صرف یہ تھا کہ اس کو جو کچھ حکم ہو وہ دہراتا رہے اور حکومت کی آواز کے لئے آلہ مکبّر الصوت کا کام دے۔ دینی جماعتوں کا تعاقب اور ان کا مقابلہ خاص طور پر کیا گیا اور وحشیانہ مظالم تعذیبیں اور قید و جلاوطنی سب سے زیادہ انہی کے حصے میں آئی۔ اور ملک کے طول و عرض میں کوئی ایک آدمی ایسا باقی نہ بچا جو اچھے کو اچھا اور برے کو برا کہہ سکے۔ اور حکومت کو اس کے غلط اقدامات پر ٹوک سکے وہاں صرف ایک آواز سنائی دیتی تھی۔ اور وہ تحسین و آفرین اور بجا و درست کی آواز تھی۔ پورے ملک میں ڈھونڈھنے پر کوئی ایسا مردِ حق نہ ملتا جو ایک معمولی فوجی افسر یا حاکم سے بلکہ صحافی و ادیب سے یہ کہہ سکتا کہ "خدا سے ڈرو! اور اپنے ملک اور اپنی ملت کے ساتھ ایسا معاملہ نہ کرو۔

ان حکومتوں کو اس کی زیادہ فکر تھی کہ ایمانی قوت اور اسلامی جوش کے سرچشموں کو کس طرح خشک اور ناکارہ بنا دیا جائے۔ اس کی فکر کم تھی کہ فساد و الحاد کے سدباب کے لئے کیا ذرائع اختیار کئے جائیں، مجرموں، خائنوں اور بدکرداروں کو کیا سزائیں دی جائیں یہ حکومتیں جو جمہوریت و اشتراکیت کی دعویدار تھیں۔ دراصل شخصی، جابرانہ اور ظالم حکومتوں کی بدترین شکلوں پر قائم تھیں۔

ان آمرانہ اور مطلق العنان حکومتوں کو چرب زبانی یاوہ گوئی، شعلہ نوائی، دل فریب وعدوں پُر فریب نعروں اور ہنگامہ خیز دھمکیوں سے بے حد شغف تھا۔ اپنی مسلح فوجوں، جدید اسلحہ، جنگی اسپرٹ، مہم جوئی اور سنجیدہ فوجی تیاری سے زیادہ اعتماد اور بھروسہ ان کو اپنے بیانات تقریروں اور صحافت و نشر و اشاعت کے ذرائع پر تھا اور اس کا تناسب اتنا بڑھ گیا کہ سننے والے عاجز اور بیزار ہو چکے تھے۔ اور غیر ملکی ماہرین اور مخالف مبصرین اس کا مذاق اڑانے لگے تھے۔ حد یہ ہے کہ اسرائیل تک کو تنگ آکر اپنے ریڈیو سے کہنا پڑا کہ خوب لیکچر دیتے رہو۔ اور افسانے گھڑتے رہو جب وقت آئے گا تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اسرائیل کون ہے؟ یہ عمل کا وقت ہے قول کا نہیں۔ نرے دعووں سے کچھ نہیں ہوتا۔

متحدہ عرب جمہوریہ کی حکومت اس فن میں خاص طور پر سب سے زیادہ مشاق تھی۔ اور اس کی اصل فوج ریڈیو اور صحافت تھی جس سے تمام عرب لیڈر اور حکومت کے سربراہ خائف رہتے تھے۔ یہ ایک ایسی زبردست کلامی جنگ ہوتی تھی جس میں ایک دوسرے کی ہجو گالیاں دینے، نئے نئے نام رکھنے، فرضی دستاویزات تیار کرنے اور جھوٹے واقعات کو سچے بنا کر پیش

کرنے میں سخت مقابلہ ہوتا تھا اور بازی اس میں متحدہ عرب جمہوریہ کے ہاتھ رہتی تھی۔ جس طرح وہ ادب و ثقافت کے دوسرے میدانوں میں آگے تھا۔ اسی طرح اس میں بھی آگے تھا اور اس کے پاس پیشہ ور ادباء، ماہر اہل صحافت اور نہ تھکنے والے اناؤنسروں اور شعلہ بیان مقرروں کی اتنی بڑی تعداد جمع ہو گئی تھی جو کسی عرب ملک میں تو کیا مشرق کے کسی اور ملک میں بھی نہ ہوگی۔

اس کے علاوہ ان حکومتوں اور ان کے قائد متحدہ عرب جمہوریہ کو خارجی قوتوں اور ان بین الاقوامی حالات پر پورا بھروسہ تھا جس کی وجہ سے متحدہ عرب جمہوریہ کے صدر نے بظاہر سویز کی بازی جیت لی تھی اور اس ہتھیار کو ہر موقع پر استعمال کرنے لگے تھے۔ اس فضا اور ان حالات میں اور اس کردار اور ان رجحانات کے ساتھ یہ فیصلہ کن وقت آگیا اور اس حالت میں آیا کہ عرب حکومتیں ان تمام امراض میں گرفتار بلکہ زار و نزار تھیں اور روحانی افلاس، اخلاقی انحطاط، قحط الرجال دینی جذبہ، اسلامی غیرت وحمیت اور اتحاد و ہم آہنگی کے نقصان کی وجہ سے کمزور اور نڈھال ہو چکی تھیں۔ آخر وقت تک وہ اس لڑائی کو (عین وقت کو چھوڑ کر) عربیت کی لڑائی، تقدیر کی لڑائی اور نئی عرب نسل کی لڑائی کہتی رہیں۔ ان

میں وہ انابت وخشوع، توجہ الی اللہ اور اس کی رحمت و نصرت کی طلب اور اس کے آستانے پر جبیں فرسائی اور اعتراف تقصیر اور اس پر کامل اعتماد اور بھروسہ اور ساری دلیلوں اور طاقتوں کو چھوڑ کر صرف اس پر سہارا لینا اور ندامت و استغفار اور توبہ و اعتراف کی وہ عام فضا پیدا نہ ہو سکی جو ان کے اسلاف کرام کا طریقہ اور دستور تھا۔ اور جس کے متعلق قرآن مجید کی ہدایت وارشاد ہے۔

ترجمہ: اے ایمان والو! جب دشمن کے لشکر سے تمہاری ٹکر ہو تو ثابت قدم رہو اور مضبوطی سے مقابلے میں جمے رہو اور اس وقت تک اللہ کے ذکر کی کثرت کرو، امید رکھو کہ تم کامیاب ہو گے اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی پوری فرمانبرداری کرو اور آپس میں اختلاف نزاع نہ کرو۔ اگر ایسا کرو گے تو تمہارے دلوں میں کمزوری آجائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر و برداشت سے کام لو۔ اللہ صبر والوں کے ساتھ ہے اور تمہاری روش ان لوگوں کی سی نہ ہو جو اپنے گھروں سے اکڑتے ہوئے چلے اور نمائش کرتے ہوئے ۔۔ ... اور بندوں کو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔ اور اللہ ان کے کرتوں سے پوری طرح باخبر ہے۔ ان کی کوئی بات بھی اس کے علم محیط سے باہر نہیں۔ (سورہ انفال)

ڈاکٹر سید عبداللہ

حقیقت کھل جانے کے بعد

مشرق وسطیٰ کے تازہ واقعات و حادثات پر نظر ڈالی جائے تو سب سے پہلے وہ اسباب سامنے آتے ہیں جو خود عربوں کی طرف سے اپنی شکست کے ضمن میں بیان کئے جاتے ہیں۔ اسباب حسب ذیل ہیں :-

- امریکہ اور برطانیہ نے اسرائیل کی خفیہ امداد کی۔
- امریکہ اور برطانیہ نے مصر کا آلہ جہاز نما (راڈار) خراب کر دیا۔
- روس نے توقع کے خلاف عربوں کا ساتھ نہ دیا اور اس طرح اسرائیل کو بڑی آزادی سے اپنی فوجی طاقت کے مظاہرے کا موقعہ مل گیا۔

یہ وہ اسباب ہیں جن میں شکست کی ساری ذمے داری دوسروں پر یا خارجی عوامل پر ڈالی گئی ہے البتہ بعض دوسرے لوگوں نے ان داخلی اسباب کا بھی سراغ لگایا ہے جن کا تعلق خود عربوں کی داخلی کمزوریوں سے ہے مگر یہ اسباب بھی وہ ہیں جنہیں قریبی اسباب کہا جاتا ہے مثلاً یہ کہا جا رہا ہے کہ :-

— عرب حکومتوں کی افواج میں کوئی باہمی ارتباط نہ تھا۔

- عربوں کی خصوصاً مصر کی فوجی خبر رسانی کمزور اور ناقص تھی۔
- عربوں کی فوجی تربیت اور عسکری تنظیم و ادارت کمزور تھی۔
- عربوں کے پاس جدید ہتھیار تو تھے مگر ان کے استعمال سے وہ مانوس نہ تھے۔
- عربوں نے فوج کی تنظیم پر کم روپیہ خرچ کیا حالانکہ ان کے پاس وسائل موجود تھے اور آخر میں یہ کہ :-
- عربوں میں دلی اتحاد نہ تھا۔ وہ اگرچہ عارضی طور پر متحد ہو گئے مگر ان کے دل پھٹے ہوئے تھے اس لئے کوئی موثر متحدہ محاذ قائم نہ ہو سکا۔

نصب العین واضح نہیں

یہ ہے اسباب کی ایک اور فہرست مگر ارباب نظر کو معلوم ہے کہ ان میں سے بیشتر باتیں قریبی کا درجہ رکھتی ہیں یعنی ان کی حیثیت مرض کی علامات کی ہے۔ یہ خود مرض نہیں بلکہ مرض کے لازمی نتیجے ہیں۔ لہٰذا ان سطحی باتوں سے ہٹ کر ان گہرے عوامل پر نظر ڈالنی

لازمی ہے، جن کے زیر اثر اکثر ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں جن سے متعلقہ اسلامی ملکوں کی قومی زندگی اکثر زیر و زبر ہو جاتی ہے۔

میری رائے میں ایک بہت بڑا اور گہرا سبب یہ ہے کہ مسلمان اقوام کا عموماً اور عرب ممالک کا خصوصاً نصب العین اور تصور واضح نہیں وہ ذہن اور نظریے کے معاملے میں تضاد کے شکار ہیں اس تضاد کے ساتھ ساتھ نقطہ نظر اور عمل کا اختلاف لازم ہو جاتا ہے اور اسی سے وہ انتشار رونما ہوتا ہے جس کا رونا ہم رو رہے ہیں اور جو صرف ایک ہی حادثے کا ذمہ دار نہیں بلکہ اس قسم کے بے شمار واقعات اسی کے باعث ظہور میں آئے ہیں۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو عالم اسلام کی بدنصیبیوں کا روز آغاز اٹھارویں صدی کا زمانہ قرار پاتا ہے بلکہ شاید اس سے بھی پہلے صلیبی جنگوں کے فوراً بعد سے جب یورپ کی علمی، فنی اور سائنسی ترقی شروع ہوئی، اہل یورپ نے اپنی صلیبی شکستوں کے اسباب پر عقلی نظر ڈالی اور ان کا بدلہ لینے کے لئے عقلی اور سائنسی ذرائع اختیار کئے دوسری طرف بدقسمتی سے صلاح الدین ایوبی کے بعد مسلمان یہ سمجھ بیٹھے کہ صلیبی لڑائیاں ختم ہو گئیں مگر اہل یورپ کے نزدیک ان لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا اگرچہ نام اور صورت بدل گئی، اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اہل یورپ کے لئے درپردہ یہ جذبات اور عقائد کا مسئلہ تھا لیکن انھوں نے اس جذباتی مسئلے میں کامیابی کے لئے عقلی اور سائنسی طریقے اختیار کئے۔

ملّی وحدت کی جگہ نسل و جغرافیہ

ان طریقوں میں اہم بات یہ بھی کہ میدان جنگ میں لڑائی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے فکری اور داخلی محاذ پر جدید علوم کے نام سے بھرپور حملہ کیا گیا۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ اسلام کی اپیل کو جو اتحاد بین المسلمین کی ضامن ہو سکتی تھی کمزور کر کے ایسی متبادل جذباتی صورتوں کو ابھارا جائے جن کی مدد سے مخاطبوں کو اس طرح مشتعل کیا جا سکتا ہو کہ ان کے زیر اثر مخاطب روحانی اپیل کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہو جائیں اور کسی قریبی نفع یا محدود جذبے پر بڑے مقصد کو قربان کر دیں۔ انہی ذرائع میں سے ایک نیشنلزم کا عقیدہ بھی ملی وحدت کے بجائے نسلی اور جغرافیائی حد بندی کو زائد از حد اہمیت دیتا ہے

جن لوگوں کو انیسویں بیسویں صدی کے واقعات یاد ہیں وہ شہادت دیں گے کہ یورپ کی یہ ایجاد سب سے زیادہ ترکی سلطنت کے خلاف استعمال ہوئی چنانچہ اسی نسلی اور جغرافی اساس کی بنا پر تھوڑے ہی عرصے میں ترکوں کی وسیع سلطنت پارہ پارہ ہو گئی تاآنکہ اسی اساس پر عربوں نے بھی ترکی سے علیحدگی اختیار کی بلکہ ۱۹۱۴ء کی جنگ میں سخت بے وفائی کا مظاہرہ کیا۔

اس وقت بحث یہ ہے کہ مغربی طاقتوں نے رنگ و نسل کے جھگڑے اٹھا کر عالم اسلام کو پارہ پارہ کر دیا ۔۔۔ سوال یہ ہے کہ مسلمانوں نے یہ زہریلا اثر کیوں قبول کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس وقت

میں اکثر مسلمان اقوام کے سامنے صرف زیادہ تر یہی گروہی اور انفرادی مقصد تھا ۔۔ اسلامی دنیا کا کوئی مشترکہ مقصد موجود نہ تھا ۔۔ یہ گروہی اور انفرادی اور نسلی یا محض جغرافیائی رنگ میں سوچنے کا نتیجہ وہ ہوا جو آج ہمارے سامنے ہے ۔ عرب اپنی ذات یا اپنے خاندان کے لئے سوچنے لگے ۔۔ بالآخر ترکوں کو بھی اس انداز پر سوچنا پڑا اور رفتہ رفتہ یہ وبا تمام عالمِ اسلام میں پھیل گئی ۔

پاکستان میں علاقائی نعرے

اور عبرتناک صورت حال یہ ہے کہ پاکستان میں جس کی دعوت میں اسلام کا نام بڑھ چڑھ کر استعمال ہوا یہ نسلی، علاقائی اور گروہی تعصبات پوری مسلمان قوم کی آنکھوں کے سامنے دن دھاڑے پھیلائے جا رہے ہیں، بلکہ بعض اوقات اہل اقتدار کے زیرِ سایہ دیدہ دلیری سے پھیلائے جا رہے ہیں ۔۔ ۔۔ آپ جانتے ہیں کہ ان خیالات کی کامیابی کا مطلب کیا ہوگا پنجاب پنجابیوں کے لیے ہے، سندھ سندھیوں کے لیے ہے، بنگال بنگالیوں کے لیے ہے، پشاور اور پشتو زبان علاقہ پشتونوں کے لیے ہے ۔۔ ۔ اور سادگی دیکھیئے کہ یار لوگ ساتھ ساتھ یہ بھی باور کراتے ہیں کہ ان علاقائی نعروں سے ہم وحدت کی جڑیں مضبوط کر رہے ہیں ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

ما حصل کلام یہ ہے کہ عربوں ہی کا نہیں جملہ عالمِ اسلام کے انتشار کا موثر ترین سبب، یہی نسلی قومیت کا بے جا تعصب تھا جو یورپ کے مصنفوں اور عالموں نے اپنی کتابوں میں خوبصورت طریقے سے اور یورپ کے ماہرین سیاست نے اپنے دجل اور دسیسہ کاری سے پھیلایا اور عالمِ اسلام میں بھائی کو بھائی سے لڑا کر اپنے استعمار کے راستے کشادہ کیے، ذاتی قبائلی یا گروہی خود غرضی کی یہ تقدیر ہے کہ اس کا مریض بہت جلد بک جاتا ہے ۔ ۔ ۔ اور خریدنے والے کی یہ عادت ہے کہ وہ زر خریدہ کو سر پر چڑھنے نہیں دیتا ۔ بہت جلد اس کو رد کر کے دوسرے مریض کو خرید لیتا ہے ۔ مگر اس طرح کہ کام ان مریضوں کے اندرونی مرضِ رقابت سے لیتا ہے ۔ وہ یہ سمجھ رہے ہوتے ہیں ہم اپنی نسل کی خدمت کر رہے ہیں مگر اصل میں خدمت خریدنے والے کی ہو رہی ہوتی ہے ۔۔

... عالمِ اسلام کی آخری دو صدیوں کی تاریخ اس قسم کے واقعات سے لبریز ہے

عرب دنیا کی موجودہ پریشانیوں کا ایک بڑا سبب یہی تصورِ قومیت ہے جو پہلے غیر عربوں کے خلاف اور بعد میں خود عربوں کے اندر باہمی منافرت کے شعلے بھڑکاتا رہا ہے ، میری رائے میں اس صورتِ حال کا مداوا یہ ہے کہ عرب اور مسلمان اقوام پہلے اپنے تصوّر اور نظریہ کی اصلاح کریں ۔ اپنے نصب العین کو متعین کریں اور پھر جذبے اور عقیدے کے ان مسئلوں کی کامیابی کے لیے عقلی اور سائنسی ذرائع

اختیار کریں۔

اسلامی قومیت کیا ہے؟

یہاں پہنچ کر قومیت کے مسئلے کی مزید وضاحت لازمی ہو جاتی ہے، یہ وضاحت پاکستان کے دانشوروں کے مغالطوں کے دُور کرنے کے لیے بھی ضروری ہے۔ اسلامی قومیت کیا ہے؟ سادہ لفظوں میں اِسلام کے عقیدے کو اخوت، وحدت اور قومیت کی اساس بنانا۔ یعنی یہ یقین رکھنا کہ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ اس لیے ایک قوم ہیں، یہ اسلامی قومیت کا وسیع تصور ہے اور اس کو مثالی نصب العین کا درجہ حاصل ہے لیکن اس صورتِ حال کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ اس مثالی نصب العین تک یک دم پہنچنا دشوار ہے۔ لہٰذا مثالی نصب العین کے عملی مراحل اور اس کی عملی صورتوں کو بھی عارضی اور عبوری حد تک قبول کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً وسیع تر اسلامی عقیدے کے ساتھ ان نسلی اور قبائلی احساسات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو انسانی طبیعتوں کا جزو ہیں۔ لہٰذا موجودہ حالات میں اسلامی قومیت کو ایک طرح کی بین الاقوامیت تسلیم کر کے اوطان کو محدود قومیت کی بنیاد ماننا پڑے گا۔ لیکن یہ یاد رہے کہ اس وطنی اور نسلی قومیت میں بھی وسیع تر تصورِ قومیت برقرار رہنا چاہیئے اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان اقوام کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی اپنی حدود میں رہ کر اسلامی عقیدے کی بنا پر ایک وفاق قائم کریں۔ اس کے اجزاء داخلی طور پر آزاد ہوں مگر خارجی اور برتر مقاصد کے لیے متحد ہوں۔

اِسلامی بین الاقوامیت کا وفاق

اس وقت اسلامی بین الاقوامیت کو برقرار رکھنے کے لیے ایسے وفاق کی فوری ضرورت ہے اس وفاق کی بنیادی اور کم سے کم شرطیں تین ہوں گی:۔

● ۔ تمام مسلمان ممالک مل کر ایسا نظام وضع کریں جس کے ذریعے آپس کے مسئلوں اور مشترکہ ضرورت کے امور پر تبادلہ خیال ممکن ہو۔

● ۔ اس میں لازم ہو کہ ہر ملک اپنے معاملات میں کاملاً آزاد ہو۔ اس استثنا کے ساتھ کہ کوئی مسلمان ملک کسی بھی دوسرے مسلمان ملک کے خلاف کسی میثاق میں شرکت نہ کرے بلکہ ضرورت کے وقت عملی یا اخلاقی امداد سے گریز نہ کرے۔

● ۔ اس وفاق میں کسی ملک پر یہ پابندی نہ ہو کہ وہ دُنیا کے دوسرے بلاکوں سے ہر طرح الگ رہے۔ ہر مسلمان ملک اپنے حالات کے تحت دوسری اقوام سے دوستی کر سکتا ہے بشرطیکہ یہ دوستی کسی مسلمان ملک کے خلاف نہ ہو۔ اس وفاق میں شرکت کرنے والی مسلم اقوام کا آئینِ قانون، نظام تمدن اس کے اپنے حالات کے مطابق ہوگا۔

لیکن یہ قدرتی امر ہے کہ اسلامی آئین وقانون کے اثرات غالب ہوں گے۔ جب اسلامی قانون کا

ذکر کرتے ہیں تو اس سے مراد جمہوریت، مساوات اور عام شہری عدل و انصاف ہوتا ہے۔ اس سے مراد نہ آمریت ہے نہ سرمایہ داری، اور نہ اُمراگردی۔ اس کا مطلب ہے اسلام کی جمہوریت ظاہر ہے کہ امن و فاق کی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ سب مسلمانوں کا بنیادی اسلامی عقیدہ محکم ہو، یعنی اسلام کو برحق اور ازلی ابدی حقیقت تسلیم کرنا پڑے گا۔ اس عقیدے پر قائم رہ کر داخلی اور خارجی معاملات میں عقل و تدبیر سے کام لینا پڑے گا۔ آج تک یہ ہوتا رہا ہے کہ جہاں عقیدہ ہے وہاں عقل و تدبر رخصت اور جہاں عقل مندی کا بخار چڑھتا وہاں عقیدہ غائب۔ کم از کم گذشتہ تین چار صدیوں میں ہم یہی دیکھ رہے ہیں عقیدے پر محکم رہ کر مسئلوں کو عقلی انداز سے میں دیکھنا اور سوچنا عالمِ اسلام کا اولین فرض ہے۔

آئندہ کی شکستوں سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ مُسلمان اقوام ان سائنسی ایجادات سے باخبر اور مسلح ہوں جن کی مدد سے یورپ اور امریکہ کے لوگ اس وقت دنیا سے اپنا غلبہ تسلیم کرا رہے ہیں سائنسی علوم کا گہرا مطالعہ اس تیاری کا ایک حصہ ہیں جو سالمیت کے تحفظ اور جارحیت کے مقابلے کے لیے ضروری ہے سائنسی علوم میں مہارت کا مطلب بد وضع اور بدعقیدہ ہونا نہیں، جیسا کہ بعض لوگ سمجھ رہے ہیں یا جیسا کہ آج کل معمول ہے۔

بقیہ ۱۴۴ پر

بقیہ چند آنسو

میں بدل ڈھونڈھنا چاہیئے۔

(۹) مسلمان ملکوں میں باہمی صنعتوں پر روپیہ لگانا چاہیئے۔

(۱۰) یورپ کی طرح اسلامی ملکوں کی ایک مشترکہ مارکیٹ قائم کرنی چاہیئے۔

(۱۱) باہمی فوجی تربیت ہونی چاہیئے مثلاً ایک دوسرے کی فوجی تربیت کے لئے . . . . ایک دوسرے کو امداد دینی چاہیئے۔ ممکن ہو تو باہم مگر فوج کے دروازے کھول دیئے جائیں۔ مثلاً برطانوی عہد میں مرحوم پنجاب کا سپاہی انگریزوں کے لیے کس محاذ پر نہیں گیا کیا آج اِسلام کے لیے مسلمان ملکوں کے مسلمان فوج میں اکٹھے نہیں ہو سکتے۔

(۱۲) اِسلام کو ایک ذہنی تحریک کے طور پر عام کرنا چاہیئے اس کے لیے تمام اسلامی ملکوں کا ایک مشترکہ سرمایہ فراہم ہونا چاہیئے

(۱۳) آپس میں تمام اسلامی ملکوں کے عوامی روابط تیز ہونے چاہئیں۔

(۱۴) لادینی عناصر کو جو اسلام کے نام پر یورپی فکر و دانش کی انتشار پسند قوت کا فرض انجام دیتے ہیں سختی سے روک دینا چاہیئے اور اس قسم کی آزادی کو جرم قرار دینا چاہیئے جس سے دینِ حقہ سے بغاوت کی روح پیدا ہوتی ہو۔

شورش کاشمیری

چند آنسو

نشیمنوں پہ بجلیوں کا کارواں گذر گیا

اسلام کی رسوائی

سوال یہ نہیں کہ عربوں کو شکست ہوئی ہے ملال یہ ہے کہ اسلام کی رسوائی ہوئی ہے۔ عربوں کی پسپائی صرف عربوں کی پسپائی نہیں تمام دنیا کے مسلمانوں کی پسپائی ہے۔ ممکن ہے اس وقت اس کا احساس عرب ممالک سے باہر کی مسلمان ریاستوں کے خاص عناصر کو نہ ہو لیکن یہ صورت حال باقی رہی تو اس کے نتائج و آثار جلد آشکار ہوں گے۔ واقعۃً یہ ایک افتاد، ایک المیہ، ایک سانحہ، ایک حادثہ اور ایک مصیبت عظمیٰ ہے جس سے تمام دنیا کے مسلمانوں کی متحدہ قوت ہی عہدہ برآ ہو سکتی ہے۔

کیا عربوں سے غداری ہوئی؟

کیا ہم اپنے دل کو صرف اس خیال سے تسلی دے لیں کہ عربوں سے غداری ہوئی ہے؟ اور اس غداری کے بہت سے پہلو ہیں۔ انگریز اور امریکی تو ظاہر ہے کہ اسرائیل کے معاملہ میں عربوں کے ساتھ نہیں تھے اسرائیل کا حرامی بچہ ان کے تخم ہی سے تولد ہوا۔ اور پھر انہی کی دایہ گری سے پروان چڑھا ہے۔ روس نے بھی زچگی کے وقت اس کا ساتھ دیا تھا۔ اور فرانس بھی نہر سویز کے معرکے تک اس کا معاون و مددگار رہا۔ غرض یورپ کے تمام عیسائی ممالک عملاً اور ذہناً اس کے پشت پناہ ہیں۔ . . . پھر افریقہ و ایشیا کے وہ نا مسلمان ملک جو امریکی اور برطانوی اثرات کے ہمنوا اور ہم خیال ہیں۔ قلباً اسرائیل کے ساتھ ہیں ۔ ۔ ۔ تاہم ان چار دنوں میں عربوں کو جس مصیبت عظمیٰ اور قیامت کبریٰ کا سامنا کرنا پڑا جارحیت کی حد تک اس کے ذمہ دار برطانیہ اور امریکہ ہیں۔ روس نے جس کردار کا مظاہرہ کیا وہ انتہائی شرمناک ہے۔ جس سے نہ صرف اس کی عالمی ہوا اکھڑ گئی بلکہ اب وہ کسی دائرے میں بھی بھروسہ کے قابل نہیں رہا لیکن عربوں پر جو افتاد پڑی اس کو صرف اس لیے ہلکا نہیں کیا جا سکتا کہ بڑی طاقتوں نے عربوں کا دوست اور دشمن بن کر انہیں ہروایا ہے حقیقۃً خود عرب بھی اس رسوائی و پسپائی کے ذمہ دار ہیں۔ چنانچہ شاہ حسین والئ اردن نے بھی اس کی نشاندہی کی ہے۔ ناصر نے بھی ہلکی سی نقاب اٹھائی ہے۔ شاہ حسن والئ مراکش نے صریحی الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ انہوں نے ۱۲ جون کے ایک بیان میں

فرمایا:

۱۔ عربوں کو اپنے اختلافات اور انتشار کے باعث ناکامی ہوئی۔

۲۔ خدا نے ہمارے اعمال بد کی سزا ہمیں دی اور خبردار کیا ہے کہ ہم آپس میں متحد نہ ہوتے تو اس کا نتیجہ بجز تباہی و بربادی کے اور کچھ نہیں،

۳۔ جو کچھ ہوا ہماری غلط کاریوں، ہمارے نفاق اور ہمارے گناہوں کی سزا ہے۔

۴۔ ہم بارہا تقریر و تحریر کے ذریعہ ایک دوسرے کی توہین کے مرتکب ہوئے ہیں جس سے ضعف پہنچا ہے۔

۵۔ ہم نے خدا سے رشتہ توڑا نتیجتاً خدا نے بھی ہم سے رشتہ توڑ لیا۔

داخلی محرکات

شاہ حسین نے جس امر کی نشاندہی کی ہے وہ بجائے خود صحیح ہے لیکن عربوں کی ہزیمت کا باعث اور آثار و اسباب بھی ہیں۔ مثلاً

۱۔ سب سے بڑی وجہ عرب ملکوں کا مربوط ہو کر منقسم ہونا اور منقسم رہنا ہے۔

۲۔ حقیقتہً عرب ریاستیں عرب ریاست نہیں رہیں بلکہ برطانوی عہد کے ہندوستان کی ریاستوں سے (بہ تفاوت) مشابہ ہیں۔

۳۔ عرب ریاستوں کا موجودہ مملکتی نظام بھی اس کا ذمہ دار ہے۔

(ا) ابھی تک مشرق وسطیٰ کی یہ ریاستیں قرونِ وسطیٰ میں زندگی بسر کر رہی ہیں۔

(ب) اس کے فرمانرواؤں کا ملکی وسائل پر بلا شرکت قبضہ، ذاتی منشا و مرضی کے مطابق صرفہ اور اپنے صوابدید پر نظام حکومت کی تشکیل بھی اس عظیم سانحہ کا حصہ ہیں۔

(ج) یہ زمانہ نہ بادشاہت کا ہے نہ آمریت کا، دونوں تنہا اپنی شخصیت پر اعتماد کرتی ہیں۔ دونوں کے پیش نظر اپنی ذات کا بچاؤ مقدم ہوتا ہے

۴۔ عربوں کی بے پناہ دولت شخصی ملکیت ہو کر رہ گئی ہے۔ ملکی وسائل حکمرانوں کی ذاتی آمدنی کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔ افسوس کہ اس آمدنی سے ملک کی ترقی و استحکام کے لیے کوئی کام نہیں لیا جا رہا۔ صرف ظواہر کو ملحوظ رکھا جاتا اور "تہذیبی ترقی" ہی کو سب کچھ سمجھ لیا گیا ہے۔ حد یہ ہے کہ اس "تہذیبی ترقی" سے صرف ایک محدود جماعت متمتع ہوتی ہے۔ عرب عوام معاش و تہذیب دونوں سے محروم ہیں۔

۵۔ بیشتر عرب ممالک کا اربوں روپیہ بنک آف انگلینڈ اور امریکہ و یورپ کے بعض دوسرے بنکوں میں پڑا ہے۔ اس میں ہر سال بلکہ ہر ماہ بے پناہ اضافہ ہوتا ہے۔ ... لیکن اس روپیہ کا صحیح مصرف ایک دن بھی نہیں ہوا۔ کبھی ان ملکوں کے فرمانرواؤں نے غور ہی نہیں کیا کہ

۵۔ وہ اس دولت سے ملک میں صنعت و حرفت کی بنیاد رکھیں، کارخانے لگائیں اور جن ملکوں کو اپنا تیل دے رہے ہیں یا جن ملکوں کو ان کی جمع شدہ دولت معاشی طاقت مہیا کر رہی ہے ان سے مطالبہ کریں کہ وہ انہیں جدید اسلحہ کی فیکٹریاں لگانے میں مدد دیں۔ افسوس کہ اسرائیل کے قیام کی سفرتوں نے بھی ان میں یہ احساس پیدا نہ کیا۔ خطرے کا الارم بجاتے رہے لیکن خطرے کے تدارک کی عملی تدبیر نہ کی گویا انہیں احساس ہی نہیں تھا کہ دنیا اس وقت کہاں کھڑی ہے۔

صرف کویت ہی کو لیجیے اس کا رقبہ چھ ہزار مربع میل ہے آبادی صرف دو لاکھ ہے لیکن ہر ماہ اس کی پانچ کروڑ کے لگ بھگ تیل رائیلٹی بینک آف انگلینڈ میں جمع ہوتی ہے۔ بینک آف انگلینڈ کے سرمایہ کا بیس فی صد روپیہ صرف کویت کا ہے۔ اگر یہ روپیہ آج واپس لیا جائے تو بینک آف انگلینڈ کی ساکھ اور اعتماد دونوں کو شدید صدمہ پہنچ سکتا ہے۔ لیکن اس روپے کا مصرف کیا ہے؟ کہ دو لاکھ افراد کی اس ریاست میں بیس ہزار ایئر کنڈیشنڈ کاریں تو دوڑتی پھرتی ہیں لیکن عربوں کے دفاع استحکام اور حفاظت کے لیے سر و سامان مہیا کرنے کا کوئی انتظام نہیں۔ عملاً کویت امریکی اور برطانوی سیاست کا تابع مہمل ہے۔

دردناک پہلو

غور فرمائیے عربوں کے پاس بے اندازہ دولت ہے وہ نصف سے زائد عالمی زر مبادلہ کے مالک ہیں لیکن ان کی دولت خام مال کی صورت میں بھی ان طاقتوں کے ہاتھ فروخت ہوتی ہے جنھوں نے برطانیہ اور امریکہ کی شکل میں انھیں خوار کیا۔ اور اس خام مال سے جو روپیہ پیدا ہوتا ہے وہ بھی انہی ملکوں کے بینکوں میں جمع ہو کر یہود کی سرمایہ داری کے نشو و نما کا باعث بنا ہوا ہے۔

۱۔ لیکن اس روپیہ سے خود عربوں نے باہمی طور پر کوئی اقتصادی اشتراک کر کے فائدہ نہیں اٹھایا ۔۔۔۔۔۔ کوئی صنعت قائم نہیں کی۔

۲۔ مسلمان ممالک کے معاشی نشو و نما میں حصہ نہیں لیا۔

۳۔ اپنے گھر میں کوئی اسلحہ ساز کارخانہ نہیں بنایا کوشش ہی نہیں کی کہ ان کے ہاں بھی سائنسدان پیدا ہوں اور وہ اس زمانہ کی جنگ کے مطابق اسلحہ سازی کا انتظام کریں۔

۴۔ ان کی حیثیت پہلی صورت میں اسی شخص کی ہے جو اپنی متاع ہر حالت میں بیچنے کے لیے مجبور ہے۔ دوسری صورت میں اس خریدار کی ہے جس کو تاجر اپنی مرضی کے مطابق سامان دیتا ہے۔ اور وہ ایک عاجز خریدار ہے۔ ۔۔۔ ناصر کی حسرتوں میں یہ فقرہ کتنا حسرت ناک تھا کہ:

"ہماری سرزمین ہی کے اڈے
ہمارے خلاف استعمال کیے گئے

اور ہمارا تیل ہی امریکہ اور برطانیہ
کی بحریہ کو لے کر بحیرہ روم میں
دندناتا رہا۔"

یہ کسی عرب ملک کی غداری نہ تھی یہ اس المیہ کا حصہ تھا جس کا شکار برطانیہ اور امریکہ نے عربوں کو نصف صدی سے کر رکھا ہے۔

ایک اور المیہ

ایک المیہ عرب ملکوں کا یہ ہے کہ جن ملکوں کو اسرائیل نے ہدف اول بنایا اور حریف اول قرار دے رکھا ہے ان کے مالی وسائل اقتصادی ذرائع اور قومی آمدنی کا خارجی حصہ ان عرب ملکوں کے مقابلہ میں بہت کم ہے جو عربوں کی اصل اور بے پناہ دولت یعنی تیل کے سرچشموں کے ملکی لحاظ سے مالک ہیں۔ مثلاً سعودی عرب، عراق، کویت، بحرین، قطر! افسوس کہ ان کی بے پناہ دولت صرف بے پناہ دولت ہے۔ اس میں عربوں کی نشاۃ ثانیہ کا سر و سامان ہی نہیں۔ مصر، اُردن اور شام کے پاس اتنی ارزاں دولت نہیں گویا عرب ملکوں کی دولت عملاً اور معناً سامراجیوں کے تصرف اور قبضہ میں ہے۔ جن عرب ملکوں کی اسرائیل سے بلا واسطہ جنگ ہوئی وہ مقابلتہً ان وسائل سے محروم تھے۔ عرب سپاہیوں کو عرب سرمایہ سے مدد نہ مل سکی۔ جو اس سرمایہ کے قومی ہونے سے حاصل ہو سکتی تھی۔ عربوں کی غریب ریاستوں کا کچومر نکل گیا اور جن ریاستوں کے پاس سرمایہ تھا وہ اپنی تمام ہمدردیوں کے باوجود معاونت کے حقیقی میدان میں شرکت سے معذور، محروم یا مجبور رہیں۔ یہ ایک قابل عبرت المیہ ہے

عرب نیشنلزم

عرب نیشنلزم کے بارے میں ناصر کو اکثر ہدف تنقید بنایا جاتا ہے۔ اس گروہ میں مختلف قسم کے لوگ ہیں مثلاً:

۱۔ وہ مخلصین جو حقیقتہً اسلام اور صرف اسلام کے قائل ہیں اور اسلام ہی کو اسلامی ملکوں کے اتحاد کی درجہ بدرجہ اساس بنانا چاہتے ہیں۔

۲۔ وہ منافقین جو اپنے وجود و نظام کو برقرار رکھنے اور اپنے مفادات و اغراض کو پروان چڑھانے کے لیے اسلام کا نام استعمال کرتے ہیں۔

۳۔ وہ عناصر جو استعمار کے مہرے کی حیثیت سے مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنے کے لیے اسلام کو بازیچۂ اطفال بنانے میں پیش پیش رہے ہیں۔

—— اس بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ ناصر کی رائے نے ٹھوکر کھائی ہے اور وہ ایک غلط ردعمل کا شکار ہو گئے ہیں۔ لیکن جہاں تک ان کی دیانت اور قیادت کا تعلق ہے۔ اس کو داغدار نہیں کہا جا سکتا۔ وہ فی الواقعہ ایک بے لوث عرب راہنما ہیں۔ اگر ان کا دامن ذاتی منفعت یا شخصی مفاد سے داغدار ہوتا تو اس عظیم شکست کے بعد مصری انہیں مستعفی ہونے پر، مظاہروں، آنسوؤں اور فریادوں سے

واپس نہ بلاتے اور انھیں حکومت کی مسند الحاح وزارت کے ساتھ پیش نہ کرتے پھر بیشتر عرب ملکوں کے حکمران انہیں استعفا واپس لینے کی استدعا نہ کرتے ..... اس عظیم شکست کے باوجود مصریوں کا ولولہ ظاہر کرتا ہے ناصر ان کے عظیم راہنما ہیں ۔ ۔ ۔ ممکن ہے ناصر کا استعفیٰ ان کے لیے شکست کے حادثے سے بھی زیادہ روح فرسا ہوتا؟

ایک اور سبب

شکست کے اسباب میں ایک خاص سبب یہ بھی ہے کہ عرب ممالک ریاست اسرائیل کے داخلی حالات سے بے خبر رہے۔ اسرائیل میں عربی ملکوں کے سفارت خانے نہ ہونے کے باعث ان کی داخلی اطلاعات برطانیہ، امریکہ اور روس کی معرفت ملتیں اور انہیں جو دلچسپی ہو سکتی تھی، وہ ظاہر ہے۔ اس کے برعکس عرب ملکوں کے داخلی حالات اور داخلی انتشار حتیٰ کہ حکومت کی اصل طاقت سے برطانیہ اور امریکہ اسرائیل کو لازماً مطلع کرتے رہے گویا ایک قلعہ عربوں کے بلاواسطہ علم کے بغیر خطرناک ہوتا گیا۔ اور اس قلعہ کے سپاہ دار عربوں کے "دوستوں" یا "خریداروں" سے تمام اطلاعات حاصل کرتے رہے۔

اس ضمن میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ عرب ملکوں میں امریکہ کا ذلیل ترین ادارہ سی آئی اے مدۃ العمر سے کارفرما ہے نتیجۃً عربوں کے بعض کارفرماؤں کی خرید و پرداخت اور خرید و فروخت بھی اس کے ذمے ہے

اسلام کی بنیاد

ناصر کے خلاف جو پروپیگنڈہ اس کے اسلام سے منقطع ہونے کے زیر عنوان کیا جا رہا ہے اس کے اصل محرک برطانیہ اور امریکہ ہیں۔ افسوس کہ اس پروپیگنڈے کا شکار وہ لوگ بھی ہو گئے ہیں جن کو برطانیہ اور امریکہ سے کوئی تعلق نہیں بلکہ جنہیں یقین ہے کہ مسلمانوں کی بربادی ان سامراجی طاقتوں کے ہاتھ سے ہو رہی ہے۔

راقم الحروف نے برطانیہ میں خود دیکھا ہے کہ انگریز ناصر کے نام سے کتنا چڑتے اور امریکی افراد کا سفید رنگ کیونکر سرخ ہو جاتا ہے۔ اگر ناصر اسلام سے دور ہوتا؟ یا وہی ہوتا جو اس کے مخالف ظاہر کر رہے ہیں تو اس کے استعفیٰ پر دنیا بھر کے یہود بازاروں میں کھلا رقص نہ کرتے۔ اور برطانیہ کے فرزند خوشی سے دیوانہ نہ ہو جاتے۔! اخبارات میں آ چکا ہے کہ یہود کو "جنگ جیتنے" سے اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی خوشی انہیں ناصر کے استعفیٰ سے ہوئی تھی۔ ۔ ۔

ناصر نے انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں جو تقریر کی افسوس کہ ہمارے "عربی علاموں" نے اس کا اردو ترجمہ کرنے سے فرار کیا اس تقریر ہی سے واضح ہوتا تھا کہ ناصر عربوں ہی کا نہیں اسلام کا بھی خدمت گزار ہے۔ اس کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ اسلامی ملکوں کا اتحاد و بتدریج ہو سکتا ہے

محض نعرہ کوئی چیز نہیں کیوں کہ اسلامی ملکوں کو متحد کرنا، اس سامراجی زمانہ میں عرب اتحاد سے بھی مشکل ہے۔

"یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک
اولاً عربوں کا اتحاد ثانیاً افریشیائی
اتحاد اور بہ درجہ آخر اسلامی اتحاد
منزل مقصود کے تین مختلف اور
ترتیب وار مرحلے ہیں۔"

ضروری نکتہ

اخوان المسلمین کو ناصر نے قتل کیا ٹھیک ہے لیکن اس خطا پر اس کو اسلام ہی سے برگشتہ قرار دینا کس منطق کی رُو سے جائز ہے؟ اگر ظواہر کوئی اہمیت رکھتے ہیں تو قاہرہ کے سیاحین اس کی شہادت دے سکتے ہیں کہ ناصر جمعہ کی نماز شہر کی سب سے بڑی مسجد میں باقاعدگی سے ادا کرتے ہیں اور ان کی ذاتی زندگی قرن اول کے اسلام سے زیادہ قریب ہے بہرحال یہ بحث کوئی بحث نہیں اور نہ کسی فرمانروا کی تعریف و تنقیص مقصود و مطلوب ہے۔

اصل سوال

اصل سوال اس سرزمین کے بقا و استحکام اور احترام و حفاظت کا ہے جس کو مولد و منشأ اسلام ہونے کا شرف و امتیاز حاصل ہے ہم مسلمان اگر فی الواقعہ اسلام سے وابستہ رہنا چاہتے اور اسی کو اپنی دنیا و عاقبت میں خیر کا سرچشمہ گردانتے ہیں تو اسرائیل کی جارحیت کو عربوں پر حملہ کے نقطہ نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیئے اور نہ عرب ملکوں کو صرف عرب ملکوں کی ترازو میں تولنا چاہیئے بلکہ ان کی سرزمین پر یہودیت کا تصرف و قبضہ ساری دنیائے اسلام بلکہ خود نفس اسلام کے لیے چیلنج ہے۔ اگر عرب ممالک اسرائیل کے ہو جائیں اور اسلام کے مولد و منشا کی سرزمین اپنا وجود و عظمت کھو بیٹھے تو پھر اسلام کہاں؟ اسلام کن لوگوں کے لیے؟ اور باقیماندہ اسلامی ممالک کس بنیاد پر زندہ رہنے کی جسارت کر سکتے ہیں۔

قدامت پسند مسلمان یا رواجی اور معاشرتی مسلمان اس حقیقت کا ابھی احساس نہیں کر رہے ہے کہ پھر آئندہ نسلیں اسلام کے فعال و متحرک ہونے سے انکار کر دیں گی۔ اور ان کے دماغوں کو لادینی اثرات کی گذرگاہ بننے سے کوئی نہیں روک سکتا

فی الجملہ یہ بات محولا بالا دلائل اور زیر قلم استدلال سے واضح ہو جاتی ہے کہ

"عرب نیشنلزم طاقت نہیں،
طاقت اسلام ہے اور اسلام
ہی کے نام پر آئندہ مصائب
کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔"

جنگ ہاری نہیں

قوموں کی نفسیات کا اظہار بہت کچھ الفاظ پر ہوتا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ حقائق کو الفاظ کے

ہیر پھیر سے چھپایا نہیں جاسکتا۔ تاہم عربوں پر جو واردات بیت گئی ہے اس کو بہ وجوہ ہم اس طرح تعبیر کر سکتے ہیں۔

"عربوں کو جنگ میں ہار نہیں ہوئی ہے بلکہ وہ جنگ میں رہ گئے ہیں"

قومیں اس وقت مرتی ہیں جب وہ حوصلہ ہار بیٹھیں مرنے سے ڈریں اور مٹ جانے کی تمام نشانیاں قبول کرلیں! . . . بے شک اس جنگ سے عربوں کو بہت زیادہ نقصان پہنچا ہے۔ لیکن ان کی حالت اب بھی ایک بیمار یا مریض کی ہے ایک لاش یا میت کی نہیں وہ اپنے اعمال و افکار کا محاسبہ کر کے تاریخ کے اس تازیانے سے سبق لیں تو جی بھی سکتے ہیں۔ نظریہ خاکر صورت حالات عربوں کے جی اٹھنے کی ہے۔

عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر ابھر آتے
کہ ہم نے انقلاب چرخ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں

"زخمی ہونے اور مایوس ہونے میں بڑا فرق ہے"

بنیادی خرابی

جنگ میں رہ جانے کی بنیادی خرابی یہ ہوئی کہ

۱۔ عربوں میں نہ صرف یہ کہ حقیقی اتحاد ہی نہیں تھا۔ بلکہ وہ اس زمانے کی عالمی طاقتوں کے متحارب بلاکوں میں تقسیم تھے مثلاً ناصر کو روس پر اعتماد تھا۔ شاہ حسین برطانیہ کے نزدیک تھے ایک دشمن کے مقابلے میں عرب ریاستوں میں سے بعض کا ناطہ اسرائیل کی نگہدار ریاستوں کے ساتھ استوار تھا۔ نتیجہ یہی نکلنا چاہیے تھا جو نکلا ہے جب دشمن کے دوست کو بھی اپنا دوست تصور کر لیا جائے اور اپنے ذرائع پر اسکا تصرف ہو تو اس دوست سے مختلف امید رکھنا احمقانہ پن ہے۔ بھلا جس دوست نے دشمن پیدا کیا ہو اور دونوں میں اعتقادات واعتبارات کی یکرنگی ہو اس کی دوستی پر بھروسہ کرنا یا اپنے آپ کو اس کے حوالے کرنا تدبر کی موت نہیں؟

برطانیہ اور امریکہ

اس بات کو چھپانا، تاویلیں کرنا یا لیپ ولیپار سے استدلال لانا تاریخی حقائق کے خلاف ہے کہ برطانیہ اور امریکہ کسی مسلمان ملک کے دوست ہو سکتے ہیں۔ دونوں کو عذاب الٰہی سمجھنا ہی اصل حقیقت ہے ان دو طاقتوں نے جو نقصان اسلام کو پہنچایا اور آئندہ ان سے جو نقصان پہنچنے کا امکان ہے ایک بدیہی امر ہے کہ اس کا اظہار الفاظ میں نہیں ہو سکتا۔ عربوں کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کا ذمہ دار برطانیہ ہے۔ اور جو کچھ اب ہو رہا ہے اس کا ذمہ دار امریکہ ہے۔ غالباً دوسری جنگ عظیم کے بعد یہ پہلا اتحاد ہے جو برطانیہ امریکہ میں عربوں کے خلاف اس شدت کے ساتھ ہوا اور جس کے نتائج اسرائیل کے حملہ سے کچھ سامنے آ گئے اور بہت کچھ سامنے آجائیں گے مسلمان ملکوں میں سے جو بھی برطانیہ اور امریکہ پر بھروسہ کرتے یا ان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں ممکن ہے وہ ان سے

اپنی ذات کا تحفظ حاصل کر لیں جیسا کہ بعض الحکمرانوں٭ کو حاصل ہے۔ لیکن ان کے ملک اور ان کی قوم کو انگریزوں یا امریکیوں سے کبھی پائیدار تحفظ حاصل نہیں ہو سکتا اور یہ ایک الم نشرح حقیقت ہے۔

'ہولناک تجربہ'

غالباً جولائی ۱۹۶۵ء میں قاہرہ میں صدر سوئیکارنو، بن بیلا، ناصر اور صدر ایوب اکٹھے ہوئے تھے اور انہوں نے چو این لائی سے مشورت کے ساتھ افریشیائی اتحاد کے متعلق غور و فکر کیا تھا اس ضمن میں ایک کانفرنس کے انعقاد کا نقشہ بھی تیار ہوا تھا۔ اور یہ کانفرنس اگست میں منعقد ہو رہی تھی کہ سی آئی اے حرکت میں آگئی بن بیلا کو ختم کیا گیا۔ معلوم نہیں وہ اس وقت کہاں مقید ہیں! اس کے بعد عبدالرحیم سوئیکارنو کو سیاستہً مفلوج کر کے محروم اقتدار کر دیا گیا اور اب مقدمہ داغا جا رہا ہے پاکستان کے سر پر جنگ کھڑی کی گئی۔ صدر ایوب کو امریکی رعونت سے واسطہ پڑا۔ اسی اثنا میں نائیجیریا کے ابوبکر کو قتل کرا دیا جو قاہرہ کی پانچ رکنی گفتگو میں شریک تو نہیں تھے لیکن شریک اتحاد ضرور تھے۔ اور افریشیائی اتحاد میں پیش پیش! اب جمال عبدالناصر کے ساتھ جو ہوا اور جس طرح عربوں کو خوار کیا گیا وہ ظاہر و باہر ہے۔

گویا ان پانچ بڑوں کو افریشیائی اتحاد کی تحریک پیدا ہو جانے کے "جرم" میں سزا دی گئی ایک کو مروا دیا۔ دو کو محروم اقتدار کیا ایک قید خانے میں ایک اپنے محل میں۔ دو کے ملکوں پر دشمنوں سے حملہ کرا دیا۔ مصر ذبح ہو گیا۔ پاکستان جری تھا بچ گیا۔ سی آئی اے کا نشانہ خطا ہو گیا۔

روس کی دغابازی

روس کی اشتراکیت یورپ اور امریکہ کی جمہوریت کے مقابلہ میں ایشیا اور افریقہ کی درمیانہ جماعت کے تعلیم یافتہ لوگوں میں بہ کثرت مقبول ہے۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد روس، امریکی اور یورپی سامراج کے لیے خطرہ نہیں رہا۔ اب وہ ایک عظیم طاقت ضرور ہے لیکن روسی نیشنلزم کی حد تک اپنے مصالح و مقاصد کے دائرہ ہی میں محصور رہنا چاہتا ہے۔ ایک نظریاتی عالمی طاقت اور اس کے پشتیبان کی حیثیت سے اس نے اپنا کردار ختم کر دیا۔ وہ وارسا پیکٹ کے ملکوں کا سرخیل ہے اور ان میں مداخلت نہیں چاہتا۔ امریکہ میثاق اوقیانوس کے ملکوں کا سرغنہ ہے اور اس میں دراندازی نہیں چاہتا۔ باقی تمام دنیا' دونوں نے اپنے سیاسی، عسکری، معاشی اور تجرباتی مقاصد کی جولانگاہ بنا رکھی ہے۔ روس اور امریکہ کسی افریشیائی یا افریقی ملک کے مسئلہ میں باہمی جنگ کے لیے تیار نہیں دونوں جنگ زرگری کر رہے ہیں۔ روس نے عملاً امریکہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ وہ موجودہ روس کی شکل میں زندہ رہنا چاہتا ہے۔ سیاسی طور پر نہ سہی ... ... لیکن

واتعاتی طور پر وہ روس، چین کی بہ نسبت امریکہ کے زیادہ قریب ہے ... ... اس کو کمیونزم کے سلسلہ میں چین کے "سوت" ہونے کا شدید احساس ہے۔ اور اس لیے وہ سی آئی اے کے ناٹک میں ایشیائی اور افریقی ملکوں کا تماشا دیکھ رہا ہے۔

چین سے بغض

چین اس کو اسی طرح کھٹکتا ہے جس طرح ایک سوت کو جلایا ہوتا ہے اور وہ دوسری کو مروا دینا چاہتی ہے۔ روس کو خلش ہے کہ چین نے ایشیا کی ذہنی سیادت سنبھال لی ہے پہلے وہ ان ملکوں میں اشتراکیت کا علمبردار تھا اب یہ قیادت چین کو منتقل ہو گئی ہے۔ لہذا اس نے آپکو عملاً مشرقی یورپ کا قائد و محافظ بنا لیا ہے، وہ امریکہ کے ہاتھوں اپنی ہر سبکی برداشت کر رہا ہے۔ ناصر نے روس پر بھروسہ کیا نتیجہ ظاہر ہو کر آ گیا۔ روس کیلئے مشرقی یورپ میں پولینڈ، ہنگری، رومانیہ، بلغاریہ، زیکوسلواکیہ اور دو حلیف یوگوسلاویہ اور البانیہ وارسائی بلاک ہیں وہ اس باب میں کوئی سبکی برداشت نہیں کرتا لیکن افریقہ اور ایشیا کے ساتھ اس کی ہمدردی عملاً نہیں قولاً ہے اور قول بھی ایک ایسے شخص کا جو ہر عمل میں اپنے آپ کو ڈھال لیتا ہے —

وارسائی بلاک کے مقابلہ میں نیٹو کے ممالک میں امریکہ برطانیہ، فرانس، ناروے، ترکی، اٹلی، یونان، ہالینڈ بلجیم، پرتگال اور مغربی جرمنی ہیں۔ ان میں ذہنی فاصلے بھی ہیں لیکن وارسائی بلاک کے بالمقابل بہر حال یہ ایک بلاک ہے۔

نتیجہ معلوم کہ ——————

امریکہ اور روس یورپ میں
اپنے متصرف سے تجاوز نہیں
کرنا چاہتے لیکن یورپ سے باہر
اپنے نظریاتی تضاد کے باوجود لڑنا بھی
نہیں چاہتے ان کا سارا کارخانہ
تو تکار پر ہے۔

بھولے نہیں

روس نے عربوں ہی سے نہیں اور بھی کئی معاملوں میں یہی مظاہرہ کیا ہے اس نے انقلاب عراق کے مرحلہ میں لبنان میں امریکی فوج کے داخلے پر اسی اخلاق کا مظاہرہ کیا تھا دوسری غداری اس نے کیوبا میں کاسترو سے کی تیسری بزدلی ویت نام کے مسئلہ میں دکھا رہا ہے۔ چوتھا تماشا اس نے عربوں سے کیا انھیں دوست بن کر اسرائیل سے پٹوا دیا۔ فی الجملہ روس کی سیاسی آبرو اکھڑ چکی ... ... بلکہ دفن ہو گئی ہے وہ عالمی ذہن میں ایک نقش بے اعتبار ہے۔

اولاً: روس کا نظام اس وقت برہنہ ہو گیا جب بیریا وغیرہ کو گولی سے مروا دیا اور سٹالن کی لاش کریملن سے باہر دفن کرائی گئی۔ حتیٰ کہ اس کا نام وغیرہ مٹایا گیا بالفاظ دیگر وہ عظیم باپ نہ رہا۔

ثانیاً: روس کی نظریاتی دلفریبی اس وقت مضحک ہو گئی جب اس نے چین سے ذہنی عداوت کا آغاز کیا۔

ثالثاً: اس کا دوستانہ اعتماد عربوں کے معاملہ میں غتر بود ہو گیا۔

اس وقت اس عالمی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ روس سے زیادہ دغاباز دوست کرۂ ارضی پر کوئی نہیں۔ چین نے اس کے متعلق جو کہا اور جو کچھ کہہ رہا ہے وہ حرف بحرف درست ہے

عرب کیا کریں

عربوں کو اسرائیل کے عفریت سے برطانیہ اور امریکہ کی بدولت جو گزند پہنچا ہے اس کو الفاظ کی لیپا پوتی سے چھپایا نہیں جا سکتا واقعہ سب کے سامنے ہے۔ عربوں کے لیے عبرت ہے، ہمارے لیے سانحہ اور المیہ، انگریزوں اور امریکنوں کے لیے طاقت کا گھمنڈ، اسرائیل کے لئے رقص و مسرت کی گھڑی، روس کے لئے نظریاتی رسوائی۔

بے شک یہ دور مسلمانوں کے لیے بڑا ہی دردناک دور ہے اور اسلام کے لیے مصیبت عظمیٰ لیکن صحیح امر بھی ہے کہ عرب اپنی غلطیوں کا جائزہ لیں اور جوش و غضب کی بجائے حقائق کا سامنا کریں انہیں مایوس ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ اس قسم کے حادثات بھی زندگی ہی کے لیے ہیں افراد اور اقوام دونوں اس سے متاثر ہوتے ہیں۔

بلا کسی تمہید کے عرض مختصر یہ ہے کہ

(۱-۱) عربوں میں ناقابل تسخیر اتحاد ہونا چاہیئے۔

(۲) انھیں اپنے ذرائع پیداوار سے خود فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ دوسروں کے حوالے ان ذرائع کو کر کے تن آسانی کی زندگی بسر کرنا اور صرف بادشاہت یا آمریت کی خالی خولی ٹیپ ٹاپ میں رہنا اس سے مختلف نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا۔ جواب سامنے آیا ہے۔

۳۔ عربوں کو اسلام سے رشتہ جوڑنا چاہیئے۔ اور ان اسلامی ملکوں کے ساتھ مکمل روابط پیدا کرنے چاہئیں جن کے ساتھ مدۃ العمر سے ان کا رشتہ سیاست ٹوٹ چکا ہے۔

۴۔ انھیں ایک زندہ اسلامی اور عسکری طاقت بننا چاہیئے۔

۵۔ عرب و عجم کی تمیز جہاں تک مسلمانوں کے باہمی تعلقات کا معاملہ ہے یکسر ختم کر دینا چاہیئے۔

(۶) تمام اسلامی ملکوں کی ایک کانفرنس بلانی چاہیئے جس میں باہمی اتحاد کی بنیادیں تلاش کی جائیں۔

(۷) اسلامی ملکوں کو باہمدگر ٹیکنیکل امداد دینی چاہیئے۔

(۸) آپس میں درآمد برآمد کرنی چاہیئے صرف وہی چیزیں یورپی اور امریکی ملکوں سے درآمد کی جائیں جو اشد ضروری ہوں۔ ان کا آپس

بقیہ ص۲۴۳ پر

مولانا کوثر نیازی

عرب سربراہوں کے اہم فیصلے

خرطوم میں عرب سربراہوں کی کانفرنس میں بعض اہم فیصلے ہوئے ہیں مثلاً فیصلہ کیا گیا ہے کہ تیل کی سپلائی بحال کر دی جائے گی۔ اور خیال کیا جا رہا ہے کہ اس فیصلے کے مطابق امریکہ برطانیہ اور مغربی جرمنی کی سپلائی پر سے بھی امتناع کا فیصلہ کالعدم قرار پائے گا۔ ایک دوسری خبر کے مطابق تیل کی قیمت تھوڑا سا اضافہ کر دیا جائے گا۔ اس فیصلے کا بنیادی محرک عرب ممالک کی اقتصادی حالت کو استوار کرنا اور جنگ سے متاثرہ ہونے والے عرب ممالک کی اقتصادیات کو بحال کرنے اور معمول پر لانے کے لیے ان ممالک کو اقتصادی امداد بہم پہنچانا ہے۔

ہمارے نزدیک یہ فیصلہ اس کانفرنس کا حاصل ہے۔ اور باقی تمام فیصلے بڑی حد تک اس کے تابع بلکہ اس فیصلے کے فروع بن جاتے ہیں۔ عربوں نے ایک سے زائد مرتبہ اس بات کا اعلان کیا تھا۔ کہ وہ کسی بھی غیر ملکی دباؤ کے تحت اسرائیل کو تسلیم نہیں کریں گے۔ اور اسرائیل کے ساتھ براہ راست مذاکرات کر کے اپنی روایتی پوزیشن کو کمزور نہیں ہونے دیں گے۔ سربراہ کانفرنس نے اس موقف کی تائید کی ہے۔ اور اس طرح اسرائیل کے ہاتھوں بیک میل ہونے سے عرب دنیا ہی نہیں پورے عالم اسلام کو محفوظ کر لیا ہے۔ اسرائیل اور ان کے حامی ممالک کا یہ موقف کم از کم ۲۰ سالہ پرانا ہے یعنی یہ کہ غیر قانونی، غیر اخلاقی اور غیر سیاسی پر محض دھونس دھاندلی اور حربی طاقت کے بل پر قائم کئے ہوئے ملک اسرائیل کو عرب ممالک تسلیم کریں اور اسے ایک قانونی ملک کی حیثیت سے قبول کر لیں۔۔۔ لیکن عربوں نے ابتدا سے اب تک دھونس اور دھاندلی کو قبول کرنے سے انکار کیا ہے، اور اس طرح کمزور ہونے کے باوجود عدل اور انصاف کا علم بلند رکھا ہے۔ اسرائیل نے اپنے نامسعود وجود کے بیس سالوں میں تین بار جارحیت کی راہ اختیار کی ہے۔ اور چاہا ہے کہ اپنی حربی بالادستی کے ذریعہ عربوں کو مرعوب کرے۔ اسرائیل کا گذشتہ جون کا حملہ اسی سلسلے کی ایک آخری اور تباہ کن کڑی تھا اگر عرب اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے تو وہ چھوٹے ملکوں کی برادری میں ملّی غیرت اور قومی انا سے عاری قوم سمجھے جاتے۔ سربراہ کانفرنس نے آخری، واضح اور حتمی طور پر اسرائیل کو تسلیم کرنے سے انکار کر کے انتہائی کمزوری اور شدید بے بسی کے عالم میں بھی اپنی غیرت مندی کا ثبوت مہیا کیا ہے۔

جس سے ہمارے سر اونچے ہو گئے ہیں اور عربوں پر ہمارے فخر کو جواز مل گیا ہے۔

لیکن یہ فیصلہ اسی وقت مستحکم اور نتیجہ خیز ہو سکتا ہے جب اس فیصلے پر اندرونی اقتصادی کمزوریاں اثر انداز نہ ہو سکیں۔ اردن کے بہت بڑے حصے کا اسرائیل کے قبضے میں چلا جانا تکلیف دہ اور شدید نقصان ہے لیکن اگر اس نقصان پر اُردن کی معیشی تباہ حالی کا اضافہ ہو جائے اور اسے کسی طرف سے مناسب اور معقول اقتصادی امداد حاصل نہ ہو تو ظاہر ہے، اردن اسرائیل کے مطالبات اور دوسرے ممالک کے دباؤ کے خلاف زیادہ دیر تک ثابت قدم نہ رہ سکے گا ... یہی حال متحدہ عرب جمہوریہ کا ہے نہر سویز کی بندش کو اگر اسرائیل کی جارحیت کے خلاف سیاسی اور سفارتی حربے کے طور پر موثر طریقے سے استعمال ہونا ہے تو ضروری ہے کہ اس بندش کی وجہ سے محصول اور سیاحت کی مد میں متحدہ عرب جمہوریہ کی آمدنی میں جو خلا پیدا ہوا اس کی تھوڑی بہت تلافی ہوتی رہے۔ یہی حال عراق اور شام کا ہے۔ ان کے اقتصادیہ بھی اس جارحیت کے اثرات مرتب ہوئے ہیں اور اگر ان کا فوری طور پر مداوا نہ کیا گیا تو حالات کا مخدوش ہو جانا ناگزیر ہے اور ... یہ سب سہارے اور مداوے جذباتی مسئلہ نہیں ہیں۔ بلکہ ٹھوس مادی مسائل ہیں، جو مادی طریقوں ہی سے حل ہو سکتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت خاص سے عرب ممالک کے پاس تیل کی صورت میں بہت بڑا خزانہ موجود ہے۔ اور یہ خزانہ بڑے سے بڑے دباؤ اور بڑی سے بڑی جارحیت کا منہ پھیر سکتا ہے۔

یہ نہایت اہم بات ہے کہ عرب ممالک نے فیصلے کرتے وقت اپنی معروف اور مشہور جذباتیت کو اپنے معاملات پر اثر انداز نہیں ہونے دیا اور نہایت حقیقت پسندانہ انداز میں پورے کوائف کا جائزہ لے کر اس صحیح نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اقتصاد اکثر مسائل کی بنیاد ہے۔ سب سے پہلے اس مسئلے کیطرف متوجہ ہوا جائے اور اس کو درست کرنے کے بعد ایک ایک مشترکہ فوج کی تعمیر و تشکیل کا کام ہاتھ میں لیا جائے۔ یہ بہت صحیح بات ہے کہ موجودہ صورت حال میں عرب ممالک اسرائیل سے موثر طور پر نبرد آزما ہونے کے قابل نہیں۔ روس کی ہمدردیاں اپنی جگہ پر اہم سہی لیکن آزادی کی جنگ کسی بھی غیر ملکی طاقت کے تابع فرمان ہو کر نہیں لڑی جا سکتی۔ قومیں اپنی آزادی کے لیے اپنے ہی دست و بازو کو سہارا بنائیں ... تبھی بات بنتی ہے اور ... یہ بات اطمینان بخش ہے کہ عرب ممالک نے اپنے دست و بازو کو اپنا سہارا بنانے کا فیصلہ کیا ہے جو انشاء اللہ نتیجہ خیز ثابت ہوگا ... اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس فیصلے کے نتائج فوری طور پر سامنے نہیں آئیں گے اور شام کا ردِعمل نتائج کی اس دوری ہی کے متعلق ایک جھنجھلاہٹ ہے ... تاہم اسرائیل کی جارحیت کے اثرات و آثار کو موثر طور پر

ختم کرنے اور اس ناسور کا مکمل علاج کرنے کے کیلئے یہی طرز عمل واحد مؤثر طرزِ عمل تھا۔

ہمیں یقین ہے کہ اللہ تعالےٰ ہماری دعاؤں اور التجاؤں کو قبول فرمائے گا اور ملت مسلمہ اپنی بے عملی کے جس ناگزیر اور منطقی نتیجے سے دوچار ہوکر آزمائش کے جس دور میں سے گزر رہی جا رہی ہے اسے جلد ختم فرمائے گا۔ اللہ کریم مسلمانوں پر رحم کرے گا اور اپنے بندوں کی عاجزی بے کسی اور کمزوری کی لاج رکھے گا۔

نفسیاتی تبدیلی

اسی ضمن میں ایک غیر ملکی اخبار نویس کا یہ اندازہ شاید دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے کہ اسرائیل کی جارحیت کے بعد عرب ممالک کی نفسیات میں ایک خاموش لیکن بڑی واضح تبدیلی آرہی ہے۔ اس رپورٹر نے لکھا ہے کہ عرب عوام جو مذہب سے دور ہٹتے جا رہے تھے اب پھر مذہب کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ قومی گیتوں اور ترانوں میں قرآن حکیم کی آیات جگہ پانے لگی ہیں اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث نظم ہونے لگی ہیں۔ صوت العرب کے نشریات میں مناسب وقفوں کے بعد اکثر احادیث سناتے ہیں۔ مساجد میں حاضری پہلے سے زیادہ ہو گئی ہے۔ یہاں تک کہ شام کا علاقہ جو خدا سے انکار کے باب میں بدنام ہونے لگا تھا، مذہب دوستی کی طرف پلٹ آیا ہے۔ اسی جذبے کے تحت صدر ناصر کی تقریر میں مذہب کو اہمیت دی گئی اور شاہ حسن ثانی نے تو عربوں کی موجودہ حالت کے متعلق کھل کر کہا کہ یہ سب کچھ ہماری خدا ناشناسی اور مذہب سے فرار کا نتیجہ ہے۔

ہمارے نقطۂ نظر سے یہ دوسرا اہم موڑ ہے جو عربوں کو حقیقی نظریاتی قومیت کے مرکز کی طرف لوٹانے میں بے حد اہم کردار ادا کرے گا۔ مغربی تسلط جو فرانس، انگلستان اور امریکی چرچ کے ذہنی تسلط کی شکل میں بے حد خطرناک تھا، عربوں کے نظریاتی نقصان کا واحد ذمہ دار کہا جا سکتا ہے اور عربوں کا نظریاتی نقصان ان کے سیاسی نقصان سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ کیونکہ سیاسی نقصان کا ہی منطقی نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ اسرائیل کی جارحیت کے خلاف عربوں کے نقصانات اس لحاظ سے مبارک سمجھے جائیں گے کہ یہ عربوں کو مرکز حقیقی کی طرف لوٹا لائے۔ اگر یہ ہو گیا اور اپنی منطقی تکمیل تک پہنچ گیا تو یہ بہت بڑا فائدہ ہو گا جس کے سامنے صرف اسرائیلی جارحیت ہی کے نہیں صدیوں کے مغربی سامراج کے پیدا کردہ نقصانات کے اثرات مٹ جائیں گے۔ ہمیں خضوع و خشوع کے ساتھ دعا کرنی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ پوری امت مسلمہ کو نظریاتی مرکز کی طرف لوٹ آنے کی توفیق عطا کرے ۔۔۔ یہ اس امت کے عروج کے نئے سورج کا طلوع ہو گا جو ہر لحاظ سے مبارک اور ہر انداز میں

ممتاز لیاقت

تاریخ عرب کا نیا باب

سوڈان کے صدر مقام خرطوم میں عرب سربراہوں کی کانفرنس سے قبل مصر کے ایک شہرہ آفاق ایڈیٹر نے کہا تھا کہ اگر کانفرنس نے کم سے کم پروگرام بھی طے کر لیا تو یہ ایک قابل اطمینان بات ہوگی۔ حالات نے ظاہر کر دیا ہے کہ سربراہی کانفرنس کے نتائج توقع سے بڑھ چڑھ کر نکلے۔ کانفرنس کے فیصلے آتش نوا خطیبوں اور شعلہ بیان مقرروں کے معیار سے یقیناً کم رہے کیوں کہ اس میں غصہ اور انتقام سے لبریز جذبات اور عوام کو بھڑکا دینے والے جملے نہیں تھے۔ لیکن اہل فکر وارباب تدبر کے نقطہ نظر سے اس کانفرنس نے عرب دنیا کی گاڑی کو جس پٹڑی پر ڈالنے کی کوشش کی ہے، وہ دور رس نتائج پر پہونچانے کا ایسا حقیقت پسندانہ راستہ ہے، جسے تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ بے شک الجزائر کے جوشیلے رہنما ان فیصلوں کو اپنی امنگوں کا ترجمان نہیں سمجھتے شام کی گرم جوش قیادت بھی ان میں اپنے جذبات کی تسکین نہیں پاتی۔ اور متحدہ عرب جمہوریہ کے انتہا پسند بھی یہ سمجھ رہے ہیں کہ صدر ناصر نے انقلاب کا راستہ چھوڑ کر اعتدال پسندی کی راہ اختیار کر لی ہے۔ مگر الفاظ واصطلاحوں کے شکوہ وشکایت سے ہٹ کر دیکھا جائے تو اس کانفرنس نے اپنے فیصلوں سے جن پر ضرب لگانی چاہی ہے، انہوں نے اس چوٹ کو محسوس کر لیا ہے۔

اس کانفرنس کا سب سے زیادہ مثبت پہلو یہ ہے کہ عرب سربراہوں نے "رحماء بینہم" کا ایک نمایاں نمونہ پیش کیا ہے۔ غلطی جس کی بھی ہو، اور جو بھی ہو، اس کو معاف کر دینا اور آئندہ خوش اعتمادی کے ساتھ مل جل کر قدم بڑھانا خدا کی مہربانیوں کا بھی مستحق قرار پائے گا اور دنیاوی کامیابیوں کا بھی، اور اس کے ابتدائی ثمرات ظاہر ہونے لگے ہیں۔

کانفرنس کے انعقاد سے قبل سرخ وسفید دونوں قومیں، ان کے اخبارات اور ایجنسیاں اس اجتماع کی مخالفت میں سرگرم تھیں جس سے خود عرب ممالک بھی کسی حد تک متاثر نظر آتے تھے۔ لیکن کانفرنس کے انعقاد سے یہ سب مخالفتیں سرد پڑ گئیں، اور بیروت کے انگریزی روزنامہ سٹیٹس مین کے کالم نویس مسٹر جی ایچ جانسن کے الفاظ ہیں:

"عرب سربراہی کانفرنس نے بین العرب
اتحاد اور تعلقات کا ایک نیا باب
کھول دیا ہے۔ وہ عرب حکومتیں بھی
جو تعاون نہیں کرنا چاہتی تھیں

ایسا نہیں کر سکیں، جنھوں نے کانفرنس کی بنیادی باتوں کو قبول نہیں کیا وہ علیحدہ رہیں۔ (مثلاً شام) یا نرمی اور خاموشی سے شرکت کی (مثلاً الجزائر) اور ان پر غدار ہونے کا الزام نہیں لگایا گیا۔ حتیٰ کہ فلسطینی وفد جو آخری اجلاس سے واک آوٹ کر گیا تھا۔ اس نے بھی بڑی نرمی اور شائستگی سے ایسا کیا، اور کسی قسم کی ہنگامہ آرائی اور جذباتیت کو درمیان میں نہیں آنے دیا۔ اس کے علاوہ شام نے بعض اختلافات کے باوجود یہ وعدہ کیا کہ وہ کانفرنس کی مثبت سفارشات کو عملی جامہ پہنائے گا۔ اس کے علاوہ مصر و عراق اور سعودی عرب اور اردن کے درمیان تعاون نے کانفرنس کو ایک نمایاں مقام عطا کیا ہے۔ کیونکہ ابھی تک مصر و عراق کو ترقی پسند ملک اور سعودی عرب و اردن کو قدامت پسند ملک کہا جاتا رہا ہے، اس طرح دونوں نظریات کے حامی ممالک کا ایک دوسرے سے مخلصانہ تعاون کا وعدہ ایک بہت بڑی بات اور ایک شاندار مستقبل کا ضامن بن گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان ممالک نے خلوص دل اور بے باکی کے ساتھ اپنے اختلافات کا اظہار کر کے اختلافات کو قطعی طور پر ختم کر دیا ہے۔"

اس کانفرنس کے متعلق کھل کر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس نے حقیقت پسندانہ اور عملی جد و جہد کا خاکہ پیش کیا ہے اور اس کے تمام تر فیصلے متوازن، قابل عمل اور پہلے مرحلے میں سب کے لئے قابل قبول ہیں۔ اور یہ بات عرب کانفرنسوں کے درمیان ایک نئی چیز ہے اس کانفرنس میں عرب حکومتوں سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ صرف وہی اقدامات کریں جن کے بارے میں ان کو یقین ہو کہ وہ انہیں کامیابی سے کر سکتی ہیں اس کا اعلامیہ مکمل طور پر عملی حدود کے اندر ہے۔

جہاں تک خاص خاص تفصیلات کا تعلق ہے عربوں نے ایک ٹھوس اور واضح پروگرام پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم فیصلہ یہ ہے کہ "نہ تو اسرائیل کو تسلیم کیا جائے گا اور نہ اس سے مصالحت ہوگی۔ اور نہ کوئی گفت و شنید کی جائے گی۔" یہ الفاظ سخت نہ سہی، مگر اس فیصلے میں جو مفہوم پوشیدہ ہے وہ یہی ہے کہ عرب طاقتیں اسرائیل سے مستقل لڑائی کا اعلان کرتی ہیں۔ اور اپنے موقف سے ہٹنے کے لئے کسی قیمت پہ تیار نہیں۔ یہاں ان تمام پروپیگنڈوں کی بھی تردید ہو جاتی ہے کہ اردن اور متحدہ عرب جمہوریہ علیحدہ طور پہ اسرائیل سے سمجھوتہ کر سکتے ہیں۔ اس کا یہ سبب بتلایا جا رہا تھا کہ ان کی مالی حالت خراب ہے، متحدہ عرب جمہوریہ کی اقتصادیات کا سب سے بڑا انحصار نہر سویز کی آمدنی پہ ہے، اسی طرح اردن کا

بیشتر انحصار برطانوی امداد پر ہے۔ مغربی بدترین اور خود اسرائیل کو یہ خیال تھا کہ یہ دونوں ممالک اپنی مالی مشکلات سے مجبور ہو کر جھک جانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ گو یہ محض پروپیگنڈہ تھا، لیکن اگر اس کا کوئی شائبہ بھی تھا تو خرطوم کانفرنس نے اسے ختم کر دیا۔ ان دونوں ملکوں اور شام کے نقصانات کی تلافی کے لیے کویت، سعودی عرب اور لیبیا نے تین ارب روپے اور ایک سال کے بجٹ کی ذمہ داری لے کر انہیں مضبوطی کے موقف پر کھڑا کر دیا ہے

اس فیصلے کی روشنی میں یہ واضح ہو جاتا ہے ہے کہ اسرائیل اپنے وجود کو تسلیم کرانے یا مقبوضہ عرب علاقوں پر مستقل تسلط قائم رکھنے کی جارحانہ کوشش کرے گا۔ اس لئے عربوں نے آئندہ امکانی ٹکر اور اسرائیل کے خلاف "آخری اور فیصلہ کن" جنگ کے لیے عرب فوجوں کی نئے سرے سے تنظیم پر زور دیا ہے۔ اور درمیانی عرصہ کے لیے سیاسی لحاظ سے اس مسئلے کو زندہ رکھنے کی تدبیروں سے بھی غفلت نہیں برتی۔ اور سیاسی حکمت عملی کے طور پر اس کے سوا کوئی اور راہ کھلی ہوئی بھی نہیں ہے۔ بعض انتہا پسند حلقوں کا کہنا تھا کہ عرب ممالک مغربی ملکوں کے ہاتھوں پیٹرول نہ فروخت کریں۔ نیز ان تمام رقوم کو جو تجارتی ضروریات کے لیے ان ملکوں میں جمع ہیں نکال دیں لیکن یہ دونوں باتیں اس وقت قابل عمل نہیں ہیں، پیٹرول بند کرنے سے بے شک مغربی ملکوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ مگر اس کا نتیجہ ظاہر ہونے تک عرب ملکوں کی شاہ رگ ختم ہو جانا یقینی ہے، اسی طرح تجارتی مفادات کا بھی معاملہ ہے، برسہا برس سے تجارت، فوجی امور اور دوسری ضروریات کے لحاظ سے مغربی ملکوں کے محتاج بن کر رہ گئے۔ اس سے بیک جنبش قلم نجات پانا آسان نہیں۔ اس لیے انہوں نے اس سلسلے میں کوئی غیر حقیقت پسندانہ موقف اختیار نہیں کیا۔ بلکہ ایک طویل المیعاد راہ اختیار کی ہے کہ وہ مغربی ملکوں سے نجات بھی حاصل کر لیں اور ان کی اپنی حیثیت بھی تباہ نہ ہونے پائے۔

جہاں تک نہر سویز کا تعلق ہے اس کے بند رہنے سے یورپ میں تیل اور پیٹرول کے دام بڑھتے رہیں گے۔ مصر و اردن کو اقتصادی امداد ان ملکوں کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ نہر سویز بند رکھ کر اسرائیل پر اس وقت تک اقتصادی دباؤ ڈالیں جب تک کہ وہ اپنی فوجیں واپس نہیں ہٹا لیتا۔ نہر سویز بند رکھنے سے مغربی ایشیا کو جتنی مشکل کا سامنا ہے اس زیادہ یورپ کو ہے۔ اور یہ یورپ اور امریکہ میں اختلاف و انتشار کا باعث بن سکتا ہے۔

خوشنود قریشی

اسرائیل، مغربی سامراج اور افریقہ

امریکی سرمایہ دار افریقی ملکوں میں داخل ہونے کی کوشش کرتے ہوئے حتی الوسع کسی تیسری طاقت کو استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں جیسے مثال کے طور پر اسرائیل جو اس داخلے میں کچھ کم اہم حصہ ادا نہیں کرتا اور جس کے حکمرانوں کے ساتھ وہ سیاسی، معاشی اور فوجی شعبوں میں انتہائی گہرا تعاون کرتے ہیں۔

مغربی طاقتوں نے بھاری پیمانے پر پروپیگنڈہ مہم شروع کر رکھی ہے تاکہ افریقی ملکوں کے رہنماؤں کو قائل کروایا جائے کہ نوزائیدہ افریقی ریاستیں اسرائیل کو کم و بیش ایک نمونہ سمجھ لیں مارچ ۱۹۶۳ء میں میامی (امریکہ) میں اسرائیل بانڈ کی ایک پریس کانفرنس کو مخاطب کرتے ہوئے مسٹر جی ہمفری نے جو اس وقت امریکہ کے نائب صدر ہیں کہا تھا کہ اسرائیل کا تجربہ ان تمام ملکوں میں نافذ کیا جانا چاہیئے جنہوں نے آزادانہ راستہ اختیار کیا ہے۔ اسرائیل زیادہ تر معاشی تکنیکی اور فوجی امداد دینے کے میلانے افریقی ملکوں میں داخل ہوتا ہے اسرائیل کی حکومت اس خیال کے پرچار کی کوشش کر رہی ہے کہ اسرائیل ایک چھوٹا سا ناوابستہ ملک ہے جس نے مقابلتاً حال ہی میں آزادی حاصل کی ہے اس لیے ان کا کہنا ہے کہ اس کی امداد کا کوئی نو آبادیاتی مقصد نہیں ہو سکتا۔

کئی افریقی ملکوں کے ساتھ تکنیکی تعاون کے سمجھوتے کرنے کے بعد اسرائیل نے وہاں اپنی سرگرمیوں کو پھیلانا شروع کر دیا ہے۔ ۱۹۶۲ء کے آغاز سے اب تک اسرائیل نے گھانا جمہوریہ وسطی افریقہ آیوری کوسٹ گابون ٹوگو اور دوسرے ملکوں کے ساتھ ایسے سمجھوتے کیے ہیں۔

موصولہ اطلاعات کے مطابق ۱۹۵۸ء اور ۱۹۶۵ء کے دوران ۱۶۲۶ اسرائیلی باشندے ان نو آزاد افریقی ملکوں کو روانہ کیے گئے۔

ان میں کئی مختلف وزارتوں اور دوسری سرکاری تنظیموں میں مشیر بن گئے اور بعض صورتوں میں تو وہ ریاستی سربراہوں کے انتہائی قریبی مشیروں میں جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

اسرائیل میں مزدوروں کی مرکزی یونین "ہستادروت" جس کو دائیں بازو کی صیہونی پارٹی میپائی کنٹرول کرتی ہے اور جس کے بین الاقوامی صیہونیت کی تنظیموں سے قریبی روابط ہیں افریقی ملکوں کی ٹریڈ یونین تحریک میں داخل ہو کر اسے اندر

سے نقصان پہنچا تے۔

۱۹۶۰ء میں ہساد رُوت نے امریکی ٹریڈ یونینوں کے تعاون سے تل ابیب میں ایک افریقی ایشیائی انسٹی ٹیوٹ کھولا۔ اس انسٹی ٹیوٹ میں افریقی علوم کے مطالعے کو نظریاتی تربیت و تعلیم سے گہرے طور پر ہم آہنگ کر دیا گیا ہے جس میں صیہونی جذبہ اپنے واضح اور کھلے طور پر موافق سامراجی رجحان کے ساتھ کار فرما ہوتا ہے۔ یہ بات بے سبب نہیں تھی کہ امریکی ٹریڈ یونینوں کے لیڈر جارج مینی بھی انسٹی ٹیوٹ کے بورڈ کے نائب صدروں میں سے ایک تھے اس ٹریڈ یونین انسٹی ٹیوٹ کے علاوہ کئی نوجوان افریقی اسرائیل کے دوسرے تعلیمی اداروں میں بھی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ۱۹۵۸ء اور ۱۹۶۵ء کے دوران افریقہ کے ترقی پذیر ملکوں کے ۴۰۰ طلبا نے وہاں تعلیم حاصل کی۔

مغربی طاقتیں افریقی ملکوں میں مسلح فوجیوں اور نوجوانوں کی تنظیموں کو خصوصی اہمیت دیتی ہیں اور ان تنظیموں میں اپنے ایجنٹوں کو داخل کرنے کے لیے اسرائیل کی مدد حاصل کرتی ہیں۔ وہ نیم فوجی دستے اس سلسلے میں قابلِ ذکر ہیں جو اسرائیلی "ماہروں" نے کئی افریقی ملکوں میں اسرائیل کی جنگ باز صیہونی تنظیموں کے انداز پر قائم کیے ہیں۔

اسرائیل کے حکمراں حلقے اپنی امداد حاصل کرنے والوں کا انتخاب کرنے میں بہت محتاط رہتے ہیں، وہ صرف ان ملکوں کو امداد دیتے ہیں جو "مغربی طرزِ زندگی" کے متعلق موافق رویہ رکھتے ہیں۔ ساری "فوجی امداد" کو اس روپ میں پیش کیا جاتا ہے جیسے وہ کوئی بوجھ ہے جس کو اسرائیل کی حکومت نے محض مدد کرنے کی خاطر قبول کیا ہو۔ اسرائیلی وزارت خارجہ کے ایک ممتاز عہدیدار اوریل نے کہا تھا کہ "ایسی امداد دے کر اسرائیل بعض افریقی ملکوں کے حکمرانوں کا بوجھ ہلکا کر دیتا ہے اور ان کے لیے بڑی طاقتوں سے ایسی امداد کی درخواست کرنا غیر ضروری ہوتا ہے"۔

بھرپور سامراجی تائید

اس بات کی کس طرح توجیہہ کی جاسکتی ہے کہ اسرائیل کو براعظم افریقہ میں سیاسی، معاشی اور فوجی شعبوں میں داخلے کے لیے کافی رقم مل جاتی ہے اسرائیل کوئی بہت زیادہ مالدار ملک نہیں ہے۔ ۱۹۶۵ء میں اس کے ریاستی قرضے تقریباً دو ارب ڈالر تھے جو ملک کے سالانہ بجٹ سے ۵۰ فی صد زیادہ ہے واقعہ یہ ہے کہ افریقہ میں اسرائیل کی سرگرمیوں کو مغرب کے سامراجی ملکوں کی کھل کر تائید بشمول مالی امداد حاصل ہے۔ کئی ملکوں کے اخبارات ایک سے زیادہ مرتبہ اس کا اظہار کر چکے ہیں۔

الجزائر کی خبر رساں ایجنسی اے پی ایس نے اطلاع دی تھی کہ مغربی سرمایہ ہی وہ ذریعہ ہے جس سے اسرائیل بعض افریقی ملکوں کو قرضے دیتا ہے اور صیہونی گروپ ان ملکوں میں سرمایہ لگاتے ہیں۔ اسرائیل کے لیڈر بھی اس بات کو چھپاتے

نہیں ۔ اسرائیل کے لیے امریکی یہودی مشترکہ فنڈ کے ایک وفد کے ارکان کو مخاطب کرتے ہوئے وزیرِ اعظم اشکول نے کہا تھا۔ مغرب سے اسرائیل کے تعلقات کے استحکام کے ساتھ ساتھ ایشیا افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ملکوں کے ساتھ اس کے تعلقات میں بھی توسیع ہوئی ہے۔ قاعدے کے مطابق اسرائیلی تنظیمیں اور کمپنیاں درمیانی افراد کا کام کرتی ہیں جو افریقہ میں مغربی سرمایہ کے لیے راہ ہموار کرتی ہیں۔ چنانچہ ہساد رُوت نے افریقی ملکوں میں سڑکوں، ہوائی اڈوں اور دوسرے پروجکٹوں کی تعمیر کے لیے جو ٹھیکے لیے ہیں ان کے لیے سرمایہ زیادہ تر امریکی اور مغربی جرمنی کی کمپنیوں نے فراہم کیا ہے۔ اسرائیلی اخبارات خاص طور پر اخبار "یدیوت بد اسونوتھ" نے اکثر اطلاع دی ہے کہ اسرائیلی کمپنی "سول بون" کی طرف سے افریقی ملکوں میں جو کام کیے گئے ان کیلئے سرمایہ مغربی جرمنی کے اجارہ داروں نے فراہم کیا تھا۔ اس کمپنی کو سڑکیں ہوائی اڈے اور صنعتی کارخانوں کی تعمیر کا مخصوص تجربہ حاصل ہے۔ اس کے علاوہ دوسری کئی اسرائیلی کمپنیاں بھی براعظم افریقہ میں سرگرم ہیں۔

افریقہ میں اپنی پوزیشن کو مضبوط بنانے کے لیے اسرائیلی حکومت، ترقی پذیر ملکوں کو سامراجی طاقتوں کی طرف سے ملنے والے قرضوں اور گرانٹوں میں اپنی شرکت کا پورا فائدہ اٹھارہی ہے۔ اسرائیلی وزارت خارجہ کے ڈپٹی جنرل ڈائرکٹر نے اسرائیل اور مغرب کے درمیان ایسے "تعاون" کا کھلم کھلا اعتراف کیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اسرائیل اور نائیجیریا کی ایک مشترکہ تعمیری کمپنی نے ایک کام انجام دیا جس کے لیے سرمایہ امریکہ برطانیہ اور وفاقی جمہوریہ جرمنی کے قرضوں سے فراہم کیا گیا۔ کینیا۔ ٹوگو اور آئیوری کوسٹ جیسے ملکوں کو اسرائیل کی تکنیکی اور فوجی امداد کے لیے سرمایہ بھی اسی ذریعے سے فراہم کیا جاتا ہے۔

"باہمی مفاد کی خاطر"

اسرائیل کو مشترکہ منڈی اور یورپی آزادانہ تجارت کی ایسوسی ایشن کی سیاسی و معاشی تائید بھی حاصل ہے۔ افریقی ملکوں میں اسرائیل کے تکنیکی پروجکٹوں کی اکثریت کو انہی تنظیموں کے سرمایہ سے پورا کیا جاتا ہے۔ حال ہی میں تل ابیب کے اخبارات نے اطلاع دی کہ اسرائیل کے بہت بڑے سرمایہ دار فیدرمین نے جو خاص طور پر افریقہ میں نام نہاد ملے جلے کارخانوں کی تعمیر سے تعلق رکھتا ہے ایک فاشسٹ تنظیم کے سابق لیڈر کو جو اس وقت سوئزرلینڈ میں مغربی جرمنی کی ایک کمپنی کا ڈائرکٹر ہے باہمی شراکت کی پیشکش کی ہے۔ اس پر ایک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور مغربی جرمنی کے صنعتی و کاروباری حلقوں سے اسرائیل کے بعض انتہائی بااثر سرمایہ داروں کے تعلقات کا سوال اسرائیلی پارلیمنٹ میں اٹھایا گیا۔

اسرائیلی اخبار "مارِیو" نے اس قسم کے

"تعاون" میں باہمی مفاد پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا کہ مغربی جرمنی کے سرمایہ دار بہت عرصہ پہلے اس نتیجے پر پہنچے کہ اسرائیل کی مدد افریقی معیشت میں ان کے داخلے کو آسان بنا دے گی۔

اسرائیل سامراجی طاقتوں کو تو زائیدہ افریقی ریاستوں میں گھسنے میں مدد دیتے ہوئے خود اپنے مفادات کو نظر انداز نہیں کرتا۔ افریقی ملکوں کی مدد سے اسرائیل اپنی بین الاقوامی پوزیشن کو مضبوط بنانے اور عرب اسرائیل جھگڑے میں تائید حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ افریقی ملکوں کے ساتھ اسرائیل کے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے وزیر خارجہ اسرائیل گولڈ امیئر نے کہا تھا افریقہ کے ممالک اسرائیل کو اس بات کا موقع دیتے ہیں کہ اقوام متحدہ میں مخالفانہ قرار دادوں کو روکنے کے لیے درکار دو تہائی ووٹوں کو ہموار کیا جائے یہ وضاحت غیر ضروری ہو گی کہ "مخالفانہ قرار دادوں" سے ان کا کیا مطلب ہے۔ وزیر اعظم اشکول نے مئی ۱۹۶۶ء میں اپنے دورۂ افریقہ سے پہلے کہا تھا۔ ان کے دورے کا مقصد صرف اسرائیل اور افریقی ملکوں میں تعلقات کو بڑھانا نہیں بلکہ بین الاقوامی معاملات میں مشترکہ سرگرمیوں کے نئے راستے معلوم کرنا بھی ہے۔ اسرائیل افریقہ میں نہ صرف سیاسی بلکہ معاشی مقاصد کے حصول کے لیے بھی کام کر رہا ہے۔

حسن محجوب

ہمارا مقصد ـــــ کلمہ اسلام کی سربلندی

عرب اور مسلم ممالک کے اتحاد و تعاون کے لئے سوڈان کے رہنما اور سربراہ جو کوششیں کر رہے ہیں ان کا تذکرہ اخبارات و رسائل میں آتا ہی رہتا ہے۔ سوڈان کی ان کوششوں نے دنیائے اسلام کے سامنے نشاۃ ثانیہ کی ایک راہ کھول دی ہے۔ وزراء خارجہ اور عرب چوٹی کانفرنس کا انعقاد بھی ان ہی کوششوں کا مرہون منت ہے۔ ان کانفرنسوں میں عرب سربراہوں کو شریک کرنے کے لئے وزیر اعظم سوڈان جناب حسن محجوب نے عرب دنیا کا دورہ کیا اسی دورہ میں سعودی عرب میں ایک ٹیلی ویژن انٹرویو میں موصوف نے جن خیالات کا اظہار کیا تھا۔ اسے اختصار کے ساتھ قارئین "الجامعہ" کے افادہ کے لئے شائع کیا جا رہا ہے ـــــ

بلدر: خوش آمدید، عالی جناب نے ہمارے ٹیلی ویژن پروگرام میں شرکت فرما کر جو ہماری عزت افزائی فرمائی ہے اس کے لئے ہم اپنے محکمہ ٹیلی ویژن کے مشاہدین، سامعین اور تمام سعودی شہریوں کی طرف سے جناب کے لئے شکر گذار ہیں۔

حسن محجوب: آپ نے ہمیں ہمارے وطن میں ہمارے دینی بھائی یعنی سعودی قوم کے افراد سے بات چیت کا جو نادر موقع فراہم کیا ہے اس کے لئے بہت بہت شکریہ۔ مجھے اس وقت کا مدت سے انتظار تھا۔ اور یہ آرزو تھی کہ براہ راست بات چیت کا کوئی موقع ملے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب یہ موقع مل گیا اس لیے کہ اس طرح کے چند دنوں کے دوروں پر یہ ممکن نہیں ہے کہ متعارف اور غیر متعارف افراد سے براہ راست مل سکوں۔ لیکن اب ٹیلی ویژن کے ذریعے مجھے یہ موقع مل گیا ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ لوگوں سے مل سکوں، میرے دوست مجھے دیکھ سکیں گے۔ اور میری باتوں کو سن سکیں گے۔

بلدر: اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو ۷ ۶ ء میں سعودی عرب

کو آپ جیسا پا رہے ہیں ۔ اس کے بارے میں اپنے تاثرات سے ہمیں آگاہ فرمائیں ۔

حسن مجوب : بے شک آج مجھے ایک عظیم سعادت کا احساس ہو رہا ہے ۔ اس لئے کہ جس ملک سے میں نے والہانہ محبت کی ہے آج میں اسے اچھی حالت میں دیکھ رہا ہوں ۔ مجھے یاد ہے ، ماضی میں تنگ دستی کا یہ عالم تھا کہ سرکاری خزانے سے تنخواہوں کی ادائیگی میں دشواری ہوتی تھی ۔ لیکن آج اقتصادی حالت بہت اچھی ہے ۔ زندگی کے تمام شعبوں میں ترقی ہو رہی ہے ۔ اور اب حالات اتنے بدل گئے ہیں کہ سعودی حکومت بیشتر عرب ممالک کو اقتصادی، عسکری اور مالی امداد دیتی رہتی ہے ۔

بحیثیت مسلمان کے ہم تو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ابراہیمؑ کی دعا " وَارْزُقْهُم مِّنَ الثَّمَرَاتِ " کا یہ کرشمہ ہے جس نے بن کھیتی کی زمین کو پیڑول کی زمین بنا دیا ۔ اور اب یہ ویرانہ بھلائیوں کا لہلہاتا چمن بن گیا ہے ۔ اس وقت یہ بن کھیتی کی زمین اس دعا کی برکت سے صرف پھلوں اور سبزیوں کو نہیں اگا رہی ہے بلکہ پیڑول ، سونا اور مختلف دھاتوں کو پیش کر رہی ہے ۔ ہم اللہ کی ان نعمتوں پر اس کے شکر گذار ہیں کہ اس نے تو مہر داروں

رہنماؤں اور شاہ فیصل کو یہ توفیق دی کہ انہوں نے اس آمدنی اثروت کو ملک کی تعلیمی عمرانی سطح کو بلند اور صحت کے معیار کو اونچا کرنے کے لئے صرف کر رہے ہیں ۔

نیز ان تمام باتوں سے پہلے المسجد الحرام کی آبادکاری اس کے معنوی جمال و جلال کے ساتھ اس کی ظاہری تزئین و وسعت کا کام ایسا کام ہے جسے تاریخ میں فراموش نہیں کیا جا سکتا ۔

بدر : جناب نے اس موقع پر سعودی عرب میں رہنے والے ہمارے سوڈانی بھائیوں سے بھی ملاقات کی ہے ۔ اس ملاقات کا آپ پر کیا اثر پڑا ہے ۔

حسن مجوب : یہ حقیقت ہے کہ سعودی عرب میں سوڈانیوں کی حالت بہت ہی بہتر ہے ۔ میں نے انفرادی اور اجتماعی طور سے سوڈان کے جن افراد و گروہوں سے ملاقات کی ہے ۔ ان سب کو خوش و خرم پایا ۔ اسلئے کہ انھیں احساس ہے کہ سعودی عرب میں انہیں عزت اور احترام کا مقام حاصل ہے ۔ کام اور روزگار کا ہر دروازہ ان کے لئے کھلا ہوا ہے ۔ ان میں کوئی بھی بے کار نہیں ہے ۔ سوڈانی شہریوں کے ساتھ اس سلوک پر ہم سعودی مملکت کے شکر گذار ہیں ۔ مجھے اس سلسلہ میں سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ جب میں جناب اسماعیل الازہری کے ساتھ

دورہ پر یہاں آیا تو میں نے ذمہ داروں کو یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ ہم اپنی جانوں اور مالوں کے سلسلہ میں سوڈانی بھائیوں پر جتنا اعتماد کرتے ہیں اتنا اور کسی پر نہیں کرتے محبت واحترام کے یہ بڑھتے ہوئے جذبات اس بات کی علامت ہیں کہ ہمارے باہمی تعلقات دن بدن وسیع تر ہوتے جائیں گے ۔ ہر سوڈانی ہمیشہ سے یہ یقین رکھتا ہے کہ جزیرۃ العرب ان کا مادری وطن ہے انکے آباؤ اجداد کا مولد ومنشا ہے ۔ ان کا اصلی وطن ہے ۔ اسی لئے ان کی نگاہیں ہمیشہ اس طرف اٹھی رہتی ہیں ۔ ان کے دل ودماغ ہمیشہ اس قبلہ کی طرف متوجہ رہتے ہیں ۔ سوڈان میں شاہ فیصل کے پرجوش استقبال میں بھی یہی روح کارفرما تھی ۔

بلدہ : سوڈان اس وقت اسلامی دستور سازی کے مرحلہ میں ہے ۔ جیسا کہ جناب اسماعیل الازہری کے دورہ کے موقع پر معلوم ہوا تھا ۔ اس سلسلہ میں جو اقدامات کئے گئے ہیں ۔ کیا میں جرأت کرکے ان پر روشنی ڈالنے کی درخواست کرسکتا ہوں ۔

حسن محجوب : ہاں ! سید اسماعیل الازہری کے دورہ کے موقع پر مجھے بھی وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے یہاں آنے کی سعادت ملی تھی ۔ جناب سید اسماعیل الازہری نے اس وقت دستور سازی کے سلسلہ میں جو کچھ کہا تھا وہ اس حقیقت کا اظہار تھا کہ سوڈانی قوم نے مجموعی حیثیت سے اسلام پسندی کا رخ اختیار کرلیا ہے ۔ ۔ ۔ اس وقت سوڈان میں پارلیمنٹ ہے ۔ اسی پارلیمنٹ سے دستور ساز ادارہ کی تشکیل ہوئی ہے ۔ یہ دستور ساز ادارہ ۷ ماہ سے دستور سازی میں مشغول ہے اور جو دفعات وضع کی گئی ہیں ان میں یہ دفعہ خاص طور پر ہے کہ "اسلامی دستور کے اہم مصادر شریعت اسلامی ہوگی" اور اب قانون کے ماہرین ملک کے حالات وظروف کے پیش نظر اسے دفعہ وار تشکیل دے رہے ہیں ۔ سوڈان نے دستور سازی میں یہی رخ اپنایا ہے ۔ اس سلسلہ میں جناب اسماعیل الازہری کے دوش بدوش الامام الہادی المہدی بھی اسلامی دستور کے حق میں اپنا پورا پورا وزن ڈال رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم چاہتے ہیں کہ دوسرے عرب ممالک کے رہنے والے ہمارے بھائیوں کو یہ احساس بھی ہونا چاہیئے کہ ہم سوڈان جیسے ملک میں جس میں بت پرستوں کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ ساتھ مسیحی اور دوسری اقلیتیں بھی رہتی ہیں کوشش کررہے ہیں کہ اس بات پر انہیں یقین واطمینان ہوجائے کہ قرآن مجید انکے حقوق کی پوری پوری حفاظت کرتا ہے ۔ اس سلسلہ میں وہی اطمینان اور یقین ان کے اندر پیدا ہوجائے ۔ جیسا کہ ہمارے اندر ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم قرآنی دستور کو مرحلہ بہ مرحلہ نافذ کریں ۔ جیسا کہ جاہلی زمانہ میں عربوں کے لیے وہ مرحلہ بہ مرحلہ نازل ہوتا رہا ۔ مجھے یقین

ہے کہ اس سلسلہ میں مرحلہ بمرحلہ شراب کی تحریم کا مسئلہ آپ کے ذہن میں ہوگا۔ اسی طرح دوسری چیزوں کی تحریم کے سلسلہ میں قرآن نازل ہوتا رہا۔

پس ہم اس بات کے لیے مصر ہیں کہ سوڈان میں کامل اسلامی دستور نافذ کیا جائے۔ لیکن اسکے اعراض پر محمول نہ کیا جائے۔ بلکہ ملکی حالات وظروف کا وقتی تقاضا اسے سمجھا جائے۔ اس لیے کہ ہم اسلامی دستور کو جمہوری طریقے سے لانا چاہتے ہیں۔ اور جمہوریت تدریج چاہتی ہے۔ اور ہم اس بات پر پورا الیقین رکھتے ہیں کہ سوڈانی قوم کامل اسلامی دستور کی طلب گار ہے۔

بلارمہ: اب میں جناب سے اس تازہ المیہ کے سلسلہ میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں جس کا ظہور اسرائیل کے ساتھ میدان کارزار میں ہوا ہے؟ کیا اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگوں کے اندر دین میں وابستگی میں کمزوری آگئی ہے۔ اور قائدانہ سطح پر مشوروں اور ذمہ داریوں میں دوسرے قائدین کو شریک نہیں کیا۔ جناب کا اس سلسلے میں کیا خیال ہے؟!

حسن مجوب: بے شک ہزیمت کے بنیادی اسباب میں یہ بھی ہیں۔ لیکن اس وقت جبکہ ہماری کوشش ہے کہ عرب صفوں میں اتحاد پیدا ہو تو لازم ہے کہ اس کی یا اس کی کسی کی ملامت نہ کریں تاکہ اللہ کے اس قول کے ہم مصداق نہ بن جائیں کہ بعض بعض کی ملامت کرنے لگے۔

أَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَلَاوَمُونَ

اس وقت ہمارا موقف یہ ہے کہ ہم ایک ہزیمت کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ اور عرب قوم یقیناً جانتی ہے کہ اس ہزیمت کا ذمہ دار کون ہے؟ اور اب ان اسباب کو بھی جان گئی ہے جن کے باعث اس ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا ہے۔

بلارمہ: اور عرب قوم ان لوگوں کو بھی جانتی ہے جنہوں نے خود کہا ہے کہ وہ اس ہزیمت کے ذمہ دار ہیں

حسن مجوب: صدر ناصر نے خود سامنے آکر کہا ہے کہ اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ موصوف کے اس قول کے بعد اب اس کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم کہیں کہ کس پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس لئے اب موجودہ وقت کے پیش نظر ضروری ہے کہ ہم اشخاص اور ذات کو تنازع للبقا کے میدان میں زندگی کے قانون بقائے اصلح والانسب کے حوالہ کرتے ہوئے۔ جو کچھ بچایا جا سکتا ہے اس کو بچانے کی کوشش کریں۔

افکار واصول اور سیاست میں جو کچھ صالح ہے وہی باقی رہنے والا ہے۔ اور وہی باقی رہے گا۔ اور جو بہ دلائل غیر صالح ثابت ہو چکا ہے۔ وہ ختم ہو کر رہے گا۔ اور اب ہم چاہتے ہیں کہ عرب قوم تدبیر سے کام

لے اور پچھلی غلطیوں سے نصیحت حاصل کرے۔ اور امکانی حد تک سب مل جل کر کوشش کریں کہ عار کے داغ دھبے دھل جائیں۔ عربوں کا ملک عربوں کو مل جائے۔ اور مقدس مقامات حسب سابق مسلمان عربوں کے پاس آجائیں۔ اب رہی خطا و صواب کے حساب کی بات تو بے شک حساب کا دن آئے گا لیکن آج اس سلسلہ میں ہماری جلد بازی سے اصل مسئلہ کچھ نقصان پہنچ سکتا ہے۔

آج ہمارے لیے لازم ہے کہ ہم سب کچھ بھول کر ایک صف بن جائیں۔ تاکہ ہمیں ہمارا بلند مقصد حاصل ہو جائے ہم اپنا ملک اور اپنی سرزمین اور اپنی چھینی ہوئی عزت چھین کر واپس لے لیں۔

بلدر: جناب کی رائے بسر و چشم۔ لیکن کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ "جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ حساب کا دن نہیں ہے ان کا موقف صحیح نہیں ہے۔ بایں طور کہ ہم دشمن کے ساتھ اگلے معرکہ کی تیاری کے مرحلہ میں ہیں پس اگر ہمیں یہ احساس ہے کہ یہ معرکہ اللہ کے اذن اور مشیت سے اللہ کے بھروسے اور سہارے سے دشمن کے ساتھ آخری معرکہ ہوگا تو لازم ہے کہ ہم ان کمزوریوں پر ابتداء ہی میں ہاتھ رکھیں جو اس سال رسوائی کا سبب بنی ہیں۔ جناب کی رائے اس پہلو سے بھی میں جاننا چاہتا ہوں؟"

حسن محجوب: عرب وزراء خارجہ کی کانفرنس میں جو پچھلے دنوں منعقد ہوئی تھی غلطیوں کی اصلاح کے لیے غور و فکر کا یہ پہلو ہم نے اپنایا تھا اور اب عرب چوٹی کانفرنس میں جس کے انعقاد کی تیاری ہو رہی ہے۔ ہمارے پیش نظر یہ ہے لیکن ہم اسے محاسبہ نہیں کہتے۔ اور ہم آپ سے بھی یہی کہنا چاہیں گے کہ آپ محاسبہ کا لفظ استعمال کیے بغیر غلطیوں کی اصلاح کرنا چاہیں گے تو جن لوگوں سے غلطیاں ہوئی ہیں انہیں اپنی بات سننے کے لیے مستعد پائیں گے — اور بے شک ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ایک مضبوط وحدت پیدا کرنے کے لیے اپنے باہمی اختلافات کو مٹانا ہوگا۔ اور نشر و اشاعت کے ان وسائل کو روک دینا ہوگا جن کے ذریعے گالیوں اور الزامات کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ عرب ملکوں میں جو نظام قائم ہیں ان کے درمیان بقائے باہم کا راستہ اپنانا ہوگا۔ اور ہر عرب ملک سے ہم یہ چاہیں گے کہ وہ اس موقف کے لئے جتنی مدد کر سکتا ہے کرے۔ دانائی اور حکمت کا بھی یہی تقاضا ہے۔ کہاوت ہے کہ اگر ہم اطاعت کرانا چاہتے ہیں تو وہی سوال کریں جس کی بجا آوری ممکن ہو۔ اور اس طرح جب ہماری تیاریاں مکمل ہو جائیں گی تو ہماری دفاعی صلاحیت ہماری کامیابی کی ضامن بن سکے گی۔ سیاسی میدان میں بھی ہم کامیابی حاصل کر سکیں گے۔ اور عسکری میدان میں بھی۔ اور

اور اس کے لئے ہم وزراء خارجہ اور چوٹی کانفرنس کے انعقاد کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔ (محمد اللہ کہ موصوف کی کوششیں بارآور ہوئیں اور یہ دونوں کانفرنسیں منعقد ہو چکی ہیں۔) اور اس وقت میں خاص اسی کام کے لئے حاضر ہوا ہوں کہ سوڈانی حکومت کی طرف سے سعودی حکومت کے سامنے یہ دعوت پیش کروں۔ اس موقع پر میں نے شاہ فیصل کے اندر ہمدردی پائی۔ اور یہ محسوس ہوا کہ وہ ہمارے مقاصد اور منزل کو بہتر طور سے سمجھتے ہیں۔ موصوف پورے خلوص سے ہماری دعوت قبول کی ہے اور چاہتے ہیں کہ ان اسباب کو دور کیا جائے۔ جن کے باعث اس معرکہ میں ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔

مجھے یقین ہے کہ اب لوگوں کو تجربات نے بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ اور اب وہ ان بہت سی باتوں سے فائدہ اٹھائیں گے، جیسے کل تک وہ سننا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ اس لیے کہ ان نتائج تک اب ضرورت نے پہنچا دیا ہے، اور اور اب ناگزیر ہے کہ ہم آپس میں تسامح اور تعاون کی راہ اپنائیں۔ کل تک ہم میں سے ہر نوجوان، مرد اور عورت اپنے آباؤ اجداد کے اوپر فخر کرتے میں سرشار تھا۔ لیکن آج موقف دوسرا ہے جو سبق ہے وہ بڑا ہی تلخ ہے۔ اور اب ضروری ہے کہ ہم اس سے فائدہ اٹھائیں۔

انا ولنسر: ہم اس وقت بیت الحرام کے قریب ہیں۔ ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ عربوں میں اتحاد پیدا کر دے۔ اور وہ عربوں کو ان کے مسلمان بھائیوں سے طاقت پہنچائے۔ اور جب ہم جہاد کے لئے نکلیں تو وہ اپنی مدد سے سرفراز فرمائے۔ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کا مصمم ارادہ کر چکے ہیں۔ یہ مقدس اسلامی معرکہ ہوگا۔

حسن مجوب: بہت بہت شکریہ اور اب اسی موقع پر میں اپنی بات شاہ فیصل کے شکریہ کے ساتھ ختم کرنا چاہتا ہوں، شاہ فیصل اور حکومت کے افراد جس خندہ پیشانی سے پیش آئے اور جس طرح دعوت قبول کی ہے اس کے لئے ہم شکر گذار ہیں اور ہماری یہ آرزو ہے کہ یہ دورہ اس اجتماعی موقف کی ابتدا بن جائے جیسے ہم عربوں کے مسئلہ کو حل کرنے اور کلمۂ لا الٰہ الا اللہ کو بلند کرنے کے لئے اپنانا چاہتے ہیں۔

اے صاحب ایمان! اگر تم اللہ کے دین کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو جما دے گا اور جو لوگ منکر ہوئے سو ان پر افسوس ہے اور ان کے اعمال ضائع ہوئے، یہ اس لئے کہ انھوں نے اللہ کی طرف سے نازل کردہ باتوں کو ناپسند کیا سو ان کے اعمال اکارت گئے۔

آغا شورش کاشمیری

اسرائیل

مصر تا شام مصائب کی گھٹا چھائی ہے
برق اعراب پہ ٹوٹی ہے کہ لہرائی ہے

شرقِ اُردن کا جگر چیر گئی تیغِ یہود
عرصۂ جنگ میں انگریز کی بن آئی ہے

صورتِ حال کے عنوان پتہ دیتے ہیں
آخرِ کار حجاز و شام کی پسپائی ہے

خود فروشوں کی جماعت پہ خدا کی پھٹکار
نائکہ ہے کہ طوائف ہے کہ ہرجائی ہے

للعجب! قبلۂ اوّل میں مسلماں کی شکست
ربِّ کعبہ! ترے اسلام کی رسوائی ہے

روس کی مصلحت اندیش سیاست توبہ
جس نے بھی اس پہ بھروسہ کیا سودائی ہے

ایک لحظہ کے لئے اہلِ چمن غور کریں
بادِ صرصر گل و لالہ کو اڑا لائی ہے

الجزائر کے جوانوں کو سلام شاعر
ان سے تارِ رگِ شجاعت نے جلا پائی ہے

سیر کا وقت ہے راوی پہ کھڑا ہوں شورش
اس رعایت سے مری نظم بھی دریائی ہے

پہلا ایٹم بم اسرائیل میں استعمال ہوگا

اگر گناہ کی شدت کو اس پیمانہ پر ناپا جائے جس پر گناہگار، حق کے خلاف گناہ کرتا ہے تو پھر یہ صحیح ہے کہ ۱۹۴۸ء میں یہودیوں نے فلسطینی عربوں کو ان کے گھروں سے مار بھگانے کی جو کارروائی کی تھی، وہ مختلف ادوار میں بخت نصر، ٹیٹوس ہڈریان، ہسپانیوں اور پرتگالیوں کے ہاتھوں فلسطین اور دوسرے علاقوں میں یہودیوں کو اجاڑنے، ظلم و ستم کا نشانہ بنانے اور ان کی نسل ختم کرنے سے بھی بدتر تھی، ۱۹۴۸ء میں یہودی ذاتی تجربہ کی بنا پر یہ جانتے تھے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ یہ ان کا ایک بدترین المیہ تھا کہ نازی جرمنوں سے ان کو جو سبق ملا" اس کو بالائے طاق رکھا اور خود ان مظالم اور بدی کی نقل شروع کر دی، جو نازیوں نے یہودیوں کے خلاف کی تھی، فلسطین کے عرب یورپی یہودیوں کے بدترین ظلم کا نشانہ بن گئے ——

"تاریخ کا مطالعہ" پروفیسر ٹائن بی۔

فلسطین کے سابق برطانوی ملٹری گورنر میجر جنرل ای۔ ایل سپیرس نے "گارڈین" کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ:۔

"تاریخی بنیادوں پر یہودی بیت المقدس اور فلسطین کے بارے میں آج جو دعوے کر رہے ہیں وہ ایک لمحہ کے لیے بھی قابل اعتنا نہیں ہیں کیونکہ بیت المقدس جتنا عرصہ عربوں کے قبضہ میں رہا ہے یا اس شہر میں عربوں کی کثیر آبادی جتنے عرصے سے مقیم ہے یہودی کبھی بھی اتنا عرصہ اس پر قابض نہیں رہے اور نہ ہی کبھی یہاں یہودیوں کی اکثریت رہی ہے حقیقت یہ ہے کہ یورپی یہودیوں کی اکثریت اور کروڑوں امریکی یہودیوں کا اصل یہودیوں یا موسیٰ کے نصرانیوں سے کوئی خونی رشتہ نہیں بلکہ وہ کریمیا کے قبائل کی اولاد ہیں جنہوں نے یہودی مذہب قبول کر لیا تھا۔ اس لیے امریکہ کی یہودی آبادی کو اس قسم کے دعویٰ کا کوئی حق نہیں کہ وہ اپنے ہی قدیم "ہوم لینڈ" کو واپس چاہتے ہیں یا اپنے قدیم وطن میں واپس آئے ہیں، فلسطین پر یہودیوں کا دعویٰ، مغربی افریقہ پر امریکی نیگروز

یا جمہوریہ آئرلینڈ اور برطانیہ پر امریکی شہریوں کے دعوے سے بھی کم تر اور کمزور ہے۔

اگر ہم بے گھروں کو جگہ دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں تو ہمیں انہیں اپنے ملک میں جگہ دینی چاہیئے مثال کے طور پر ہم برطانیہ میں کینٹ یہودیوں کے حوالے کر دیں، ورنہ یہ امر حتمی ہے کہ پہلا ایٹم بم اسرائیل میں استعمال ہوگا، اور اگر ایسا ہوا تو یہودی پھر بے گھر ہو جائیں گے، لیکن میرا خیال ہے کہ ان کی بحالی کے لیے ہم اس بری مثال کی "تقلید" نہیں کریں گے جو امریکیوں اور خود ہم نے یہودیوں کو اسرائیل میں بسا کر قائم کی ہے۔

ہلبورن کالج میں بین الاقوامی قانون کے پروفیسر موسیٰ المضاوی نے کہا ہے کہ بیسویں صدی میں کسی کی حکومت کے لیے تاریخ کو بنیاد نہیں بنایا جا سکتا کیونکہ اگر ایسا ہوا اور کسی قوم کی قدیم مملکت یا اس کے مذہبی مقامات پر حکومت کو اس کا حق تسلیم کر لیا گیا تو موجودہ دنیا کا نقشہ قطعی بدل جائے گا — بیت المقدس پر اسرائیل کا دعویٰ اس کے موجودہ فوجی قبضے کی بنا پر ہے۔ لیکن فوجی قبضے کو قانونی حیثیت نہیں دی جا سکتی جبکہ اس نے مقامی باشندوں کے حقوق کا احترام نہ کیا ہو۔ یا کسی دوسری مملکت کی حدود میں مداخلت کی ہو۔ موجودہ بین الاقوامی قانون اور اقوام متحدہ کا چارٹر فوجی طاقت کے ذریعے علاقائی حدود کی خلاف ورزی کی سختی سے مذمت کرتا ہے، ۱۹۴۷ء میں اقوام متحدہ کی تقسیم فلسطین کی سکیم کے مطابق بیت المقدس کو بین الاقوامی علاقہ قرار دیا گیا تھا جس کے بعد اردن اور اسرائیل نے شہر کے مختلف حصوں پر قبضہ کر کے ان حصوں میں اپنا قانون رائج کر دیا اور اکثر ملکوں نے خواہی نخواہی شہر کے مختلف حصوں کو ان ملکوں کا علاقہ تسلیم کر لیا وہ جن کے قبضے میں تھے۔

یہی وجہ ہے کہ برطانیہ اور امریکہ نے بھی بیت المقدس کو اسرائیل کا علاقہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ کیونکہ بیت المقدس کی قانونی حیثیت کو اسرائیلی قانون کے ذریعہ تبدیل نہیں کیا جا سکتا بیت المقدس بلاشبہ اردن کا علاقہ ہے۔"

ڈاکٹر عمر ازوفی ڈائریکٹر موتمر عالم اسلامی نیویارک آفس نے "نیویارک ٹائمز" کے نام ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ:

" وہ لوگ جو مقبوضہ فلسطین کے بارے میں یہودی دعاوی کی تائید کرتے ہیں، بنیادی حقائق کو فراموش کر رہے ہیں۔ ان کے تمام دلائل حقائق اور قانون کے سامنے کوئی اہمیت نہیں رکھتے، یہودی مقبوضہ فلسطین میں غاصب کی حیثیت سے داخل ہوئے وہ غاصب ہیں اور ۱۹۱۷ء کے بعد کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا جس کی آڑ لے کر حقیقت کو جھٹلایا جا سکتا۔ اس کے باوجود کہ بہت سے ملکوں نے اسرائیل کو تسلیم کر لیا ہے اور اسے اقوام متحدہ کی رکنیت بھی حاصل ہو گئی ہے

ان کے حق کے بارے میں ایک بنیادی نقص ہے، اور
یہی وہ نقص ہے جس کی بنا پر اسرائیل اس بات پر مصر
ہے کہ اسے عربوں سے تسلیم کرایا جائے، کیوں کہ وہ
جانتا ہے کہ مقبوضہ فلسطین پر قبضہ کے باوجود یہ علاقہ
اس کا حق قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ یہ علاقہ عرب
عیسائیوں اور مسلمانوں کی ملکیت ہے اور وہی اسکے
واحد حق دار ہیں۔

یہودیوں نے ۱۹۱۷ء میں برطانیہ سے ساز باز
کے بعد عربوں پر جنگ مسلط کر دی اور برطانیہ نے اس
سازش کے عوض یہودیوں کے اثر و رسوخ سے
امریکہ کو اپنا اتحادی بننے پر مجبور کر دیا۔ قضیہ
فلسطین کی اصل بنا برطانیہ کا وہ وعدہ ہے، جس
کے تحت برطانیہ نے فلسطین میں یہودیوں کو "ہوم لینڈ"
دینے کا اعلان کیا تھا اور دنیا آج تک اس المیہ کو
فراموش نہیں کر سکی۔ مزید براں ڈنکرک میں فوجی
شکست کے بعد برطانیہ نے ہار نہیں مانی تھی اور
نہ ہی فرانس نے اس وقت شکست تسلیم کی جب
جرمنی نارمنڈی کے راستے فرانس میں داخل ہوا،

اسی طرح روس نے بھی اس وقت شکست
تسلیم نہیں کی جب جرمنی نے ماسکو اور وادی ڈون
میں پیش قدمی کی، بلکہ بالآخر یہ ریاستیں جنگ میں کامیاب
رہیں، عرب دس کروڑ سے زیادہ ہیں ان کا رقبہ
وسیع اور ذرائع بے شمار ہیں۔ اور وہ طویل عرصہ تک
جنگ لڑ سکتے ہیں لہٰذا وہ آخری فتح حاصل کرنے تک
بار بار لڑتے رہیں گے۔"

لیکن یہ محرومی عارضی ہے

عقیدہ اور یقین ہے کہ یہ محرومی عارضی ہے، اللہ
تعالیٰ ان کو دوبارہ شرف عطا فرمائے گا۔ لیکن اس
کے لئے سنت اللہ کے مطابق مخلصانہ جدوجہد،
جانفروشی و خود فراموشی، فکر و نظر کی صحت، عقیدہ و
خیال کی وحدت، تعاون و اعتماد باہمی کی دولت
اور مختصر الفاظ میں اس دینی، بے لوث و بے غرض
قیادت اور اس "نقطۂ جامعہ" کی ضرورت
ہے جس پر آج پھر عالم اسلام کے منتشر اور متفرق
اجزا اور قومیت اسلامیہ کے متباین عناصر جمع ہو جائیں
آج بھی صرف ان ھٰذہٖ اُمتکم اُمۃ واحدۃ کے
عقیدے اور "یا للاسلام" اور "وا محمداہ"
کے نعرے ہی میں یہ طاقت ہے کہ وہ دنیا کے
تمام مسلمانوں میں نئی روح، نیا جذبہ، کثرت میں
وحدت، ضعف و انتشار میں قوت و مرکزیت،
ذلت و نکبت میں سربلندی و عزت اور شکست
و ہزیمت میں فتح و نصرت کی شکل پیدا کر دے
اور تاریخ اسلام میں ایک نئے معجزے کا ظہور
ہو، جس سے دنیا کی نگاہیں پھر خیرہ ہو جائیں۔

**ملی اسلامی یونیورسٹی کے قیام کی
تحریک کی دامے، درمے، سخنے مدد قومی
دینی فریضہ ہے۔**

ماہر القادری

مشہدِ اکبر

یہ قبلۂ اوّل پہ عجب وقت پڑا ہے
تکبیر کے نغمے، نہ مؤذن کی صدا ہے

تجوید، نہ تسبیح، نہ منبر پہ وہ خطبے
خاموش درو بام ہیں سنسان فضا ہے

سب عالمِ حیرت میں ہیں ہیکل ہو کہ صخرا
زیتون کی وادی ہے کہ گنجِ شہدا ہے

ہیں سوگ میں ڈوبے ہوئے نابلس و اریحا
القدس کے اطراف میں اِک حشر بپا ہے

محرابِ حرم نالہ و فریاد سراپا
یہ مسجدِ اقصیٰ ہے کہ اِک بزمِ عزا ہے

اُردن ہے کہ ہے مشہدِ اکبر کا نمونہ
پانی کی طرح خونِ مسلماں کا بہا ہے

جس قوم پہ قرنوں سے ہے اللہ کی پھٹکار
اس قوم کو اب فتح کا اعزاز ملا ہے

ہیں ارضِ مقدس پہ یہودی متصرف
اے غیرتِ حق! حشر میں اب دیر ہی کیا ہے

یہ غم وہ قیامت کہ بیاں ہو نہیں سکتا
سوچا ہے تو الفاظ نے دم توڑ دیا ہے

فریاد ہے اے مصلحتِ کاتبِ تقدیر!
مُسلم کا لہو دستِ یہودی کی حنا ہے

شیطان کی ایجنٹ نصاریٰ کی ہے ٹولی
اور رُوس بھی درپردہ شرارت پہ تلا ہے

ہم آج ہیں تاریخ کے خود رحم و کرم پر
ہم وہ تھے کہ تاریخ کا رُخ موڑ دیا ہے

بے عیب ہے اللہ کا قانونِ مکافات
جو کچھ بھی ہوا اپنے گناہوں کی سزا ہے

کب آئیں گے اللہ کی نصرت کے فرشتے
ہر ٹوٹے ہوئے دل کی یہ غمناک صدا ہے

مِس فرحت افضل

جب بیت المقدس ہمارے قبضہ میں آیا

فلسطین کی محکومی اور غلامی کی تاریخ طویل اور حیرت انگیز ہے۔ حضرت داؤدؑ وسلیمانؑ جیسے جلیل القدر پیغمبروں کا سایہ اٹھ جانے کے بعد فلسطین کے بنی اسرائیل آپس میں لڑنے لگے۔ ان کی سلطنت دو حصوں میں بٹ گئی۔ اور ۷۲۱ قبل مسیح میں آشوریوں نے انہیں تاخت وتاراج کر دیا ان کے بعد بابل و نینوا کے معلق باغوں کے خالق بخت نصر نے ان پر حکومت کی اور پھر ایران کے دارا اوّل اور اس کے جانشینوں اور سکندر اعظم کے جرنیلوں نے اہل فلسطین کو صدیوں تک غلام بنائے رکھا۔ تا آنکہ ۱۵ ہجری (۶۳۶ء) میں مسلمانوں کے خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ نے بیت المقدس پر اسلام کا پرچم لہرایا۔

تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ پہلا واقعہ ہے کہ جب ایک فاتح شہر میں داخل ہوا تو مفتوح باشندوں نے اس کے ورود پر مسعود کا جشن منایا ہو۔ اس نے تھوڑا سا وقت ان کے پاس گزارا اور انہوں نے دیکھا کہ جن شرائط پر صلح ہوئی ہے وہ اپنے عمل میں ان سے کہیں زیادہ فیاضی اور انسان دوستی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ اور اس قدر محتاط ہے کہ اگر نادانستہ اس سے کوئی غلطی ہو بھی جائے تو فوراً اس کا ازالہ کر دیتا ہے۔

فاروق اعظمؓ کے بیت المقدس تشریف لے جانے کا واقعہ اسلامی تاریخ میں بہت مشہور ہے۔ اسلام کی تاریخ میں وہ پہلے سربراہ مملکت تھے جو عرب سے باہر کسی مفتوح علاقے میں تشریف لے گئے۔ خود ان کی زندگی کا یہ پہلا اور آخری سفر تھا

حضرت عمرؓ کے فلسطین تشریف لے جانے کا سبب یہ ہوا کہ جب شام کی فتوحات کی تکمیل قریب تھی۔ تو خلیفہ کے حکم پر حضرت عمرو بن عاصؓ فلسطین کی طرف متوجہ ہوئے۔ ابو عبیدہؓ اور خالد بن ولیدؓ ابھی شام کی مہموں میں مصروف تھے۔ حضرت عمرو بن عاصؓ جو بعد میں فاتح مصر کہلائے، اپنی سیاست دانی اور ڈپلومیسی کے لئے بہت مشہور تھے۔ تاریخ میں انہیں "سیاس العرب" کہا جاتا ہے۔ فلسطین میں ان کے مقابلے پر رومیوں کا سب سے بڑا جرنیل

ارطبون تھا جس کا شہرہ مدینہ میں پہنچ چکا تھا۔ جب دونوں عظیم جرنیل آمنے سامنے ہوئے اور حضرت عمرؓ کو اطلاع ملی تو آپ نے مسکرا کر فرمایا۔ "ہم نے عرب کے ارطبون سے لڑا دیا ہے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے؟"

بیت المقدس کے لوگ قلعہ بند ہو کر بیٹھ رہے اور محاصرہ کئی روز تک جاری رہا۔ محصور باشندوں نے بڑی بے جگری اور جوانمردی سے مقابلہ کیا۔ جب شہر کی مقاومت شدید ہو گئی تو ابن عاصؓ نے حضرت عمرؓ کو لکھا کہ میرا واسطہ سخت جان دشمن سے پڑ گیا ہے، فوج بہت کم ہے کمک بھجوا دیجئے۔"

حضرت عمرؓ بیت المقدس کے محاصرے کی طوالت سے پریشان تھے۔ طبری نے لکھا ہے کہ بیت المقدس کے باشندے ابن عاصؓ کے لئے اور ابن عاصؓ ان کے لئے مصیبت بن گئے۔ خط مدینہ پہنچا تو آپ نے مسجد نبوی میں مسلمانوں سے مشورہ کیا اور خود کمک کے ہمراہ جانے کا ارادہ کیا۔ حضرت عثمانؓ بن عفان نے آپ کے جانے کی مخالفت کی لیکن حضرت علیؓ نے حق میں رائے دی اور فرمایا کہ مسلمان سخت پریشان ہیں انھوں نے موسم کی سختی، جنگ اور طویل مسافرت کی غیر معمولی مشقت برداشت کی ہے، بہتر ہے کہ آپ تشریف لے جائیں۔ انہیں تسلی ہو گی۔ یاد رہے کہ اسلامی فتوحات کے اس زمانے میں فوج کے آرام کا غیر معمولی خیال رکھا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس رائے سے اتفاق کیا اور حضرت علیؓ کو اپنا نائب مقرر کر کے خود روانہ ہو گئے۔

اپنے وقت کا یہ طاقت ور اور وسیع سلطنت کا حکمران خاکستری رنگ کی ایک اونٹنی پر سوار ہوا۔ اور مدینۃ الرسول سے قبلۂ اول کی طرف کوچ کیا۔ اونٹنی پر دو تھیلے لٹک رہے تھے ایک میں ستو اور دوسرے میں کھجوریں تھیں۔ سامنے پانی کا مشکیزہ تھا۔ اور ایک کشکول میں دیگر زادراہ ہر روز صبح کے وقت آپ کشکول کھول کر سامنے رکھ لیتے اور ساتھیوں کے ساتھ مل کر کھانا کھاتے بیت المقدس کے قریب صحرائے شام اور اردن کے درمیان ایک مقام جابیہ میں قیام فرمایا۔ ابو عبیدہ اور خالدؓ بن ولید کو بھی یہاں پہنچنے کا حکم مل چکا تھا۔ بیت المقدس میں جب حضرت عمرؓ کی آمد کی خبر ملی تو ارطبون تھوڑی سی فوج لے مصر کی طرف کھسک گیا۔ بیت المقدس کے پادری صفرنیوس جو اب اکیلا رہ گیا تھا اُس نے کہلا بھیجا کہ حضرت عمرؓ خود صلح کا معاہدہ کریں

علم کے مقام پر شام میں مسلمانوں کے سپہ سالار حاضر ہوئے سب سے آگے معاویہؓ اور بن ابی سفیانؓ تھے ان کے پیچھے ابو عبیدہؓ آخر میں خالدؓ بن ولید تھے

پرستاگوں پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ شاندار کپڑوں
میں ملبوس تھے۔ حضرت عمرؓ یہ دیکھتے ہی تڑپ
اٹھے اور انتہائی غصہ میں زمین سے کنکریاں اٹھا
کر ان کے سینوں پر ماریں۔ اور فرمایا کتنی جلدی
تم لوگوں نے اپنی وضع بدل لی۔ اس لباس میں مجھ
سے ملنے آتے ہو۔ کیا دو ہی برس میں تم آپ
سے باہر ہو گئے۔ اگر دو سو برس تمہاری یہی حالت
رہی تو خدا تم کو بھول کر اوروں کو تمہاری جگہ حکومت
دے دے گا۔ فوج کے سرداروں نے اپنی
لہراتی ہوئی عبائیں اٹھا کہ وہ ہتھیار دکھائے
جو انہوں نے جسم پر لگا رکھے تھے۔ اس پر حضرت
عمرؓ کا غصہ قدرے کم ہوا۔ اور ان سے
بات چیت کی۔

خود ان کا لباس یہ تھا موٹے کا ایک
لمبا کرتا زیب تن تھا جس پر کئی پیوند لگے ہوئے
تھے۔ بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ گاڑھے
کا کرتا تھا۔ اور ایک جانب سے پھٹ گیا تھا۔

جابیہ میں حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یہاں
مقامی سردار کو بلایا جائے۔ جلومس کو لایا گیا۔
آپ نے اپنا کرتہ اتار کر اسے دیا کہ اس کی مرمت
کر دے اور اسے دھو کر لے آئے۔ جب تک
مجھے کوئی کپڑا دے دو۔ جلومس نے ایک ریشمی
قمیص حاضر کی۔ فرمایا یہ کیا ہے؟ عرض کیا گیا
ریشم ہے۔ پھر پوچھا ریشم کیا ہوتا ہے؟ لوگوں نے
بتایا، بالآخر فرمایا اچھا ٹھیک ہے اور پہن لیا۔
اپنی قمیص دھل کر آئی تو اسے اتار دیا۔ اس پر جلومس
نے کہا کہ آپ عرب کے بادشاہ ہیں اپنے مفتوح ملک
میں اونٹ پر سواری اور ایسا لباس اچھا نہیں۔ ترکی
گھوڑا منگوایئے اور سفید کپڑے پہنیے۔ رومیوں کی
نگاہ میں آپ کی عزت بڑھے گی۔ ناراض ہو کر فرمایا
کہ خدا نے ہمیں جو عزت دی ہے وہ اسلام کی وجہ
سے ہے اس کے سوا ہم کو کچھ نہیں چاہیئے۔ البتہ
تھکی ہوئی اونٹنی کا خیال کر کے گھوڑا کی سواری پر
راضی ہو گئے۔ لیکن جب شاندار ترکی گھوڑا اٹھلاتی
ہوئی چال چلنے لگا تو فرمایا "روکو! روکو میں نے
اس سے پہلے کسی کو شیطان پر سوار ہوتے نہیں دیکھا۔"

ایک اور تاریخی روایت میں ہے کہ مقامی
سردار جلومس کے علاوہ خود مسلمانوں کی بھی
خواہش تھی کہ آپ سفید کپڑے پہنیں اور ترکی
گھوڑے پر سوار ہوں سب نے مل جل کر آپ
کو دونوں باتوں پر آمادہ کیا۔ حضرت عمرؓ نے
سب کے اصرار پر سفید کپڑے زیب تن کئے
کندھے پر وہ خوبصورت رومال ڈال لیا جو ابو عبیدہؓ
نے آپ کے لئے بھیجا تھا۔ ترکی گھوڑے پر بڑی
شان سے سوار ہوئے۔ مسلمان فوجی جو اپنے
خلیفہ اور سالار اعظم سے عشق کرتے تھے بہت

خوش ہوئے لیکن جب گھوڑے پر سوار ہوئے تو فوراً اتر آئے اور مسلمانوں سے کہا "میری لغزش سے درگذر کرو اللہ قیامت کے روز تمہاری لغزش سے درگذر فرمائے گا۔ جس نخوت اور کبر و غرور نے اس وقت میرے دل میں راہ پائی وہ شائد تمہارے امیر کو ہلاک کر دیتا۔" یہ فرما کر پھر سے اپنے پرانے کپڑے پہن لئے۔

ابن کثیر نے فلسطین کے سفر کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ کی پیشانی کا اوپر کا حصّہ دھوپ میں چمک رہا تھا سر پر نہ ٹوپی تھی نہ عمامہ دونوں پاؤں رکاب کے بغیر اونٹنی کے کجاوے سے لٹک رہے تھے۔ اونٹنی کی پیٹھ پر ایک پرانا کمبل تھا۔ جو رات کو بستر کا بھی کام دیتا تھا خرجی چیتے کی کھال کی تھی جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔ رات کو آپ اسے تکیہ بنا لیتے۔

بہرحال خلیفہ وقت کا یہ پہلا اور آخری سفر بڑا شاندار تھا۔ وہ اپنے مفتوحہ علاقوں سے گذر رہے تھے۔ اور جگہ جگہ ساتھیوں اور دوسرے لوگوں کے سامنے اسلامی تعلیمات پر تقریر کرتے جاتے تھے، رعایا کے حالات کا مشاہدہ بھی جاری تھا۔ تاریخ نے بڑے بڑے باجبروت شہنشاہوں کے سفروں کو بھلا دیا جن پر جشن کا گمان گذرتا تھا۔ لیکن اس سفر کی جزئیات تک تاریخ کا سرمایہ بن گئی ہیں۔

حضرت عمرؓ نے جابیہ میں ہی بیت المقدس کے پادری کے ساتھ اس کی درخواست پر صلح کر لی۔ اس سے پہلے اہل دمشق سے جو صلح ہو چکی تھی اس سے بھی فیاضانہ شرائط پر صلح کی گئی۔ صلح نامہ کا ابتدائی حصّہ یہ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، یہ وہ امان ہے جو خدا کے بندے امیر المومنین عمر نے ایلیاء (بیت المقدس) کے لوگوں کو دی۔ یہ امان ان کی جان و مال، گرجا و صلیب، تندرست و بیمار کے لئے ہے۔ اس طرح کہ ان کے گرجاؤں کو نہ مسکن بنایا جائے گا نہ وہ ڈھائے جائیں گے انہیں یا ان کے احاطوں کو نقصان نہ پہنچایا جائے گا نہ ان کی صلیبوں اور مال و متاع میں کمی کی جائے گی۔ مذہب کے بارے میں ان پر کوئی جبر نہ ہو گا۔ ان میں سے کسی کے ساتھ کوئی بدسلوکی روا نہ رکھی جائے گی۔"

صلح نامہ کے آخر میں یہ عبارت ہے۔

"اور جو کچھ اس تحریر میں درج ہے اس پر خدا کا، رسول خدا کا، خلفاء کا اور مسلمانوں کا ذمہ ہے۔ بشرطیکہ یہ لوگ مقررہ جزیہ ادا کرتے رہیں۔"

صلح نامہ پر حضرت عمرؓ نے مہر لگائی اور

عبدالرحمٰنؓ بن عوف، معاویہؓ بن ابی سفیان
خالدؓ بن ولید، اور عمروؓ بن عاص نے بطور گواہ
دستخط کیے۔

بیت المقدس والوں کو جب اس صلح نامہ
کا علم ہوا تو وہ حیران رہ گئے۔ اور انھوں نے
خوشی سے جشن منایا۔ جب آپ پیغمبروں کے
شہر میں داخل ہوئے تو آپ نے پادریوں اور عوام
سے بے حد شفقت اور مہربانی کا سلوک کیا۔

حضرت عمرؓ کے سامنے بیت المقدس کا
عظیم شہر تھا مسلمانوں کا پہلا قبلہ، عیسائیوں
کے لیے حضرت عیسٰی کی جائے ولادت، یہودیوں
کے لیے ارضِ معاد، انبیاء و رسل کا شہر، حضرت
موسٰی کلیم اللہ مصر سے یہودیوں کو نکال کر یہیں
لے آئے تھے۔ حضرت عیسٰی کو صلیب دینے
کا واقعہ یہیں پیش آیا۔ جس کی بنا پر کلیسائے
قیامت تعمیر کیا گیا۔ محراب داود، صخرۂ یعقوب
دیوار گریہ اور ہیکل سلیمانی۔ اس
شہر کے در و دیوار پر روحانیت کی تاریخ نقش
تھی۔ معراج پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہیں
سے تشریف لے گئے تھے۔ اور یہیں آپ کی
امامت میں جلیل القدر پیغمبروں نے نماز پڑھی تھی
رسول خدا کے بعد حضرت عمرؓ وہ پہلے مسلمان تھے
جنھوں نے یہاں نماز کی امامت کرائی۔

صبح کے وقت پادری صفرنیوس حضرت عمرؓ
کو شہر کی سیر کرانے لے گئے۔ اس پادری نے بڑے
جذب و شوق اور عقیدت کے ساتھ مسلمانوں
کے خلیفہ کو اس شہر کے آثار سے روشناس کرایا۔

سیر کے دوران جب نماز کا وقت آیا تو آپ
اس وقت کلیسائے قیامت میں تھے۔ پادری
نے کہا یہ بھی ایک سجدہ گاہ خداوندی ہے۔
آپ یہاں نماز پڑھ لیں لیکن آپ نے فرمایا اگر
میں نے یہاں نماز پڑھ لی تو مسلمان بھی ایسا ہی
کریں گے اور عیسائیوں کو گرجوں سے نکال
دیں گے۔ آپ آگے بڑھے تو کلیسائے قسطنطین
کے دروازے پر عیسائیوں نے نماز کے لیے
چادر بچھا دی۔ ایک روایت ہے کہ آپ نے یہاں
نماز پڑھ لی لیکن فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا اور
اسی وقت یہ فرمان لکھ کر پادری کے حوالے کیا کہ
"مسلمان کبھی گرجوں کی دہلیز پر نماز نہ پڑھ سکیں
گے۔" لیکن ایک دوسری روایت میں ہے کہ
آپ نے یہاں بھی معذرت کر دی۔ اور بالآخر
جب ہیکل سلیمانی کے کھنڈروں میں پہنچے تو
وہاں مقدس پتھر "صخرہ" پر نماز پڑھی جہاں سے
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معراج پر تشریف لے
گئے تھے۔ بعد میں یہاں مسلمانوں نے اتنی ہی سادہ
ایک مسجد تعمیر کی جتنی کبھی مسجد نبوی تھی۔

خالد محمود

قبۃ الصخرا

خانہ کعبہ اور گنبد خضرا کے بعد قبۃ الصخرا مسلمانوں کا مقدس ترین مقام ہے۔ اسی طفیل اس شہر کو جس میں یہ واقع ہے بیت المقدس کہا جاتا ہے۔ اس کی قدامت کے ضمن میں کئی روایات بیان کی جاتی ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ ہبوط آدمؑ سے بھی دو ہزار سال پہلے فرشتے اس کا طواف کر چکے تھے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ طوفان نوحؑ کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی جس مقام پر رکھی تھی وہ یہی چٹان تھی۔ پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ قیامت کے دن حضرت اسرافیل اسی چٹان پر کھڑے ہو کر صور پھونکیں گے۔ اکثر مفسرین اور محدثین کی رائے ہے کہ صخرا بہشت کی چٹانوں میں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے بیت الجنت بھی کہا جاتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ قبۃ الصخرا میں ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء کرام نے عبادت کی ہے۔ اور ۸۰ ہزار فرشتے اس کو حلقے میں لئے رکھتے ہیں۔

صخرا عربی میں چٹان کو کہتے ہیں۔ عام روایت کے مطابق اس چٹان کا طول ۵۸ فٹ اور عرض ۴۴ فٹ ہے۔ بعض روایات میں اس کا عرض ۴۴ فٹ ہے۔ اس چٹان کے ایک کونے میں غار ہے جو کسی زمانے میں قربان گاہ تھی۔ اس چٹان پر اگر پاؤں مارا جائے تو بڑی ہیبت ناک آواز پیدا ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چٹان ایک خلا پر رکھی ہے۔ یہ خلا دراصل ایک غار ہے جس کے داخلے کا راستہ جنوب مشرق میں ہے۔ یہ راستہ باب المغارا کہلاتا ہے۔ گیارہ سیڑھیاں اتر کر تہہ خانہ میں پہنچتے ہیں۔ تہہ خانہ کا فرش سنگ مرمر کا ہے: دیواروں پر سفیدی کی گئی ہے۔ فرش سے چھت تک اوسط بلندی چھ فٹ ہے۔ لیکن بعض جگہ اس سے زیادہ اور بعض جگہ اس سے کم ہے۔

اس غار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار مبارک موجود ہیں۔ جن میں موئے مبارک اور نقش پا شامل ہیں۔ غار میں دائیں طرف ایک اور چھوٹا سا غار ہے جسے محراب سلیمانؑ کہتے ہیں۔ بائیں جانب مقام الخلیل ہے۔ شمالی کونے میں مقام خضرؑ اور جنوبی کونے میں مقام داودؑ ہے۔ بعض کتب میں اس غار کو بیر الارواح یعنی روحوں کا کنواں لکھا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار مبارک اصل چٹان کے جنوب مغربی گوشے میں رکھی مرمریں الماری میں محفوظ ہیں۔ جنگوں کے دوران جب عیسائیوں نے بیت المقدس پر قبضہ کیا تو انہوں نے مشہور کر دیا کہ قدم کا نشان حضرت عیسٰیؑ کا ہے۔

اس الماری کے بالمقابل ایک خوبصورت صندوق ہے۔ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمرؓ کے علم محفوظ ہیں۔

چٹان کے مشرق میں تھوڑی سی خالی جگہ ہے جسے قبۃ الانبیاء کہتے ہیں۔ علماء کا کہنا ہے کہ اکثر انبیائے کرام اسی جگہ خدائے وحدہٗ لاشریک کے حضور سربسجود ہوتے ہیں۔

قبۃ الصخرا کی بنا اور تعمیر کے متعلق متضاد روایات بیان کی جاتی ہیں۔ یہودی اور عیسائی بھی اسے مقدس اور اپنا قبلہ تصور کرتے ہیں۔ تاہم عہد نامہ قدیم میں اس کا ذکر موجود نہیں ہے۔ البتہ تلمود وغیرہ میں اس کا ذکر آیا ہے۔ لیکن اس کی تقدیس اور حرمت کا اقرار سب سے پہلے مسلمانوں ہی نے کیا ہے۔ احادیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شب معراج کو یہیں سے براق پر سوار ہو کر خالق ارض وسما کی ملاقات کو تشریف لے گئے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دین ابراہیمیؑ کے احیاء کے لئے تشریف لائے تھے۔ چنانچہ خانہ کعبہ میں مقام ابراہیمؑ کے سامنے نماز ادا فرماتے تھے۔ اس طرح بیت المقدس بھی سامنے آجاتا تھا۔ اس وقت خانہ کعبہ پر مشرکین کا قبضہ تھا۔ مگر آپؐ مشرکوں کے مقابلہ میں اہل کتاب کے قبلہ یعنی بیت المقدس کو ترجیح دیتے تھے آپؐ ہجرت کے بعد تقریباً دو سال تک بیت المقدس ہی کی طرف رخ کرکے نماز ادا فرماتے تھے۔

ہجرت کے دوسرے سال کا واقعہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے ساتھ مدینہ منورہ کے باہر مسجد بنی سلمہ میں بیت المقدس کی جانب رُخ کر کے نماز ادا فرما رہے تھے۔ ابھی آپؐ نے دو رکعتیں ادا کی تھیں کہ وحی الٰہی نازل ہوئی جس کا ترجمہ ہے۔

"اے محمدؐ! اپنا منہ مسجد الحرام کی طرف پھیر دو۔ کہیں بھی رہو اسی کی طرف منہ پھیرو۔" چنانچہ باقی دو رکعتیں خانۂ کعبہ کی طرف منہ کر کے ادا کی گئیں۔ اسی وجہ سے مسجد بنی سلمہ کو اب مسجد قبلتین یعنی دو قبلوں والی مسجد کہتے ہیں

اس وقت تک یہودی اس بات کو اپنے لیے بہت بڑا اعزاز سمجھتے تھے کہ مسلمان بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے تھے۔ لیکن جب مسلمانوں کو قبلہ تبدیل کرنے کا حکم مل گیا تو یہودیوں کو بہت دکھ ہوا۔ وہ مسلمانوں کے درپے آزار ہو گئے۔ اور طرح طرح کی افواہیں پھیلانے لگے۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں جن کا ترجمہ ہے کہ بے وقوف لوگ یہ اعتراض کریں گے کہ مسلمانوں کا جو قبلہ تھا اس سے ان

کو کس نے پھیر دیا۔ کہہ دو کہ مشرق و مغرب سب خدا
ہی کے ہیں۔ تیرا جو قبلہ (کعبہ) تھا اس کو ہم نے پھر قبلہ کر
دیا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ معلوم ہو جائے کہ پیغمبرؐ کا پیرو
کون تھا۔ اور پیچھے پھر جانے والا کون ہے اور بلاشبہ
یہ قبلہ نہایت گراں اور ناگوار ہے۔ بجز ان لوگوں کے
جن کو خدا نے ہدایت کی۔ پھر اسی سورۃ میں آگے
چل کر ارشاد ہوتا ہے۔ مشرق یا مغرب ہی رخ کرنا
کوئی ثواب کی بات نہیں۔ ثواب تو یہ ہے کہ آدمی
خدا پر، قیامت پر، ملائکہ پر، خدا کی کتابوں پر، پیغمبروں
پر ایمان لائے۔ اور خدا کی محبت میں عزیزوں کو یتیموں کو
مسکینوں کو، مسافروں کو، غلاموں کو اپنی دولت دیوے
خداوند تعالیٰ نے جہاں یہودیوں کی افواہوں کی تردید کی
ہے وہاں خود یہودیوں کی اصلیت بھی واضح کی ہے۔

سورہ مائدہ میں ارشاد ہوا ہے (ترجمہ) "وہ
جھوٹ باتوں کے سننے والے اور مال حرام کے کھانے
والے ہیں۔"

بیت المقدس حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں
فتح ہوا۔ شکست خوردہ یہودیوں اور عیسائیوں نے الصخرا
کو کوڑے کرکٹ سے بھر دیا۔ حضرت عمرؓ نے اسے پاک و
صاف کر دیا۔ اسی دوران میں خدا کی قدرت سے موسلا
دھار بارش شروع ہو گئی جس سے پوری چٹان دھل
کر صاف ہو گئی۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے یہاں نماز
ادا کی۔

اس وقت چٹان کے اوپر ایک نہایت خوب
صورت ہشت پہلو عمارت استوار ہے۔ عام طور پر
کہا جاتا ہے کہ اسے حضرت عمرؓ نے تعمیر کرایا تھا۔ مگر
حقیقت یہ ہے کہ اموی خلیفہ عبدالمالک بن مروان
نے تعمیر کرایا تھا۔ یعقوبی کا بیان ہے کہ خلیفہ عبدالمالک
اسے خانہ کعبہ کا بدل بنانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے
صوبہ مصر کی سات سال کی آمدنی کے برابر رقم قبہ کی تعمیر
کے لئے وقف کر دی۔ بعد ازاں خلیفہ عبدالمالک نے
اس کے نواح میں اپنے خزانے کے لئے ایک عمارت بنوائی
جسے قبہ السلسل کا نام دیا۔ مالک کو یہ عمارت اس
قدر پسند آئی کہ اس نے قبۃ الصخرا بھی اسی نمونے کے
مطابق بنانے کا حکم دے دیا۔ جب قبۃ الصخرا کی عمارت
مکمل ہو گئی تو اس کے گرد آبنوس کی نہایت نازک جالی
لگوائی اور اس میں اطلس و کمخواب کے پردے ڈلوائے۔
گنبد کے وسط میں ایک طلائی زنجیر لٹکائی جس کے ساتھ
حضرت ابراہیمؑ کے مینڈھے کے سینگ اور خسرو
شاہ ایران کا تاج بندھا تھا۔ امویوں کے دور حکومت
میں پوری عمارت کو خوشبو سے اس طرح بسایا گیا کہ جو
کوئی وہاں سے ہو کر آتا تھا اس کے لباس سے کئی
روز تک خوشبو آتی۔

عباسی خلیفہ مامون الرشید نے قبۃ الصخرا میں نئے
اضافے کئے۔ چوبی دیوار بنوائی اور گنبد کے اندر خوبصورت
نقش و نگار بنائے۔

فاتح بیت المقدس — صلاح الدین ایوبیؒ

عیسائیوں کے اپنے وقت کے سب سے بڑے مذہبی سربراہ پوپ اربن ثانی نے جنوب مشرقی فرانس کے ایک مقام کیرماؤنٹ میں ۲۶، نومبر ۱۰۹۵ء کو ایک خطبہ دیا جس میں دنیا بھر کے عیسائیوں سے کہا گیا کہ:۔

"اے یسوع مسیح کے فرزندو! بیت المقدس کا رخ کرو اور اسے شیطانی نسل سے چھین کر اس پر قبضہ کرلو!" "یہ شیطانی نسل" کے لوگ مسلمان تھے جو خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے سے فلسطین اور بیت المقدس کے حکمران تھے۔

اس زمانے میں شام اور فلسطین کی سرزمین کئی حصوں میں منقسم تھی اور فوجی لحاظ سے کمزور تھی بعض حصوں پر مقامی عرب حکمران تھے۔ شمال میں سلجوقی ترکوں کی حکومت تھی اور جنوب میں مصر کے فاطمی فرمانروا تھے۔ شام کے سلجوقی گو ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے لیکن تقریباً ہر بڑے شہر کا ایک علیحدہ سلجوقی یا عرب حکمران تھا۔ شام میں سب پہلے ۱۰۷۰ء میں سلجوقیوں کی پہلی جماعت داخل ہوئی

اسی سال سلطان الپ ارسلان نے حلب کے عرب حکمران کو زیر کیا اور اس کے ایک سپہ سالار نے بیت المقدس کو فاطمیوں سے چھین لیا۔ پانچ سال بعد اسی سپہ سالار نے دمشق کو بھی فتح کرلیا لیکن ۱۰۹۸ء میں فاطمیوں کا نہ صرف بیت المقدس بلکہ عسقلان عکہ سور اور جبال پر قبضہ ہوگیا۔ جب عیسائی پوپ نے اپنے پیروکاروں سے بیت المقدس کی طرف پیش قدمی کی اپیل کی تو یہاں اس وقت فاطمی حکمران تھے۔

اسلامی حکومت میں عیسائی شہریوں کو تمام مراعات حاصل تھیں۔ انہیں مکمل مذہبی آزادی تھی وہ سلطنت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کر سکتے تھے۔ دوسرے ممالک میں اپنے ہم مذہبوں سے روابط رکھ سکتے تھے۔ زمین اور جائیداد کے معاملے میں ان پر بھی قوانین عائد تھے جو عام مسلمانوں پر تھے۔ قابل اور با صلاحیت عیسائی حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے ہر جگہ کلیسا اور خانقاہیں موجود تھیں اور عیسائی زائرین کو بیت المقدس میں بلا روک ٹوک آنے کی اجازت تھی۔

بیت المقدس تو مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کے لیے مقدس تھا کا ایک حصہ پادریوں اور ان کے حواریوں کے لیے مخصوص تھا۔ شام و فلسطین پر فاطمیوں کے قبضے کے بعد عیسائیوں کو مزید مراعات مل گئیں۔ فاطمی خلفاء نے عیسائیوں سے تجارت کی حوصلہ افزائی کی اور دوسرے معاملات میں بھی ان کی سرپرستی کرتے رہے۔ لیکن بیت المقدس میں مسلمانوں کی موجودگی کٹر اور متعصب عیسائیوں کو قبول نہ تھی۔ وہ زائرین کر مسلمانوں کی حفاظت میں بیت المقدس آتے اور ان کی مہمانوازی سے لطف اندوز ہوتے لیکن دلوں میں نفرت اور تلخی لے کر واپس جاتے۔

دسویں صدی کے آخر میں عیسائیوں میں یہ خیال عام ہو گیا کہ قیامت قریب ہے اسکے پیش نظر مسیحی دنیا میں ہزاروں زائرین ارض مقدس میں آنے شروع ہو گئے۔ گیارہویں صدی میں تو ان کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ اسی زمانے میں اتفاق ایسا ہوا کہ فلسطین ترکمانوں کے قبضے میں آگیا۔ سخت مزاج ترکمانوں کو ان ڈھیر سارے اجنبی عیسائیوں کی موجودگی سے بڑی الجھن ہوئی اور عیسائیوں کا مذہبی جوش و خروش ان کی سمجھ میں نہ آسکا۔ چنانچہ کبھی کبھار ایسا بھی ہوا کہ بعض پرجوش عیسائی مارے گئے یا لوٹ لیے گئے۔ یورپ کی مسیحی دنیا میں ان واقعات کو خوب اچھالا گیا اور بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا۔

لیکن صلیبی جنگوں کے آغاز کی بڑی وجہ مذہبی سے زیادہ سیاسی تھی۔ مسلمان عیسائیوں پر ہر جگہ غلبہ پا رہے تھے نہ صرف شام اور ایشائے کوچک میں بلکہ اندلس میں بھی مسلمانوں کا شیرازہ یکجا ہو رہا تھا۔ اور عیسائی ان سے شکست کھا رہے تھے۔ عیسائی مسلمانوں سے جنگ کے میدان میں بدلہ لینے کے لئے بے چین اور مضطرب تھے۔ دریں اثناء شہنشاہ الیکزیس نے ۱۰۹۴ء میں پوپ اربن ثانی سے بیت المقدس کو مسلمانوں سے آزاد کرانے کی اپیل کی۔ اس بادشاہ کے ایشیا میں کئی ایک مقبوضات تھے جو سلجوقیوں نے اپنے قبضے میں کر لیے تھے۔ اور وہ آگے بڑھ رہے تھے اور قسطنطنیہ کے لیے خطرہ بن رہے تھے۔ ان سلجوقیوں سے محفوظ رہنے کے لیے اس مسیحی بادشاہ نے یہ چال چلی کہ فلسطین میں محاذ کھول دیا جائے۔ تاکہ سلجوقی آگے نہ بڑھ سکیں۔ پوپ اربن ثانی نے اسی بادشاہ کی درخواست پر دنیا کے مسیحوں سے وہ اپیل کی جس کا ذکر شروع میں آچکا ہے۔

پوپ کے اس وعظ کا عیسائیوں پر بے حد اثر ہوا۔ عیسائی دنیا میں ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک یہ آواز پھیل گئی اور ہر جگہ یہ کہا جانے لگا کہ خدا

کی مرضی یہی ہے، خدا کی مرضی یہی ہے، یہ سب سُرخ کپڑے کی صلیبیں لگا کر اس مہم کے لیے تیار ہو گئے

صلیبی فوج کئی عناصر سے مرکب تھی۔ اس میں ایک تو پاسینڈ ا تھا جسے اپنے لیے مزید مقبوضات کی ضرورت تھی۔ پیزا، وینس اور جینوا کے تاجر تھے۔ جو اپنے کاروبار کی توسیع کے لیے سرگرداں تھے۔ پھر وہ رومان پسند، بے چین اور قسمت آزما نوجوان تھے، جنہوں نے مشرقی شرابوں کی لذت اور یونانی لڑکیوں کے طلسمی حسن کے بہت سے قصے سن رکھے تھے۔ ایک بڑی تعداد ان قیدیوں کی تھی جنہیں اس مسیحی جہاد کے لئے رہا کر دیا گیا تھا۔ فرانس لورین، اٹلی اور سسلی کے وہ فاقہ کش بھی بڑی تعداد میں تھے جنہوں نے بھوک سے پریشان ہو کر فوج میں شرکت کر لی تھی۔ اور فارغ البالی کے متلاشی تھے۔ البتہ چند لوگ ایسے بھی تھے جو کسی دنیاوی لالچ کے لیے نہیں بلکہ محض یسوع مسیحؑ کے نام پر جمع ہوئے تھے اور اس سے اجر کے طالب تھے۔

اوّلین صلیبی سپاہیوں کے دستے قسطنطنیہ میں جمع ہوئے اور وہاں سے شام پہنچے۔ اس زمانے میں شام کئی حصوں میں بٹا ہوا اور کمزور تھا۔ عیسائیوں کو شام میں فتوحات حاصل ہوئیں اور انہوں نے کئی شہروں پر قبضہ کر لیا۔ صلیبی فوجوں نے مفتوحین پر انتہائی مظالم توڑے اور قتل و خونریزی کی حد کر دی۔ ایک بار گیارہ ہزار ترکوں کے سر جو ایک دھاوے میں ہلاک ہوئے تھے، کاٹ لئے گئے اور انہیں فتح کی نشانی بنا کر ہوا میں اچھالا، نیزوں پر لٹکایا اور محصور شہروں کے اندر پھینکا گیا مسلمانوں کی لاشوں کو قبروں سے نکال کر انہیں مسلمان شہریوں کے سامنے لاڈالا گیا اور ان کی بے حرمتی کی گئی۔ عیسائیوں کی یہ فوج آگے بڑھتی رہی۔ تاآنکہ اس نے ۱۰۹۵ء میں فلسطین پہنچ کر بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔

کئی ہفتوں تک شہر میں خونریزی ہوتی رہی اور مسجد اقصیٰ میں ستر ہزار مسلمان قتل کئے گئے انہیں بڑی تعداد مختلف ممالک کے ریٹائرڈ اور تارک الدنیا علماء مشائخ کی تھی جو اپنی باقی ماندہ زندگی قبلہ اول کے جوار میں بسر کرنے کے لئے یہاں آباد ہو گئے تھے اور مسجد اقصیٰ میں سجدہ ریز رہتے تھے۔

بیت المقدس کی فتح کے بعد یہاں فاتح فوج نے جو کچھ کیا اس کا ذکر فرانس کے ایک مورخ میشو کی زبانی سنیئے۔

۱۔ بیت مقدس کی فتح میں صلیبیوں نے ایسے اندھے تعصب کا ثبوت دیا ہے کہ جس کی مثال گذشتہ تاریخ میں نہیں ملتی۔ وہ عربوں کو زبردستی اونچے

برجوں اور بلند مکانوں سے گرا دیتے تھے۔ آگ میں زندہ جلا دیتے تھے۔ گھروں سے نکال کر جانوروں کی طرح گھسیٹتے تھے۔ مقتول مسلمانوں کی لاشوں پر لے جا کر مسلمانوں کو قتل کرتے تھے وہ کئی ہفتوں تک مسلمانوں کا قتل عام کرتے رہے انہوں نے ستر ہزار مسلمانوں کو تہہ تیغ کیا۔

خود صلیبی مجاہدوں نے بیت المقدس کی فتح کی نوید پوپ اربن ثانی کو ان الفاظ میں سنائی۔

"خدا ہمارے عجز و انکسار سے رام ہو گیا اور ہماری الحاح و زاری کے آٹھویں روز اس نے شہر کو دشمنوں سمیت ہمارے حوالے کر دیا۔ اگر آپ معلوم کرنا چاہیں کہ جو لوگ وہاں موجود تھے ان کے ساتھ ہم نے کیا سلوک کیا تو اس قدر لکھ دینا کافی ہے کہ جب ہمارے سپاہی ہیکل سلیمانی کے معبد (مسجد اقصیٰ) میں داخل ہوئے تو ان کے گھوڑوں کے گھٹنوں تک مسلمانوں کا خون تھا۔"

بیت المقدس کی تاریخ میں یہ دن بڑے ہولناک تھے۔ لیکن پھر تاریخ کا ورق الٹا۔ اس کے اکیانوے برس بعد سلطان صلاح الدین ایوبی اپنی جرار فوجوں کے ساتھ بیت المقدس کے دروازے پر موجود تھا۔ یہ شہر مسلمانوں کو اتنا ہی عزیز تھا جتنا عیسائیوں کو اس لئے سلطان یہاں خونریزی پسند نہ کرتا تھا۔ چنانچہ اس شہر کے قابض عیسائیوں کو پیغام بھیجا کہ شہر میرے حوالے کر دو۔ میں تمہیں اس کے عوض اتنا علاقہ دے دوں گا۔ جتنا تم سنبھال سکو۔ مگر عیسائی نہ مانے۔ اب جنگ کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ کئی دنوں تک مقابلہ ہوتا رہا۔ جب عیسائیوں نے دیکھا کہ ان میں مقابلے کی تاب نہیں رہی تو وہ شہر حوالے کرنے پر تیار ہو گئے۔ شرط صرف یہ تھی کہ جان و مال کی حفاظت کا یقین دلایا جائے۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ بیت المقدس کے تمام عیسائی فی فرد دس دینار فی عورت پانچ دینار اور فی بچہ دو دینار فدیہ ادا کریں گے اور چالیس دن کے اندر جن کا فدیہ ادا نہ ہو گا وہ غلام شمار کیے جائیں گے۔

عیسائیوں نے اس شہر پر قابض ہونے کے بعد جو ظلم و ستم روا رکھا تھا سلطان چاہتا تو اس کا بدلہ لے سکتا تھا۔ لیکن وہ اسلامی جہاد کے قوانین کا پابند تھا۔ اس نے قانون کی چھوٹ سے بھی بڑھ کر فیاضی اور شرافت کا ثبوت دیا۔ شہر پر قبضہ ہوتے ہی فوج نے شہریوں کی حفاظت کا انتظام سنبھال لیا اور کسی عیسائی کو جان و مال کا کوئی نقصان نہ پہنچا

جب صلح کی شرائط پر عمل کا وقت آیا تو سلطان کی عفو درگزر اور فیاضی کا کھل کر مظاہرہ ہوا۔ جو عیسائی غریب

تھے اور زرِ فدیہ کی ادائیگی کی طاقت نہ رکھتے تھے مسلمان امرانے ان کی طرف سے یہ رقم ادا کی۔ صرف ایک امیر مظفر الدین نے ایک ہزار عیسائیوں کو آزاد کرایا چالیس روز تک فدیہ کی ادائیگی کا سلسلہ جاری رہا۔ جیسے جیسے لوگ فدیہ ادا کرتے جاتے تھے، شہر سے باہر چلے جاتے تھے۔ جب فدیہ کی ادائیگی کی معینہ مدت گذر گئی اور شہر میں کئی ہزار لوگ ابھی باقی رہ گئے تو سلطان نے انھیں غلام بنانے کی بجائے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا کہ وہ اس سے لوگوں کو معافی دینے کے لئے کہیں۔ یہ اشارہ پاکر سلطان کے بھائی ملک العادل نے ایک ہزار غلاموں کو آزاد کرایا۔ اس کے بعد سلطان نے اعلان کیا کہ اب میں اپنی طرف سے معافی کا اعلان کرتا ہوں۔ چنانچہ شہر میں منادی کرائی گئی کہ تمام بوڑھے جو فدیہ ادا نہیں کر سکتے آزاد کئے جاتے ہیں۔ انہیں اختیار ہے کہ وہ جہاں چاہیں چلے جائیں۔ چنانچہ طلوعِ آفتاب سے غروب تک لوگ شہر سے باہر جاتے رہے۔ شہر میں کئی معزز خواتین تھیں۔ سلطان نے انھیں اپنے سامان کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ قیدی اور مقتول فوجی افسروں کی بیویوں سے نہایت شریفانہ سلوک کیا گیا۔

جب یہ خواتین اپنی حالت زار بیان کر کے معافی کی طلب گار ہوئیں تو سلطان کی آنکھوں میں آنسو آگئے چنانچہ جن کے شوہر قید تھے انہیں رہا کر دیا گیا جن کے شوہر قتل ہو چکے تھے ان کو ان کے مرتبہ کے مطابق روپیہ دیا اور ان کو تسلی دی۔ وہ سلطان کے رویے سے اتنی متاثر ہوئیں کہ اس کا ذکر بڑی محبت اور عقیدت سے کیا کرتی تھیں۔

اب یہودیوں نے بیت المقدس پر قبضہ کر کے ایک بار پھر مسلمانوں کا خون بہایا ہے۔ لیکن یہ خون رائیگاں نہیں جائے گا۔ اور پھر ایک صلاح الدین ایوبی بیت المقدس کو دشمنانِ اسلام سے آزاد کر کے اس جگہ کے احترام کا ڈنکا بجائے گا۔

"جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں اور اللہ ہی کو اپنا پالنہار اور مربی مانتے ہیں اور پھر اس پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہتے ہیں تو وہ ناکامی کا منہ کبھی نہ دیکھیں گے۔ انھیں نہ تو ماضی کا غم ہوگا اور نہ مستقبل کا خوف، وہ اپنے اعمال کی بدولت جنت میں داخل ہوں گے۔ اور اپنے اچھے کاموں کی جزا پائیں گے۔ یہ بھی اسی کا حکم ہے کہ جس قدر ہو سکے اپنے اندر طاقت پیدا کرو اس حکم کو نہ ماننا وہی نتیجہ پیدا کرے گا جو مسلمانوں کی تباہی کی صورت میں ہر جگہ نظر آسکتا ہے۔"

(پ ۲۶ ۔ ۲ ع)

آباد شاہ پوری

۱۹۴۸ء کا معرکہ بیت المقدس

عربوں کے ساتھ یہودیوں کی کشمکش بیسویں صدی کے دوسرے عشرے ہی میں شروع ہو گئی تھی ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو جب اقوام متحدہ نے تقسیم فلسطین کی قرارداد منظور کی، تو یہ تصادم نقطۂ عروج پر پہنچ گیا۔ اس وقت تک چھ لاکھ یہودی فلسطین میں آباد ہو چکے تھے۔ ان کی ساری بالغ آبادی یورپ اور امریکہ سے سمگل کئے ہوئے ہتھیاروں سے لیس ہو چکی تھی۔ ان کی بستی بستی فوجی کیمپ میں تبدیل ہو گئی تھی جہاں سے عرب آبادیوں پر حملے ہو رہے تھے۔ عرب آبادی چودہ لاکھ سے زائد تھی۔ مفتیٔ اعظم السیّد امین الحسینی نے ایک مختصر سی فوج آزادی تشکیل دے لی تھی۔ جو یہودی دہشت پسندوں کے ساتھ برسرِ آزما تھی۔ پچاس ہزار سے زائد عرب رضا کار میدان میں آنے کے لیے تیار تھے۔ مگر ان کے پاس ہتھیار نہ تھے۔ ایک طرف دنیا بھر کے یہودی فلسطینی صیہونیوں کو ہتھیار فراہم کر رہے تھے۔ دوسری جانب فلسطینی عرب محدود ہتھیاروں کے ساتھ گوریلا جنگ لڑ رہے تھے۔ ان کا مقابلہ یہودیوں ہی سے نہیں، برطانوی انتداب سے بھی تھا جس نے یہودیوں کو فلسطین کی سر زمین میں جگہ دی تھی۔ اور اب ان کی سرپرستی اور پشت پناہی کر رہا تھا۔

عربوں نے اقوام متحدہ کی بے انصافی کے آگے سر جھکانے سے انکار کر دیا۔ تقسیم کا اعلان ہوتے ہی یہودیوں نے عرب قصبات اور دیہات پر جارحانہ حملے اور عرب آبادی کا قتل عام شروع کر دیا۔ نظم و نسق قائم رکھنے کی ذمہ دار برطانوی حکومت تھی، مگر اس نے طے شدہ منصوبے کے مطابق یہودیوں کو کھلی چھٹی دے دی تھی۔ اس نے یہودیوں کو جدید ترین اسلحہ فراہم کیا جن میں سنچورین ٹینک بھی شامل تھے۔ انہیں عرب ملکوں، شہروں اور دیہات پر قبضہ کرنے میں مدد دی اور عرب آبادی کو "محفوظ مقامات" پر پہنچانے کے بہانے علاقوں کے علاقے خالی کروا لیے، چنانچہ ۱۴ مئی کو رات کے بارہ بجے جب شاطر برطانیہ فلسطین کی بساط پر اپنا گھناؤنا کھیل کھیل کر رخصت ہوا، تو یہودی فوجی نقطۂ نظر سے فلسطین کے اہم مقامات پر قبضہ کر چکے تھے۔ دیر یاسین، طبریہ، حیفا، صفد، سلامہ

یزور، بیت وجن، بیسان، بیت المقدس (نیا شہر) صفد اور یافا ایسے شہر عرب آبادی سے بالکل خالی ہو چکے تھے۔

برطانوی حکومت اور یہودیوں کی ملی بھگت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ برطانیہ نے اعلان کیا تھا کہ وہ حیفا کے سوا سارا فلسطین ۱۴ مئی کو خالی کر دے گا۔ البتہ حیفا کی بندرگاہ سے اپنی فوجیں اگست میں ہٹائے گا۔ لیکن اچانک اپنے اعلان کے برعکس اس نے ۱۴ مئی کو حیفا خالی کر دیا۔ ادھر انگریز حیفا سے نکلے، ادھر مسلح یہودیوں نے شہر پر قبضہ کر لیا۔ ۱۶ مئی کو اسلحہ اور گولے بارود سے لدے ہوئے جہاز حیفا کی بندرگاہ میں پہنچ گئے صاف ظاہر تھا کہ یہ سب کچھ پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق عمل میں آیا۔

پہلی جنگِ فلسطین

برطانیہ کے رخصت ہوتے ہی مصر، شام عراق، اردن، لبنان اور سعودی عرب کی فوجیں فلسطین میں داخل ہو گئیں۔ شام اور مصر سے اخوان مجاہدین کئی ہفتے پہلے ہزاروں کی تعداد میں پہنچ چکے تھے۔ اردن کے شاہ عبداللہ کو عرب فوجوں کا کمانڈر انچیف مقرر کیا گیا تھا۔ مگر عرب افواج کی متحدہ کمان آخر وقت تک وجود میں نہ آ سکی۔ عرب فوجوں میں نہ تو اشتراکِ عمل تھا اور نہ تنظیم، نہ ہی وہ کوئی مشترکہ منصوبہ بنا سکے تھے۔ مصری فوجیں تعداد اور اسلحہ کے لحاظ سے دوسری عرب فوجوں سے برتر تھیں مگر میدان میں سب سے زیادہ استقامت اور بہادری کا ثبوت اردن کی فوجوں نے دیا۔ میجر ایڈگر او بیلنس کے الفاظ میں "اردن واحد ملک تھا جس نے اپنے آپ کو دل و جان سے اور مکمل طور پر جنگ کے حوالے کر دیا تھا" اردن کی فوج ساڑھے چار ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ اس کی تربیت بھی برطانوی فوج کی مدد کے لئے (CRACK FORCE) کے طور پر کی گئی تھی۔ آزاد ہونے کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب اسے اپنے بل بوتے پر ایک دشمن سے جنگ لڑنی پڑی۔ اردن کی فوجیں بڑھتی ہوئی رام اللہ تک جا پہنچیں، اس پر قبضہ کرنے کے بعد بیت لحم پر مصری فوجوں سے جا ملیں اور بیت المقدس جانے والی سڑک کو کاٹ دیا۔

بیت المقدس کا معرکہ

اقوام متحدہ نے بیت المقدس کو بین الاقوامی علاقہ قرار دے دیا تھا، مگر ۵ مئی کو یہودیوں کی ایک زبردست فوج نے اسے آ گھیرا، پرانے شہر میں اخوان مجاہدین گزشتہ چار ماہ سے یہودیوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ ادھر جدید شہر میں بھی یہودیوں نے عربوں کے محلے قطمون کو محصور کر رکھا تھا۔ اور اخوان ان سے

نبرد آزما تھے۔ ان کے پاس ہتھیار بہت تھوڑے تھے۔ اور وہ بھی زیادہ تر پرانی قسم کے گولے بارود کا ذخیرہ بھی ناکافی تھا، لیکن اپنے جوشِ ایمان، خلوصِ نیت، شوقِ شہادت اور توکل علی اللہ کی بدولت وہ آخری وقت تک لڑتے رہے۔ نئے شہر کا عرب محلہ قطمون ہاتھ سے نکل گیا، تو انہوں نے پرانے شہر کو یہودیوں کی دستبرد سے محفوظ رکھنے کے لیے جان کی بازی لگادی، القدس مسلمانوں کا مقدس شہر ہی نہ تھا۔ اس وقت مقامی آبادی کے علاوہ گرد و پیش کے ۲۰ ہزار مسلمانوں کی پناہ گاہ بھی تھا۔ چند ہفتے پہلے یہودی شہر دیر یاسین میں قتلِ عام کر چکے تھے۔ القدس کے ہاتھ سے نکل جانے کا مطلب یہ تھا کہ یہاں بھی دیر یاسین کی وحشت ناک داستان دہرائی جائے گی۔ اخوان کے پاس گولے بارود کا ذخیرہ ختم ہو رہا تھا۔ اور یہودیوں کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ آخر انہوں نے اردن کی باقاعدہ فوج سے مدد مانگی۔ عرب لیجن کا کمانڈر جنرل گلب پاشا بیت المقدس کے اندر جنگ میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی اس خواہش کے پیچھے اگرچہ متعدد سیاسی و مذہبی اسباب کارفرما تھے، تاہم اس نے اپنے موقف کے لیے فوجی بنیاد فراہم کر لی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ گلی کوچوں کی جنگ میں فیصلہ کن اہمیت کسی فوج کی ماہیت کو نہیں کمیت کو حاصل ہوتی ہے۔ اردنی فوج کے پاس گولے بارود کا ذخیرہ بہت کم ہے جسے شہر کی ضخیم دیواروں پر ضائع کرنا دانشمندی نہیں۔ مزید برآں عرب لیجن اگر شہر میں الجھ گئی تو رملہ اور لُدھ غیر محفوظ ہو جائیں گے اور یہودی کسی وقت وسیع پیمانے پر حملہ کر دیں گے، چنانچہ اخوان کو مشورہ دیا گیا کہ وہ بیت المقدس خالی کر دیں، مگر انہوں نے اس مشورے کو مسترد کر دیا۔ اخوان دستوں کے قائد نے کہا:

"یہودی ہماری لاشوں پر سے گزر
کر ہی بیت المقدس میں داخل
ہوں گے۔"

اردنی فوج کی طرف سے مایوس ہو کر بیت المقدس کی پوری مسلمان آبادی گھروں سے نکل آئی۔ رات بھر شدید جنگ ہوتی رہی۔ صبح کے وقت یہودی بھاگ نکلے۔ اردنی فوج کے ایک ذمے دار افسر نے فون پر جنگ کی صورت حال دریافت کی، تو اسے بتایا گیا کہ یہودی پسپا ہو چکے ہیں لیکن اب ہمارے پاس گولہ بارود بالکل ختم ہو چکا ہے اگر فوج نے ہماری مدد نہ کی اور یہودیوں نے از سر نو حملہ کر دیا تو ہم شہر کی مدافعت نہیں کر سکیں گے۔ اسی روز پچھلے پہر اردن کی فوج بیت المقدس میں داخل ہو گئی۔ شہر کے یہودیوں نے ہتھیار ڈال دیے اور اخوان کے ثبات، استقلال اور سرفروشیوں کی بدولت بیت المقدس مسلمانوں کے لیے محفوظ ہو گیا۔

عربوں کی پیش قدمی

اسرائیل کی حالت دوسرے محاذوں پر بھی پتلی تھی۔

مصر، صحرائے نقب (جو اقوام متحدہ کی قرارداد کے مطابق اسرائیل کا علاقہ تھا۔) کے بڑے حصے پر قابض ہو چکا تھا۔ اس کی فوجیں بیر شیبہ، حبرون، بیت لحم اور بیت المقدس کے جنوبی نواح میں کھڑی تھیں۔ اس محاذ پر بھی مصر کے اخوان، یہودیوں کی بڑھتی ہوئی قوت کو پسپا کرنے میں پیش پیش رہے تھے۔ شمالی فلسطین میں مفتی اعظم فلسطین کی افواج آزادی پے در پے فتوحات حاصل کر رہی تھیں اور ایک بہت بڑا علاقہ اسرائیلیوں کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ عراقی فوجیں جنین، تلکرم اور نابلس کے مثلث پر قابض تھیں اور مغرب میں سمندر کے قریب یہودیوں کے شہر ہدرہ تک پہنچ گئی تھیں۔ شامی فوجوں نے وادی اردن میں ایک مورچے پر قبضہ کر لیا تھا۔ اردن کی فوجوں نے بیت المقدس کے نئے شہر کی ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ اور ایک لاکھ یہودی محاصرے کی حالت میں تھے۔ پانی اور خوراک سے محروم ہو جانے سے ان کی مزاحمت کی قوت ختم ہو چلی تھی۔

اس صورت حال سے بین الاقوامی صیہونیت سخت مضطرب تھی۔ بیت المقدس کے محاذ پر یہودیوں کی شکست فاش سے امریکی یہودیوں میں زبردست ہنگامہ برپا ہو گیا، چونکہ اردن کی فوجیں ان فتوحات میں پیش پیش تھیں، اس لیے برطانیہ پر خوب لے دے ہوئی۔ آخر امریکہ کے دباؤ پر برطانیہ نے اردن اور دوسرے عرب ملکوں کو اسلحہ کی ترسیل روک دی۔ اینگلو اردن معاہدے کے تحت اردنی فوج کو تربیت دینے کے لیے جو برطانوی افسر مہیا کیے گئے تھے، انہیں واپس بلا لیا۔ سلامتی کونسل میں برطانوی نمائندے سر الیگزنڈر کیڈوگن نے اعلان کیا کہ برطانیہ، اردن کو دی جانے والی اقتصادی امداد پر نظر ثانی کر رہا ہے

۲۲ مئی ۱۹۴۸ء کو سلامتی کونسل نے یروشلم میں اور ۲۹ مئی کو تمام محاذوں پر جنگ بندی کے احکام جاری کر دیئے۔ اسرائیل نے عارضی التوائے جنگ کو فوراً قبول کر لیا۔ عرب تذبذب میں پڑ گئے۔ بظاہر ان کا پلّہ بھاری تھا، لیکن ایک مشترکہ مقصد کے حصول کے لیے جس باہمی اعتماد و اتحاد، مشترکہ حکمت عملی، اشتراک عمل اور پر خلوص جوش و جذبے کی ضرورت ہوتی ہے اس سے وہ محروم تھے۔ سامان جنگ کے لحاظ سے بھی وہ کسی بڑی اور طویل جنگ لڑنے کی استطاعت نہ رکھتے تھے۔ ان کی حربی قوت کا ایک بڑا حصہ ختم ہو چکا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ چند دن اور نکال سکتے تھے۔ رہی سہی کسر بڑی طاقتوں کے دباؤ اور برطانیہ کی طرف سے اسلحہ روک دینے کے اقدام نے پوری کر دی۔ ۲۷ روز کے بعد عرب بھی عارضی التوائے جنگ قبول کرنے پر مجبور ہو گئے۔

عارضی جنگ بندی چار ہفتے رہی۔ اس اثنا میں یہودیوں نے اپنی فوجیں از سر نو منظم کیں اور ان کی کمان کے لیے اعلیٰ انگریز افسروں کی خدمات

مستعار لیں۔ اشتراکی روس کی ہدایت پر چیکو سلاویکیہ نے اپنے اسلحے کے ذخائر اسرائیل کے لیے کھول دیئے ایک ہفتے کے اندر اندر مغربی ملکوں اور امریکہ سے لڑاکا اور بمبار طیارے جنہیں برطانیہ، امریکہ اور جنوبی افریقہ کے غیر یہودی پائلٹ چلا رہے تھے۔ اسرائیل کے خفیہ ہوائی اڈوں پر پہنچ گئے۔ دوسری طرف مغربی ملکوں نے عرب ملکوں کو اسلحہ بھیجنے پر کڑی پابندی عائد کر دی تھی۔

جب التوائے جنگ کا مقصد پورا ہو گیا۔ یہودی نئے سرے سے تازہ دم اور کیل کانٹے سے لیس ہو گئے۔ تو انہوں نے ۸ جولائی کو پھر سے جنگ چھیڑ دی، اب پانسا پلٹ چکا تھا۔ عرب افتراق کا شکار ہو چکے تھے۔ عرب لیجن کے پاس اپنی نفری اور اسلحہ سے زیادہ علاقہ تھا جس کا اسے دفاع کرنا تھا۔ عراق نے نہ صرف رملہ اور لُد کے دفاع میں اردن کا ہاتھ بٹانے سے انکار کر دیا تھا، بلکہ اس نے ایک رات پہلے راس العین سے اپنی فوجیں بھی ہٹا لی تھیں۔

مصری فوجیں اگرچہ بیت المقدس سے صرف چند میل جنوب میں چھاؤنی ڈالے پڑی تھیں مگر انہوں نے بیت المقدس کے دفاع میں شریک ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دفاعی جنگ کا سارا بار اردن پر آن پڑا۔ تین دن کی زبردست جنگ کے بعد اردنی فوجوں کو لُد کا ہوائی اڈہ اور رملہ خالی کرنا پڑا۔ بیت المقدس کی جنگ نہایت شدید تھی۔ فریقین کو بے پناہ جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ آخر اسرائیلی پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے۔ اب وہ شمالی فلسطین کی طرف متوجہ ہوئے اور شہر پر شہر فتح کرتے ہوئے مشرقی گلیلی تک بڑھتے چلے گئے۔ شمال سے فارغ ہو کر انہوں نے اپنی ساری بکتر بند فوج لترون سیکٹر پر لا ڈالی ۵ جولائی کو سلامتی کونسل نے جنگ بند کر دینے کے احکام جاری کیے۔

جنگ بندی کا یہ دور وسطِ اکتوبر تک رہا۔ اس مرتبہ بھی اسرائیلیوں ہی نے اس کی خلاف ورزی کی۔ انہوں نے اچانک جنوبی فلسطین پر حملہ کر دیا اور مصری فوجوں کو بیر شیبہ اور دوسرے اہم مقامات سے نکال دیا۔ اب اسرائیلی غزہ کی طرف بڑھے مصری فوجیں بیت لحم اور حبرون خالی کرنے پر مجبور ہو گئیں۔ شاہ عبداللہ نے ایک بار پھر جرأت مندانہ اقدام کیا اور اچانک حملہ کر کے حبرون بیت لحم سیکٹر پر قبضہ کر لیا۔ سردیوں کے آغاز میں اسرائیلی ہر محاذ پر بڑھ رہے تھے۔ اسرائیلی طیارے قاہرہ اور دمشق پر بمباری کر رہے تھے۔ اخوان مجاہدین نے وسطی اور شمالی فلسطین کے محاذ پر اسرائیل کی فوجوں کو روکنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی، مگر شامی اور مصری فوجوں کی قوت مزاحمت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اور اخوان

کی ساری قربانیاں رائیگاں گئیں۔ اسرائیلی شامی فوجوں کو اپنی سرحد میں دھکیل چکے تھے۔ مصری فوجوں کے قبضے میں صرف "غزہ" کی پٹی رہ گئی تھی۔ صحرائے نقب اور بیر شیبہ میں ڈھائی ہزار مصری فوج محصور ہو گئی تھی۔ عراق نے داخلی مالی بحران کا شکار ہو جانے سے اپنی فوجیں فلسطین سے نکال لی تھیں۔ مصر پہلا ملک تھا جس نے ۲۴ فروری ۱۹۴۹ء کو روڈس کے جزیرے میں اسرائیل کے ساتھ ہنگامی صلح کے معاہدے پر دستخط کیے۔ اگلے پانچ ماہ میں سعودی عرب، یمن اور عراق کے سوا باقی سب عرب ملکوں نے اسرائیل کے ساتھ الگ الگ معاہدہ کیا۔ ہر معاہدے میں ایک دفعہ یہ رکھی گئی تھی کہ اسرائیل اور متعلقہ عرب ملکوں کے درمیان موجودہ حد بندی مستقل نہیں عارضی ہے۔

جنگ کے نتائج

فلسطین میں پہلی جنگ ختم ہو گئی۔ عربوں کے ہاتھ سے آدھے سے زیادہ وہ علاقہ نکل گیا جو اقوام متحدہ کی قرارداد کے مطابق عربوں کو ملنا چاہیے تھا۔ یہ سارے کا سارا علاقہ نہایت زرخیز اور سرسبز و شاداب تھا۔ نئی سرحد پر واقع بے شمار دیہات اپنی لہلہاتی زمینوں، پھل دار باغوں اور نارنگی کے کنجوں سے محروم ہو گئے۔ دس لاکھ سے زائد فلسطینی عرب اردن اور دوسرے عرب ملکوں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیئے گئے۔ عربوں اور یہودیوں کی اس جنگ میں ایک حقیقت ابھر کر سامنے آئی۔ عیسائی عرب جنہوں نے عرب قومیت کا فتنہ پے در پے مسلمانوں میں بویا تھا، اس جنگ میں عربوں کا ساتھ دینے کی بجائے یا تو تماشائی بنے رہے یا یہودیوں کی در پردہ امداد کرتے رہے۔ یہودی جس عرب بستی میں داخل ہوئے عیسائی عربوں نے انھیں خوش آمدید کہی، چنانچہ جہاں یہودیوں نے لاکھوں مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکال پھینکا، وہاں ایک عیسائی عرب خاندان بھی اس اکھاڑ پچھاڑ سے متاثر نہ ہوا۔ دروزیوں نے ... ... وہی دروزی جو شام کی موجودہ برسراقتدار بعث پارٹی کا ایک اہم عنصر ہیں ... ... اس جنگ میں علانیہ یہودیوں کا ساتھ دیا۔ اور ان کی طرف سے عربوں کے خلاف لڑے۔ عربوں نے اس جنگ کا آغاز تذبذب، تشکک اور بے اعتمادی کی فضا میں کیا تھا اب ان میں پہلے سے زیادہ انتشار پیدا ہو چکا تھا وہ شکست کی ذمے داری مل کر بھی کرنے کے بجائے ایک دوسرے کو مطعون کر رہے تھے۔

جان دے سکتے ہیں حق پر اہل دانش مگر
قوت باطل کے آگے سر جھکا سکتے نہیں
فرض ہے قبلۂ اول کی حفاظت ہم پر،
آبروئے ارض مقدس کی بچائیں گے ضرور

غالب رسول دانش

انجم ہُوسایہ سے

بیت المقدس پر کیا گزری

اس روز جب ارضِ مقدس کے افق پر سفیدۂ سحر نمودار ہوا۔ پیغمبروں کی یہ سرزمین پارے کی طرح لرز رہی تھی۔ لوگوں نے ساری رات جاگ کر تیاری کی تھی۔ مشرق اردن اور عراق کی فوجیں دیوارِ گریہ کے اس پار یہودی علاقہ میں دشمن پر آگ کی بارش کر رہی تھیں۔ توپوں کی گولہ باری اور جہازوں کی بمباری سے در و دیوار لرز رہے تھے۔ گھن گرج اتنی تھی کہ کہ دل دہل جاتے تھے۔ ننھے بچے ماؤں کے سینے سے چمٹے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھ رہے تھے کہ ہماری گیتی پر کیا بیت رہی ہے۔ بوڑھے پریشان آسمان کی جانب آنکھیں اٹھائے اپنے دونوں ہاتھوں کو پھیلائے آنسوؤں کی بھیک مانگ رہے تھے۔ اور نوجوان گلی گلی کے موڑ پر سینہ تانے بندوقیں تھامے یوں جمے کھڑے تھے جیسے فولادی دیوار ہوں۔ پو پھٹی تو مسجد اقصیٰ کے مشرقی کنارہ پر شفق کی سرخی اور گہری ہو گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے بیت المقدس کے پچاس ہزار مردوں نے اپنے خون سے آسمان کو لالہ زار بنا دیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد مسجد عمر سے فجر کی اذان گونجی۔ شہر کے لوگوں نے اس اذان کو پہلے بھی کئی بار سنا تھا۔ لیکن آج تو یوں لگتا تھا۔ جیسے یہ اذان نہیں بلکہ آخری انتباہ ہے جو محرابِ عمر سے عرب مسلمانوں کو کیا جا رہا ہے۔ آج تو مؤذن کی آواز میں بے پناہ درد، سوز تھا۔ اس کی آواز کبھی ابھرتی اور کبھی دھیمی ہوتی۔

یکایک لوگوں نے محسوس کیا کہ مؤذن "حی الصلوٰۃ" کہتے کہتے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ہے۔ لاؤڈ اسپیکر پر اس کی بھرائی ہوئی سسکیاں اور دبی چیخیں بیت المقدس کے شہریوں کے دلوں میں تیر کی طرح اتر گئیں۔

پھر دھیرے دھیرے سورج کی روشنی پھیلنے لگی۔

سورج نے مشرق سے ابھر کر سر باہر نکالا اور ہزار برس کے بعد اس نے پہلی بار دیکھا کہ فلسطین کے باسیوں پر ایسی قیامت ٹوٹ پڑی ہے جو پہلے چشمِ فلک نے نہیں دیکھی تھی۔ اس وقت یہودی فوجوں نے عقب سے حملہ کیا اور وہ دونوں طرف سے اس مقدس شہر کو نرغہ میں لینے کے لئے آگے بڑھ رہی تھیں یہ ۷ جون کی صبح کا ذکر ہے، صرف دو گھنٹہ کے بعد مسلمانوں کا یہ قبلۂ اول مکمل طور پر یہودیوں کے

رحم وکرم پر تھا۔

ان دو گھنٹوں میں فلسطین پر بیتی ہوئی یہ انتہائی دردناک داستان ہے، ظلم و جور کے وہ کون سے پہاڑ ہیں جو ان عربوں پر نہیں ٹوٹے۔ اسرائیلی فوجیں جب شہر کے اندر داخل ہوئیں تو انھیں یہ محسوس ہوا کہ ہر دروازہ پر ان کا دشمن سینہ تانے کھڑا ہے کسی نے بندوق سے مقابلہ کیا اور کوئی ننگی تلوار لے کر ٹوٹ پڑا۔ بعض نے ترکاری کاٹنے والی چھریاں اور تربوز تراشنے والے چاقو ہی سٹین گنوں سے مسلح اسرائیلی فوجیوں کے پیٹ میں گھونپ دیئے۔ آج فرق اتنا تھا کہ اسٹالن گراڈ کے گلی کوچوں میں لوگوں نے بے جگری سے مقابلہ کیا اور اپنے شہر کو دستبرد سے بچالیا تھا۔ لیکن بیت المقدس کے مسلمانوں نے روسیوں سے بھی زیادہ بے جگری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے وطن پر جان قربان کر دی تھی۔ وہ کونسی گلی تھی جو نوجوان عربوں کی لاشوں سے اٹ نہ گئی ہو۔ اور وہ کون سا دروازہ تھا جس کی دلہیز پر خون میں لت پت اردنی مقابلہ کرتے ہوئے ڈھیر نہ ہو گئے تھے۔ خود مسجد اقصیٰ کے صدر دروازہ پر اپنی مقدس عبادت گاہ کے لیے جان کی بازی لگانے والے مسلمانوں کی لاشوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

ہیکل سلیمان کا خواب دیکھنے والے یہودی جب مسجد اقصیٰ کے اندر داخل ہوئے تو مسجد کا موذن عزیز خان کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا اس وقت اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ وہ شیر کی طرح بپھرا اور چیتے کی طرح تنہا ہی دشمن پر ٹوٹ پڑا۔ اس کے ہاتھ میں صرف ایک آہنی سلاخ تھی۔ جس کی لمبائی چھ فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ یہودی سپاہیوں نے ایک قہقہہ لگایا۔ اور رائفل کی سنگین اس کے سینے کے پار کر دی مسجد عمر سے اذان بلند کرنے والی آواز آج ہمیشہ کے لیے بند کر دی۔ نماز ظہر کے وقت تیرہ سو سال بعد پہلی مرتبہ یہاں اذان کی آواز بلند نہ ہوئی۔ ایک یہودی گلی کوچوں میں بوڑھوں عورتوں اور بچوں پر یوں پل پڑے جیسے وہ صدیوں سے مسلمانوں کے خون کے پیاسے تھے۔ مقابلہ کرنے والے نوجوان یکے بعد دیگرے جام شہادت نوش کر چکے تھے۔ دیوار گریہ کے اس پار شارع الحم پر طارق الاحد کا خوبصورت بنگلہ تھا۔ وہ شہر کے رئیسوں میں شمار ہوتے تھے۔ انہوں نے یہودیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے خود جام شہادت نوش کیا اور اسرائیلی سپاہی بنگلہ میں داخل ہو گئے۔ ان کی بیگم نے پستول نکال لیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ کوئی گولی نکل کر کسی یہودی کو ٹھنڈا کرتی خود ان کے سینے میں کئی گولیاں پیوست ہو گئیں۔ یہودی سپاہی نے پے در پے گولیاں چلا کر ان کے جسم کو چھلنی کر دیا۔ اس وقت ان کے تین نو عمر بچے ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے کونے میں کھڑے تھے۔ ان میں سے بڑے کی عمر گیارہ سال تھی اور چھوٹے

کی تین سال ننھے سہیل کو صرف اتنا معلوم تھا کہ جب ماں غضب ناک ہوتی تھیں اور اسے ڈانٹنے کے لیے ہاتھ اٹھاتی تو وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لیا کرتا تھا۔ اور اس وقت امی اسے لپک کر اٹھا لیتیں اور سینے سے لگا لیا کرتی تھیں۔ اس نے یہودیوں کو غضبناک دیکھا تو غیر شعوری طور پر اپنے دونوں ننھے ننھے ہاتھ جوڑ دیئے لیکن اسے امی کے پیار کی جگہ پہلے تو ایک زناٹے دار تھپڑ ملا اور پھر ایک یہودی سپاہی نے اس کے پیٹ میں سنگین چبھو کر اٹھا لیا اور یہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا "سانپ کے بچے کو بھی زندہ چھوڑنا یہودیوں سے دشمنی کے مترادف ہے" یہ واقعہ ننھے سہیل کے گیارہ سالہ بڑے بھائی نے سنایا وہ منجھلے بھائی کو لے کر مہاجرین کے کیمپ میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

فتح کے نشہ میں بدمست یہودی سپاہی ایک ایسے مکان میں داخل ہوئے جس کی بالکونی سے چند منٹ پہلے ایک عرب خاتون نے ان پر اینٹوں کی بارش کی تھی۔ اس وقت وہ ہوائی اڈہ پر متعین احمد الرضا کے جسم کو سنگینوں سے کچوکے دے رہے تھے اور وہ تڑپ رہا تھا۔ یہودی یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ خون میں لت پت پڑی تھی۔ اس نے خود ہی اپنی آبرو کی خاطر اپنے حلق پر چھری پھیر لی تھی۔ احمد الرضا کی بوڑھی ماں نے مہاجرین کے کیمپ میں الجمہوریہ کے نامہ نگار کو یہ واقعہ سناتے ہوئے بتایا کہ میرے بیٹے کی شادی ہوئے ابھی (۲۸) دن ہوئے تھے۔ میری بہو آبرو پر کھیل گئی جانے والی ان گنتی کی چند لڑکیوں میں سے تھی جنھوں نے ماسٹر آف آرٹس کا امتحان پاس کیا تھا۔ یہودیوں نے چلتے وقت رضا کی بوڑھی ماں کو گھسیٹا اور باہر سڑک پر پھینک دیا اور پھر اسے روندتے ہوئے گزر گئے۔

القدس کے ہوائی اڈہ پر قبضہ کرتے وقت یہودیوں نے اندھا دھند گولیاں برسائیں اور جو بھی نظر پڑا اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ القدس کے منتظم اعلیٰ کو برہنہ کر دیا اور حکم دیا کہ یہودیوں کے سامنے ٹوسٹ ناچ کرے اور بیت المقدس کی فتح کی خوشی میں وہ ان کا ساتھ دے۔ لیکن غیرت کے پتلے نے یہودیوں کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ اس وقت اس نے شرم و حیا کے باعث اپنے ہاتھوں سے سر ڈھانک رکھا تھا۔ ایک یہودی نے ان کے ہاتھوں میں سنگین چبھو دی اور وہ درد سے بلبلا اٹھے۔

منتظم اعلیٰ حسین النا کا تیرہ سالہ صاحبزادہ دور سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا اس نے باپ کی جان خطرہ میں دیکھی تو تڑپ اٹھا۔ اور خالی ہاتھوں ہی یہودیوں پر ٹوٹ پڑا۔ اور پھر ایک یہودی کو اپنی گرفت میں لے لیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی لاش زمین پر تڑپنے لگی کیونکہ دوسرے سپاہی نے سنگین سے اس کا پیٹ چاک کر دیا تھا۔ باپ یہ دردناک منظر دیکھ کر گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔ ماں بمباری کے ڈر سے غسل خانے میں چھپ کر اس کو دیکھ رہی تھی بے تاب ہو گئی

اور تڑپ کر باہر نکل آئی اور چیختی ہوئی دوڑ رہی تھی۔ "میں یہودیوں کا خون پیوں گی۔ اپنے لال کا بدلہ چکاؤں گی۔ اپنے سرتاج کا انتقام لوں گی" وہ طوفان کی مانند تیز دوڑتی آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا پستول تھا جو ایک دن حفاظت کے لیے حسین نے اسے خرید کر دیا تھا۔ ہاتھ میں پستول دیکھ کر یہودیوں نے اپنی رائفلوں کا رخ اس کی طرف پھیر دیا۔ اور وہ گولی کا نشانہ بن کر شہید ہو گئی۔ یہودی لاش کی طرف لپکے تو حسین المنا کو بھاگنے کا موقع مل گیا۔ اس نے راستے میں سے گری ہوئی ایک چادر اٹھائی اور اپنے جسم پر لپیٹے بچتا بچاتا دریائے اردن پار کر گیا۔

حسین المنا نے الجمہوریہ کے نامہ نگار کو بتایا کہ جب وہ چھپتا چھپاتا جان بچانے کے لئے پناہ گاہ کی تلاش میں تھا، تو حسین ہسپتال کے پاس سے گزرا یہودیوں نے ہسپتال میں چن چن کر نوجوان مریضوں کو کھڑا کیا ہوا تھا۔ بعض دیر تک کھڑا رہنے کے باعث بیٹھ گئے تھے اور بعض لیٹے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد تڑاخ تڑاخ کی آوازیں بلند ہوئیں میں نے پلٹ کر دیکھا تین یہودی سپاہی ان بیمار اردنیوں پر مشین گنوں سے بوچھاڑ کر رہے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق ان مریضوں کی تعداد (۵۰) سے زیادہ تھی۔ جو سب کے سب جاں بحق ہو گئے۔ بربریت کا اس سے بڑا ثبوت دنیا کے کسی خطہ میں کبھی نہیں ملے گا۔

بقیہ تاریخ کا فیصلہ

اسرائیل نے تمام اقدار اور حقوق کو پامال کیا ہے۔ اور اس نے کسی بھی انسانی اور مذہبی تقدس کو ملحوظ نہیں رکھا، اگر عالمی طاقتوں نے اسرائیل کو عربوں کے علاقے ہتھیا لینے اور انھیں اپنی ریاست میں مدغم کر لینے اور اصل باشندوں کو ملک بدر کر دینے کی کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔ تو اس کے بعد یہ بعید از امکان نہیں کہ ہر طاقتور حکومت اپنے کمزور ہمسائے کے علاقوں پر قابض ہو جائے۔ اور وہاں کے اصلی باشندوں کو نکال دے۔ اس لیے مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ ان حقائق سے دنیا کو آگاہ کرنے کے لیے اپنی پوری کوششیں صرف کر دیں۔

نفرت بھی ہے جن کی چنگیزی تہذیب کے دعویدار بھی ہیں
یہ کاسہ گدایانِ یورپ چالاک بھی ہیں عیار بھی ہیں
وحشت کا عجب انداز ہے یہ خنجر ہے عرب کے سینوں پر
بچوں کو اٹھائے پھرتے ہیں اتراتے ہوئے سنگینوں پر
تاریخ کے ارزش پہلو حالات نے پھر دہرائے ہیں
پھر دار و رسن کے متوالے میدانِ عمل تک آئے ہیں

(رشید الوحیدی)

★

اختر صدیقی

انقلاب اے انقلاب

ہے دیارِ قدس ویراں شہرِ خوباں مضمحل
مسجدوں کی خستہ حالی پر منارے ہیں خجل
شدتِ غم سے دھڑکتا ہے ہر ایک ذرے کا دل
نیل اور اردن کی لہریں کھا رہی ہیں پیچ و تاب
انقلاب اے ساکنانِ شرقِ وسطیٰ انقلاب

تم ابوبکرؓ و عمرؓ کے دیدۂ بیدار ہو
نیزۂ طارق ہو تم خالدؓ کی تم تلوار ہو
حد تو یہ ہے کہ دودمانِ احمدؐ مختار ہو
اپنی ہستی سے خودی سے اپنی کب تک اجتناب
انقلاب اے ساکنانِ شرقِ وسطیٰ انقلاب

ہاں مگر غفلت نہ ہو کردار کی تطہیر سے
پھر سبق لو آیتِ "الروم" کی تفسیر سے
مستحقِ تقدیر کے بن جاؤ پھر تدبیر سے
رہنمائی کے لئے موجود ہے ام الکتاب
انقلاب اے ساکنانِ شرقِ وسطیٰ انقلاب

دشمنوں پر ٹوٹ پڑنے کے لیے جھپٹو بڑھو
تند خوئی کا سبق دیتے ہوئے طوفان کو
ان گرجتے بادلوں سے بجلیوں کو چھین لو

چھین لو نارِ جہنم سے شرارِ التہاب
انقلاب اے ساکنانِ شرقِ وسطیٰ انقلاب

اپنے ہوش و جوش کا دُنیا کو قائل پھر کرو
اپنی تدبیروں سے حل اپنے مسائل پھر کرو
عزم بے پایاں سے تسخیرِ وسائل پھر کرو
پھر بڑھو ہاتھوں میں لے کر آفتاب و ماہتاب
انقلاب اے ساکنانِ شرقِ وسطیٰ انقلاب

کیا غضب ہے سر زمینِ قدس کیوں پامال ہو
کیا قیامت ہے مسلّط ہم پہ کیوں دجال ہے
دیدۂ عبرت سے دیکھو تو ذرا کیا حال ہے
چاہتی ہے ارضِ پاکِ فلسطین تم سے جواب
انقلاب اے ساکنانِ شرقِ وسطیٰ انقلاب

یہ نہیں ہے وقت آپس میں جھگڑنے کے لئے
تم امینِ صدق ہو باطل سے لڑنے کے لئے
اٹھ کھڑے ہو دشمنوں پر ٹوٹ پڑنے کے لئے
نیزہ و شمشیر اٹھاؤ توڑ دو چنگ و رباب
انقلاب اے ساکنانِ شرقِ وسطیٰ انقلاب

اے مسلمانانِ عالم ایک نکتہ عرض ہے
راہِ حق میں سر فروشی زندگی پر قرض ہے
بازیابی قبلۂ اوّل کی تم پر فرض ہے
یا پیو جامِ شہادت یا بنو تم فتح یاب
انقلاب اے ساکنانِ شرقِ وسطیٰ انقلاب

علامہ علال الفاسی
امیر حزب استقلال (مراکش)

تاریخ کا فیصلہ

تاریخ کا فیصلہ پورا ہو چکا ہے، قرونِ وسطیٰ کی صلیبی جنگوں کے بعد مسلمانوں کو تاریخ کا یہ سب سے بڑا حادثہ پیش آیا۔ یہودی عرب علاقوں کے ساتھ بیت المقدس پر بھی قابض ہو چکے ہیں۔ بلکہ عربوں اور دوسری حکومتوں نے اسرائیل کو بیت المقدس پر ظالمانہ قبضے سے منع کرنے کے سلسلے میں جتنی کوششیں کی ہیں ان کے علی الرغم اسرائیل نے بیت المقدس پر اپنے مکمل اختیار کا فیصلہ کر دیا ہے۔

صیہونی ریاست نے پوری دنیا کے مسلمانوں اور عیسائیوں کو چیلنج کیا ہے، اور علانیہ بیت المقدس پر قبضہ کر کے اسے "اسرائیل میں مدغم" کر لیا ہے اور اب وہاں کے مقاماتِ مقدسہ پر اپنی مملکت کا اعلان کر دیا ہے اور دعویٰ کر لیا ہے کہ اسے تینوں مذاہب کے مقدس مقامات کی تولیت و حفاظت کا حق پہنچتا ہے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ ان اسباب کو بیان کروں، جو اس المیہ کی تہ میں کارفرما ہیں، اس وقت میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارا فرض پکار رہا ہے کہ ہم ان اسباب کو نظر انداز کر کے نتیجہ و اسباب کی طرف متوجہ ہوں۔ کیونکہ یہ نتیجہ اس درجہ خطرناک صورت حال اختیار کر چکا ہے کہ اب ہمیں ہر بات فراموش کر کے صرف بیت المقدس کی آزادی کے لئے فوری اور ضروری اقدام کرنا چاہیئے۔

بیت المقدس پر یہودیوں کا قبضہ اور اسرائیل میں اس کا انضمام تمام مسلمانوں اور عیسائیوں پر ضرب ہے اور عیسائیوں، مسلمانوں کے مشترکہ مقدسہ مقامات کی انتہائی توہین ہے، اسلام کے تین مقدس مقامات ہیں ان میں ایک بیت المقدس ہے مسلمان اسے اپنا تیسرا حرم سمجھتے ہیں۔ مسجد اقصےٰ ان تین مساجد میں سے ایک ہے، جو مسلمانوں کے دلوں کے اندر اسلام کے وجود و بقا کی ضامن ہیں۔

اسلام کسی طرح بھی کسی غیر مسلم حکومت کو خواہ وہ یہودی ہو یا کوئی اور یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ مساجد پر یا عبادت گاہوں پر اپنی ولایت قائم کرے کجا بیت المقدس، جس کو یہ شرف حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس شہر سے اپنے نبی کو آسمان پر بلایا۔ معراج کی رات اسی شہر میں پیغمبر اعظم نے

انبیاء اور رسولوں کی امامت فرمائی، اور آج اس پاکیزہ جگہ کو جہاں نبی صلعم نے امامت فرمائی اور انبیاء کرام نے آپ کی اقتدا میں نماز ادا فرمائی صیہونیوں کے پاؤں روند رہے ہیں۔ ان کے لہو ولعب کا اکھاڑا بن چکی ہے۔ اور وہ ان عربوں کی لاشوں پر اپنے دلوں کی آتش غیظ بجھا رہے ہیں، جو اس مقدس شہر کی مدافعت میں کام آئے۔

بیت المقدس کو غصب کرنا دراصل عربوں کے اس حق کی پامالی ہے جو انھیں اس شہر کی حفاظت کے لئے مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں سب کی طرف سے حاصل تھا، چنانچہ ہم تمام مسلمان سربراہوں مسلمان زعما، اور رہنماؤں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اپنے سیاسی فرض کو ادا کریں۔ اور بوقت ضرورت بیت المقدس کی بحالی اور مقبوضہ عرب علاقوں سے یہودیوں کو نکالنے کے لئے فوجی کارروائی بھی کریں۔ تاکہ یہ مقدس علاقے یہودیوں کی ناپاک حرکتوں سے پاک ہوں، اور وہ غنڈہ گردی ختم ہو، جو مقدس سرزمین پر انہوں نے مچا رکھی ہے۔ یہ صریح دھاندلی ہے کہ اسرائیل کو کھلم کھلا جارحانہ کارروائیوں کی اجازت دی جائے۔ یہ ساری مسلم دنیا پر ظلم عظیم ہے کہ عربوں سے دن دہاڑے ان کی زمین چھین لی جائے۔

بیت المقدس اور فلسطین مسلمانوں کے علاقے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس زمین کو تینوں مذاہب کے لئے مقدس بنایا ہے۔ لیکن یہ حقیقت اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ ان مذاہب کے پیرو خواہ وہ کیسے ہی ہوں۔ عربوں کے تاریخی وطن پر اپنا قبضہ قائم کریں۔ یہ سرزمین مسلمانوں کے لئے مکہ اور مدینہ ہی کی طرح مقدس ہے۔ اور وہ کسی حال میں بھی یہودی ملحدوں کا اس پر قبضہ برداشت نہیں کریں گے۔ مسلمان تاریخی حیثیت سے بھی اور سب مذاہب کے اتفاق سے بھی اس زمین میں صرف مذہب اسلام کی حفاظت ہی کے نہیں بلکہ مسیحی مذہب اور یہودی مذہب کی حفاظت کے بھی حقدار چلے آ رہے ہیں۔

اسرائیل نے جن علاقوں پر قبضہ کیا ہے انہیں وہ ہر طریقہ سے برباد کر رہا ہے۔ جن کے استعمال کی ممانعت پر تمام دنیا کی طاقتیں متفق ہیں، اسرائیل کی یہ کارروائیاں نہ صرف مسلمانوں اور عربوں کے خلاف ہیں بلکہ ان یہودیوں کے بھی خلاف ہیں جو مسلمان ممالک سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئے ہیں، اور اصل وسطی یورپ اور امریکہ کے یہودی جن کے ہاتھ میں اس وقت اسرائیل کی باگ ڈور ہے۔ وہی اللہ کی زمین میں توسیع پسندانہ عزائم لئے ہوئے ہیں، وہی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ مسلمان، عیسائی اور یہود کی فرقوں کی حفاظت کریں گے۔ بقیہ ۱۸۹ پر

محمد سعید

سوتے پڑے ہیں مسجد اقصیٰ کے بام و در

آج صرف پاکستان ہی میں نہیں پورے عالم اسلام میں جتنا سوگ منایا جائے کم ہے ۔ پوری تیرہ صدیوں بعد وہ شہر مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا جو توحید پرستوں کا قبلہ اول تھا ، اسی شہر کی مسجد اقصیٰ سے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کا آغاز ہوا تھا ۔

گذشتہ تیرہ صدیوں میں بیت المقدس کی حرمت بحال رکھنے کے لئے مسلمانوں نے جتنا خون بہایا اگر وہ جمع ہو سکتا تو ایک بحر ذخار ٹھاٹھیں مارنے لگتا ۔ لیکن اسرائیلی توپوں اور طیاروں نے پانچ روز میں اتنی آگ برسائی کہ وادیٔ کنعان کا ذرہ ذرہ جل اٹھا ۔ تیرہ سو سال کے بعد ۹ جون کو پہلا جمعہ تھا کہ مسجد عمرؓ کے میناروں سے تکبیر و اذان کی آواز بلند نہ ہوئی اور اس کے بجائے شہر میں گھری ہوئی مسلمان عورتوں اور یتیم بچوں کی فریادیں گونج اٹھیں ۔ مسجد عمرؓ کے مینار کب تک خاموش رہیں گے ، اور اسرائیل کی قید میں زندگی گذارنے والی عورتوں اور بچوں کی فریادیں امراکش سے ملایا کی فضاؤں میں کب تک بھٹکتی پھرتی رہیں گی ؟ سر دست دنیا کے ستر کروڑ مسلمانوں کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ۔ لیکن اب ملت اسلامیہ کی تاریخ میں ایک ایسا موڑ آگیا ہے جہاں یہ فیصلہ کرنا ہی پڑے گا کہ اگر مسلمانوں کو ایک قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا ہے تو وہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس سوال کا جواب تلاش کریں ۔

قبلہ اوّل کے متعلق اسرائیل کے ارادے بے نقاب ہو چکے ہیں ۔ ابھی بیت المقدس سے دھواں اور شعلے اُٹھ ہی رہے تھے کہ اسرائیلیوں اور عیسائیوں نے مل کر بلدیاتی کمیٹی قائم کی جس نے شہر کی تعمیر نو کے اس منصوبے پر کام شروع کر دیا ۔ جو پیرس سے شائع ہونے والے ممتاز امریکی اخبار ہیرلڈ ٹریبون کے مطابق کئی مہینوں سے زیر غور تھا ۔ اور صرف اسرائیلی حصے پر نہیں بلکہ پورے بیت المقدس پر محیط ہے ۔

شہر کے عیسائی اور یہودی باشندوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا ہے کہ قدیم اسرائیلی معبدوں اور تاریخی مقامات کی مرمت کے لئے سولہ کروڑ روپے فوراً جمع کئے جائیں ۔ اور اس فیصلے کے بعد جمع ہونے والے چندے کی رفتار سے ظاہر ہوتا

ہے کہ یہ رقم ایک آدھ روز میں ہی جمع ہو جائے گی۔ امیر لڈٹر یبیون کے مطابق اسرائیل نے ابھی جنگ چھیڑی ہی تھی کہ فرانس کے نامور یہودی بینکر بیرن راتھس شیلڈ نے ایک کروڑ روپیہ بطور چندہ بھیج دیا۔ اب ایک طرف بلدیاتی کمیٹی نے اپنا کام شروع کر دیا ہے تو دوسری طرف بیت المقدس کا مستقبل متعین کرنے کے لئے فوجی حکومت قائم کر دی گئی۔ یہ حکومت شہر کے اردنی حصے سے دریائے اردن کے مغربی کنارے تک اس پورے علاقے کا نظم و نسق سنبھالے گی جس پر اسرائیل نے قبضہ کیا ہے۔ بریگیڈیر جنرل قائم برزوگ کو اس علاقے کا فوجی گورنر مقرر کیا گیا۔

بیت المقدس میں فوجی حکومت کے قیام کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اب یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان قبلۂ اول کے مستقبل کا فیصلہ قلم سے نہیں بلکہ تلوار کی نوک سے لکھا جائے گا۔ اور یہ ایسا فرض ہے جسے توحید پرست تیرہ سو سال سے ادا کرتے چلے آ رہے ہیں۔ کیوں کہ یہ وہی بیت المقدس ہے جس کی چابیاں رومیوں کے ہاتھ سے لینے کے لئے امیر المومنین حضرت عمرؓ مدینے سے چل کر آئے تھے۔ ان چابیوں کو مسلمانوں کے ہاتھ سے دوبارہ چھیننے کے لئے مغرب نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ مغرب سے دور تک پھیلے ہوئے آہن پوش عیسائیوں کے سیلاب ہر سال تقریباً تباہی مچاتے ہوئے آئے لیکن ناکام لوٹ گئے۔

انگلستان کے بادشاہ شیر دل رچرڈ نے بھی ایک صلیبی جنگ میں شرکت کا شرف حاصل کیا تھا عکہ میں کروفر سے اترنے کے بعد اس نے غازی صلاح الدین ایوبی کے اعزاز میں دعوت دی مقصد صرف یہ تھا کہ بیت المقدس کے محافظ کو یورپ کی مادی قوت سے مرعوب کیا جائے۔ فرانس کا بزرگ بوہیمنڈ اور آسٹریا ہنگری کا حکمران ایک طرف بیٹھے تھے۔ اور وینس، پرتگال اور جینوا کے نامور بحری کپتان دوسری طرف۔ بیت المقدس کے میدان میں اتنا بڑا صلیبی لشکر پہلے کبھی جمع نہیں ہوا تھا۔ رچرڈ نے بڑے فخر سے کہا تھا۔

"ہم سب نے صلیب اٹھا کر قسم کھائی ہے کہ اب کی مرتبہ اسے گنبد صخرا پر گاڑ کر ہی لوٹیں گے۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیے اتنے بادشاہوں کے مقابلے پر آپ اکیلے ہیں۔"

غازی صلاح الدین نے رچرڈ کو فوراً جواب دیا۔ "میرا اللہ میرے ساتھ ہے۔"

بے شک اللہ ان کے ساتھ تھا۔ انھوں نے اسے خلیج طبریہ کے کنارے مارا اور بوہیمنڈ کو عسقلان میں اور یورپ کے نامور بحری کپتانوں کو قیصریہ میں ایسا سبق دیا کہ فلسطین کا کبھی رخ نہ کیا۔ اور شیر دل

رچرڈ کو عین اس وقت للکارا جب وہ بیت المقدس میں ہیکل سلیمانؑ کے نیچے بیٹھا فتح کا جشن منا رہا تھا۔

بیت المقدس کے دروازے کھلے پڑے تھے۔ یہاں مسجد اقصیٰ کا کوئی محافظ موجود نہ تھا۔ نہ مسجد عمرؓ کا جب صلیب بردار سورما ساٹھ ہزار مسلمان عورتوں اور بچوں بوڑھوں کو تہ تیغ کر کے انتقام کی پیاس بجھا رہے تھے۔ رچرڈ دور کھڑا سوچ رہا تھا "... وہ ایوبی کہاں ہے؟ جس کی شجاعت، فراست اور شرافت کے افسانے بچے بچے کی زبان پر تھے۔"

اسی لمحے غازی صلاح الدین ایوبی یوں اچانک طوفان کی طرح اس کے لشکر پر ٹوٹے کہ کسی کو سنبھلنے کی اور صفیں درست کرنے کی بھی مہلت نہ ملی۔ رچرڈ نے یورپ کی متحدہ سپاہ کی مدد سے سلطان صلاح الدین کے لئے جو آہنی جال بچھایا وہ مکڑی کا تانا بانا ثابت ہوا۔ اور رچرڈ کو اس وقت پتہ چلا جب اس کے تمام اتحادی پیٹھ دکھا کر جا چکے تھے۔ اس کے دل پر سلطان کی ایسی دھاک بیٹھی کہ فوراً صلح کی درخواست کی اور اپنی بہن میری کو سلطان کے بھائی الملک العادل کے عقد میں دے کر چلا گیا

لیکن پورے ایک ہزار سال بعد تاریخ نے پلٹا کھایا یہ اس زمانے کی بات ہے۔ جب ترکی یورپ کا مرد بیمار مشہور تھا۔ عظیم عثمانی سلطنت کو برطانیہ، فرانس اور اٹلی آپس میں بانٹ رہے تھے۔ اور جرمنی کا قیصر ولیم ایک طرف کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اس نے انگریز کو زچ کرنے کے لئے یہ منصوبہ بنایا کہ پسماندہ ترک فوج کو اسلحہ سے لیس کیا جائے پھر جب بیروت سے عدن تک مشین گنوں اور دور مار توپوں کی چوکیاں قائم ہو جائیں گی۔ تو سکندریہ سے سڈنی تک پھیلی ہوئی سلطنت برطانیہ کی شہ رگ اتنی غیر محفوظ ہو جائے گی کہ عربوں اور ترکوں کا جب جی چاہے گا اسے کاٹ ڈالیں گے۔

اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے جرمن فوجی وفد استنبول پہنچ گیا۔ اور عثمانی فوج کے مشہور زمانہ "جانثار" کروپس کے کارخانوں ڈھلی ہوئی بندوقوں، مشین گنوں اور دور مار توپوں سے مسلح ہو کر اس جنگ کی تربیت حاصل کرنے لگے جو برطانیہ کو مشرق وسطیٰ سے بے دخل کرنے کے لئے قیصر ولیم کے ذہن میں لڑی جا رہی تھی۔ ۱۹۱۰ء میں وہ عالم اسلام کے دورے پر نکلا۔ اور بیت المقدس میں لاکھوں کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر مسلمانوں کو ملک و ملت کے تحفظ کی خاطر کسی دشمن کے خلاف جنگ میں اترنا پڑا تو میری قوم ان کے کندھے سے کندھا ملا کر لڑے گی۔"

اس بیان نے عالم اسلام پر چھائے ہوئے انگریز کو حیرت میں ڈال دیا۔ اور اس کا توڑ تلاش بھی کرنا پڑا کہ عثمانی حکومت نے ایک جرمن فرم کو "حجاز ریلوے"

کا ٹھیکہ دے دیا۔ یہ ریلوے لائن بغداد کو استنبول کے راستے برلن سے ملانے والی تھی۔ لیکن انگریز نے پہلی جنگ عظیم چھیڑ کر برلن کو بغداد سے نہ ملنے دیا۔ انور پاشا نے قیصر ولیم کے حلیف کی حیثیت سے برطانیہ کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ اس وقت دوسری جنگ کا فاتح ونسٹن چرچل شاہی بحریہ کا وزیر تھا۔ اس نے درۂ دانیال کے دہانے گیلی پولی پر فوجیں اتاریں جہاں مصطفےٰ کمال پاشا نے انگلستان، جنوبی افریقہ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی متحدہ سپاہ کو ایسی عبرتناک شکست دی کہ پورے یورپ میں صف ماتم بچھ گئی۔ اب چرچل کو صاف نظر آ رہا تھا کہ ترک انطاکیہ کے ڈھلوانوں سے اتریں گے تو اسمعیلیہ پہنچ کر دم لیں گے۔ اور مصر کو بچانا مشکل ہو جائے گا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے۔ جب بنی ہاشم کا چشم و چراغ شریف حسین استنبول کی طرف سے حجاز کا گورنر تھا۔ چرچل نے مصر کے ہائی کمشنر میک ماہن کے ذریعہ شریف حسین کو پیغام بھیجا کہ اگر آپ ترکوں کے خلاف بغاوت کر کے ہمارا ہاتھ بٹائیں تو ملک معظم کی حکومت ایک ایسی آزاد ریاست عرب کی داغ بیل ڈالنے کو تیار ہے جو پورے جزیرۃ العرب پر محیط ہو گی۔

اس کھلے وعدہ میں روح پھونکنے کے لئے کرنل لارنس خلیج عقبہ میں اترا جہاں شریف حسین کے منجھلے صاحبزادے۔ امیر فیصل اس کے منتظر تھے۔ لارنس نے پہنچتے ہی صحرا میں سونا بکھیر دیا۔ امیر فیصل نے اپنے جھنڈے تلے عربوں کو جمع کیا۔ عقبہ میں باغی فوج کا ہیڈ کوارٹر بنا اور گورا فوج کا ایک پورا موٹر بریگیڈ پہنچ گیا جس نے عربوں کی رہنمائی میں ان تمام سڑکوں پلوں اور ریلوے پٹڑیوں کو بارود سے اڑا دیا جو اسمعیلیہ کی طرف ترک فوج کی پیش قدمی کا واحد ذریعہ تھی۔ اس کے ساتھ ہی صحرا میں گورا فوج کی موجودگی نے اس برطانوی لشکر کا مشرقی بازو بالکل محفوظ کر دیا جو لارڈ ایلن بی کی قیادت میں غزہ سے فلسطین اور دمشق کے راستے استنبول پر حملہ کرنے جا رہی تھی۔

انگریز بیت المقدس میں

لارڈ ایلن بی ہراول دستوں کے ساتھ دسمبر ۱۹۱۷ء میں بیت المقدس داخل ہوا۔ اور یہ برطانوی فوج ۱۹۴۸ء میں اس وقت وہاں سے نکلی جبکہ ان کی جگہ اسرائیلی فوج تعینات ہو چکی تھی۔ لیکن اس وقت بیت المقدس کا صرف مغربی حصہ اسرائیلی فوج کے قبضہ میں تھا اور آج نہ صرف پورا شہر بلکہ دریائے اردن کے مغربی کنارے خلیج عقبہ اور اسمعلیہ تک تمام صحرائے سینا پر اس کا قبضہ ہے وہ اس علاقے کو کب تک پامال کرتے رہیں گے۔ کوئی شخص اس بارے میں کچھ پیش گوئی نہیں کر سکتا

مولانا سید ابوالحسن ندوی

محرومی عارضی ہے

مسجد اقصیٰ سے مسلمانوں کا جو دینی و روحانی تعلق ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ۔ وہ مسلمانوں کا پہلا قبلہ ہے ۔ ہجرت کے بعد بھی سولہ سترہ مہینے تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ اور مسلمان اسی کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھتے رہے ۔ شب معراج میں پہلے آپؐ کو مسجد حرام سے اسی مسجد میں لے جایا گیا ۔ وہاں آپؐ نے انبیاء علیہم السلام کی امامت کی ۔ پھر وہاں سے آپؐ آسمان پر تشریف لے گئے ۔

احادیث میں آتا ہے کہ وہاں ایک نماز پڑھنے کا ثواب ایک ہزار نمازوں کا ہوتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین اور گزشتہ نبوتوں کے وارث و امین اور تمام انبیاءؑ سابقین کے جانشین اور اس امت کے آخر الامم اور تمام انبیاء کی صداقت کی شاہد اور گواہ ہونے کا تقاضہ تھا کہ بیت المقدس کی تولیت اور خدمت وحفاظت انھیں کے حصہ میں آئے ۔ اس لئے کہ وہ ایک وقت میں حضرت موسیٰ و ہارون، حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ، زکریاؑ و یحییٰؑ اور تمام انبیائے بنی اسرائیل کی نبوت وصداقت پر ایمان رکھتی ہے ۔ دوسری طرف وہ حضرت مریمؑ کی عصمت اور حضرت مسیحؑ کی نبوت و وجاہت عند اللہ کے عقیدہ کو بھی جزو ایمان سمجھتی ہے ۔ اس لئے اسی سے ان کی یادگاروں کی حفاظت اور ان سب کے تقدس واحترام کی رعایت کی امید کی جا سکتی ہے ۔

اسی اہمیت وعظمت کے پیش نظر جب بیت المقدس کے محافظین و منتظمین نے صلح اور شہر کی حوالگی کے لئے یہ شرط کی کہ خلیفۂ اسلام (فاروق اعظمؓ) خود تشریف لائیں تاکہ شہر اور مسجد اقصیٰ کی کنجیاں ان کے حوالے کی جائیں تو انھوں نے اس کو منظور کیا اور باوجود اس کے کہ انھوں نے عراق و شام کی مہمات و فتوحات کے اس پورے دور میں اپنی جگہ سے جنبش نہ کی تھی ۱۶ھ میں مدینہ طیبہ سے بیت المقدس تک کا سفر کیا ۔ بیت المقدس میں داخل ہو کر سجدہ شکر ادا کیا اور بیت المقدس کی تولیت کا شرف حاصل کیا ۔ اس وقت سے صدیوں تک

مسلمانوں کو یہ شرف حاصل رہا۔ مسلمانوں نے اس دولت کو سینے سے لگا کر رکھا۔ یہودیوں اور عیسائیوں میں سے کسی کو بھی ان سے کسی ناانصافی، جانبداری یا تنگ نظری کی کبھی شکایت نہیں ہوئی۔ وہ سب اپنے عقیدے اور طریق کے مطابق زیارت و عبادت کے مراسم ادا کرتے رہے اور ان کو اس کی پوری آزادی حاصل رہی۔

لیکن پانچویں صدی میں دنیائے اسلام ایک سخت سیاسی، اقتصادی اور اخلاقی انتشار سے دوچار ہوئی۔ اس وقت مشرق وسطیٰ میں بغداد کی خلافت عباسی کے محدود دائرہ اثر کو چھوڑ کر مختلف تاریخی اور دینی و اقتصادی اسباب کی بناء پر سخت اخلاقی زوال اور سیاسی انتشار رونما تھا۔ شریعت اسلامی کا صاف صاف استخفاف، سنت مطہر کی کھلی ہوئی مخالفت اور تحقیر، شعائر اسلامی کا ابطال، منکرات شرعیہ کا رواج، عیش و عشرت اور لہو ولعب کی گرم بازاری تھی۔ مسلمانوں کی حمیت و غیرت میں بھی بڑا تنزل آگیا تھا۔ اس زمانہ میں یورپ سے صلیبیوں کا ایک سیلاب اٹھا جس کے سامنے کوئی طاقت ٹھہر نہ سکی ۴۹۳ھ میں ان صلیبی حملہ آوروں نے شام کے دوسرے شہیدوں کے ساتھ بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ اسٹینلے لین پول کے

بقول صلیبی سپاہی ملک میں اس طرح گھسے جیسے کوئی پرانی لکڑی میں پچر ٹھونکے۔ تھوڑی دیر کو یہی معلوم ہونے لگا کہ درخت اسلام کے تنے کو چیر کر اس کی چھپٹیاں اڑا دیں گے۔ اس وقت سارے ظاہری آثار و قرائن بتا رہے تھے کہ مسلمان اب اس شرف سے محروم رہیں گے۔ اور بیت المقدس پھر کبھی ان کے انتظام و تولیت میں نہ آئے گا۔ لیکن اس عام تاریکی اور عالمگیر مایوسی کے دور میں عالم اسلام کے افق پر ایک نیا ستارہ طلوع ہوا اور خدا نے اپنی سنت و عادت کے مطابق اس امت کی دستگیری فرمائی۔ عماد الدین زنگی اور اس کے بعد نور الدین زنگی نے مغرب کے اس چیلنج کو قبول کیا اور میدان میں آئے اور بیت المقدس کی بازیابی کے لئے سردھڑ کی بازی لگا دی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت ان کے جانشین سلطان صلاح الدین ایوبی کی قسمت میں رکھی تھی۔ جن کی ذات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مستقل معجزہ اور اسلام کی صداقت اور ابدیت کی روشن دلیل ہے انھوں نے بیت المقدس کی بازیابی کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد بنا لیا۔

بالآخر خدا نے صرف سلطان ہی کی نہیں بلکہ سارے مسلمانوں کی آرزو پوری کی۔ جو نہ صرف آرزو تھی بلکہ آبرو بھی تھی۔ ۲۷ رجب (ٹھیک جس تاریخ کو قبلۂ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی شب

میں انبیاء کی امامت کی تھی ۔ ۵۸۳ھ کو بیت المقدس کے دروازے مسلمانوں کے لئے کھلے اور مسلمانوں نے دوبارہ اس کی تولیت کی عزت حاصل کی ۔ بقول قاضی ابن شداد ہر طرف دعا و تہلیل و تکبیر کا شور بلند تھا ۔ بیت المقدس میں ۹۰ برس کے بعد جمعہ کی نماز ہوئی ۔ نور الدین کا تیار کیا ہوا منبر ان کی وصیت و آرزو کے مطابق نصب کیا گیا ۔ سلطان نے اسلامی اخلاق رحم و کرم اور عفو و درگذر کا مظاہرہ کیا جو تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا ۔ اسٹینلے لین پول نے لکھا ہے ۔

"اگر سلطان صلاح الدین کے کاموں میں یہی کام دنیا کو معلوم ہوتا کہ اس نے کس طرح یروشلم کو بازیاب کیا تو صرف یہی کارنامہ اس بات کے ثابت کرنے کے لئے کافی تھا کہ وہ نہ صرف اپنے زمانہ کا بلکہ تمام زمانوں کا سب سے بڑا عالی حوصلہ انسان اور جلالت و شجاعت میں یکتا اور بے مثل شخص ہے ۔"

ان کی فوج اور خود ان کی سلطنت نہ صرف مختلف بلکہ متباین عناصر پر مشتمل تھی جن میں عرب بھی تھے ۔ کرد بھی تھے ، شامی بھی تھے ، مصری بھی تھے ۔ ترک اور زنگی بھی ، لیکن سب بنیان مرصوص (سیسہ پلائی ہوئی دیوار) بنے ہوئے تھے ۔ وہ سب کو اولاد کی طرح عزیز رکھتے تھے ۔ اور وہ سب ان کو ایک شفیق باپ ایک روحانی پیشوا اور ایک بے لوث داعی اسلام کی نظر سے دیکھتے تھے ۔ اسٹینلے لین پول کی زبان سے سنئے "تیسری جنگ صلیب میں تمام عیسائی دنیا کی مجموعی طاقت مقابلہ کرنے آئی مگر صلاح الدین کی قوت کو ٹس سے مس نہ کر سکی ۔ صلاح الدین کی سپاہ مہینوں کی سخت محنت و جانفشانی اور مخدوش اور خطرناک خدمت کے بعد تھک کر چور چور ہو چکی تھی ۔ مگر کسی کی زبان پر حرف شکایت نہ تھا ۔ فوری طلبی پر حاضر ہوتے اور ایک نیک کام میں اپنی جانیں قربان کرنے سے کسی نے انکار نہ کیا ۔ . . . کرد ، ترکمان ، عرب ، مصری سب مسلمان سلطان کے خادم تھے ۔ اور طلبی پر خادموں ہی کی طرح سلطان کی خدمت میں حاضر ہوتے ۔ باوجود اس کے کہ ان کی نسل و قوم جدا تھی ۔ اور باوجود قومی جھگڑوں اور قبائلی غرور و تفاخر کے سلطان نے ان کو ایسا شیر و شکر کر رکھا تھا کہ تمام لشکر تن واحد نظر آتا تھا ۔"

سلطان کی اس مخلصانہ کوشش میں اللہ نے ایسی برکت دی کہ ۲۷ رجب ۵۸۳ھ سے لے کر ۲۹ صفر ۱۳۸۷ھ تقریباً آٹھ سو برس تک ، اس مختصر مدت کو مستثنیٰ کر کے جس میں فلسطین برطانوی انتداب میں رہا ۔ بیت المقدس مسلمانوں کی تولیت و انتظام میں رہا ۔ مسلسل آٹھ صدیوں کے بعد مسلمان اس دولت سے محروم ہوئے ہیں ۔ لیکن ہمارا پختہ

بقیہ صـ ۱۶۴ پر

ممتاز یاقت

بڑھے چلو — بڑھے چلو

لٹا ہے کارواں تو کیا، بدل گیا جہاں تو کیا
بلند تر ہیں حوصلے، جلا ہے آشیاں تو کیا
چلے ہیں پھر یہ سر پھرے، بڑھے چلو بڑھے چلو

رگوں میں خون گرم ہے، نگاہ سوئے رزم ہے
ادھر ہے ظلم خندہ زن، ادھر جنوں ہے سرم ہے
ہتھیلیوں پر سر لیے، بڑھے چلو بڑھے چلو

عرب کے ریگ زار سے، سمندروں کے پار سے
اٹھا ہے ایک معرکہ، مٹے گا ایک وار سے
بڑھے ہوئے ہیں حوصلے، بڑھے چلو بڑھے چلو

چلے ہیں ایسی شان سے، عجیب آن بان سے
یروشلم کے ظالمو، قضا ہے آسمان سے
قدم نہ کوئی اب رکے، بڑھے چلو بڑھے چلو

یہ کوئی جنگ تو نہ تھی، اٹھے بطرز بزدلی
کسی سے بھیک مانگ کر بنے ہوئے ہو تم جری
یہ آن کوئی دم کی ہے، بڑھے چلو بڑھے چلو

نگاہ سوئے آسماں چمک رہی ہوں بجلیاں
جدھر بڑھائیں ہم قدم، بنائیں ایک نیا جہاں
چلو کچھ ایسی شان سے، بڑھے چلو بڑھے چلو

دلوں میں کچھ ولولہ بھی ہے، ہمارا فیصلہ بھی ہے
صیہونیوں کے واسطے یہ دعوتِ قضا بھی ہے
یہ سارا کارواں چلے، بڑھے چلو بڑھے چلو

یہ امتحان سخت ہے، بھنور میں اپنا بخت ہے
خدا ہمارے ساتھ ہے، نہ تاج ہے نہ تخت ہے
مگر بڑھے ہیں سر پھرے، بڑھے چلو بڑھے چلو

الطاف تیمر اعظمی

اے مردِ مسلماں جاگ

اے مردِ مُسلماں جاگ ذرا، اے مردِ مُسلماں جاگ
تیرے گھر میں رقص کناں ہے دیوِ استبداد
کل تک تھے جو راندۂ عالم آج ہوئے آباد
آنحضرتؐ کی اُمّت ہو اور دُنیا میں ناشاد
اے مردِ مُسلماں جاگ ذرا، اے مردِ مُسلماں جاگ
مصر و فلسطین کے میدان میں موت ہے منہ پھیلائے
لاکھوں انساں گھوم رہے ہیں غم کا بوجھ اٹھائے
پھیل رہے ہیں گھر گھر میں افلاس کے کالے سائے
اے مردِ مُسلماں جاگ ذرا، اے مردِ مُسلماں جاگ
عصمت اور عفت کے شیشے ہو گئے چکنا چور
پاک نظر دوشیزائیں ہیں افسردہ اور مجبور
توہینِ اسلام سے باطل ہے کتنا مسرور
اے مردِ مُسلماں جاگ ذرا، اے مردِ مُسلماں جاگ
سینے میں پوشیدہ تیرے ہے رازِ تسخیر
دُنیا کو اِک بار دکھا دے ماضی کی تصویر
گونج اُٹھے پھر میدانوں میں ایوبی تکبیر
اے مردِ مُسلماں جاگ ذرا، اے مردِ مُسلماں جاگ

مفتی محمد حسین نعیمی

جہاد فرض ہوچکا ہے

قرآن کریم کے مطابق جہاد کی تین اقسام ہیں "جہاد اندفاعی" جہاد انتقامی اور جہاد انتظامی۔

جب دشمن مسلمانوں پر حملہ کر دے اور فوج لے کر چڑھ آئے تو اتنے مسلمانوں پر جہاد کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ جو دشمن کو روک سکیں اور اس کو جارحانہ اقدام کی سزا دے سکیں۔ اس کو جہاد اندفاعی کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے۔

فان قتلوکم فاقتلوھم کذالک جزاء الکفرین۔

یعنی اگر کفار تم سے جنگ کریں تو تم بھی ان سے جنگ کرو، کافروں کی یہی سزا ہے۔

مزید ارشاد ہوتا ہے۔

"وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین"

یعنی اس کی راہ میں جہاد کرو ان کافروں سے جو تم سے جنگ کریں۔ اور تم زیادتی نہ کرو بیشک اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔

جب کفار نے کسی جگہ مسلمانوں کی کسی جماعت پر ظلم کیا ہو۔ اور ان کو ستایا ہو۔ تو مسلمانوں پر کفار سے بدلہ لینے کے لیے اور اپنے مظلوم بھائیوں کی مدد کے لئے جہاد کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ اس کو جہاد انتقامی کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے۔

"اور ان کو مارو جہاں پاؤ اور ان کو نکالو جہاں سے انھوں نے تمہیں نکالا ہے کیوں کہ فتنہ قتل سے زیادہ بُری چیز ہے"

کفار نے ابھی حملہ نہ کیا ہو اور نہ مسلمانوں پر ظلم کیا ہو مگر حالات و قرائن سے معلوم ہو جائے کہ دشمن مسلمانوں کے خلاف تدابیر کر رہا ہے اور خطرناک عزائم رکھتا ہے۔ اندیشہ ہے کہ وہ کسی وقت بھی مسلمانوں کے لیے خطرہ بن جائے گا۔ تو ایسی صورت میں مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ پہل کر کے دشمن کی طاقت کو ختم کر دیں۔ اور اس کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیں۔ یہ جہاد انتظامی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

"کافروں سے جہاد کرو یہاں تک کہ ان کا فتنہ اور خطرہ ختم ہو جائے۔ اللہ کے دین کا نظام قائم ہو"

(سورۃ الانفال رکوع ۵)

عالم عرب پر خصوصاً اور مسلمانان عالم پر عموماً تینوں قسم کے جہاد فرض ہو چکے ہیں۔ دشمنان دین حملے بھی کر چکے ہیں۔ اور مسلمانوں پر ظلم و ستم ڈھا کر انہیں شہروں اور بستیوں سے نکال بھی چکے ہیں۔ نیز آئندہ کے لیے

بھی خطرناک عزائم رکھتے ہیں۔ لیکن اس فرض کی ادائیگی کے لئے کچھ شرائط ہیں۔ جب تک وہ شرائط پوری نہیں ہوتیں جہاد کو عملی شکل نہیں دی جا سکتی، ان شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ جہاد میں جتنا علاقہ اور جو لوگ شریک ہوں ان کا ایک امیر ہونا چاہیئے۔ چنانچہ ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمان کم از کم جہاد انتقامی کے لئے ایک متحدہ ہائی کمان ترتیب دیں۔ جو جہاد کے تمام منصوبوں کو بروئے کار لائے۔

جہاد کی دوسری شرط یہ ہے کہ مسلمان جہاد کے لیے پوری طرح تیار ہوں، دشمن کی طاقت کا اندازہ اور اپنی قوت پر پورا اعتماد ہو۔ دشمن اگر دگنی سے زیادہ طاقت رکھتا ہو۔ تو جہاد شروع کر دینا ضروری نہیں بلکہ جب تک مجاہدوں کو خدا کے فضل اور ساز و سامان کی بنا پر کامیابی کی پوری توقع نہ ہو، جہاد میں کود پڑنا جائز نہیں۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"جہاد کی دوسری شرط یہ ہے کہ اہل اسلام کو قوت و غلبہ کی امید ہو، اس شخص کے اندازے کے مطابق جس پر بھروسہ کیا جائے۔

اگر قوت و غلبہ کی امید نہ ہو تو جہاد حلال نہیں اور اس وقت جہاد خود کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہوگا"

تیسری شرط جہاد کی یہ ہے کہ مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد و اتفاق ہو، کیونکہ ذرا سے اختلاف میں بھی فتح و نصرت مشکوک ہو جاتی ہے۔ اس لیے موجودہ حالات میں دنیائے اسلام پر لازم ہے کہ وہ جہاد کی تیاری کرے اور اس کے لوازم، اسباب اور وسائل فراہم کرے۔ فتاویٰ عالمگیری میں بھی ہے:

"تیاری کرو دشمن کے لیے، جتنی بھی استعداد رکھتے ہو، اور خدا کا دشمن خوفزدہ ہو جائے۔"

مختصر یہ کہ جہاد فرض ہو چکا ہے مگر اس کو عملی جامہ پہنانے سے قبل جہاد میں کامیابی کی شرائط کو پورا کرنا ضروری ہے۔ اس لیے مسجد اقصےٰ، بیت المقدس اور فلسطین کی واپسی سے قبل جہاد کی مکمل تیاری کی ضرورت ہے، فخر الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ اقدس میں مکہ مکرمہ و خانہ کعبہ عرصہ دراز تک کفار کے قبضے میں رہا اور مسلمانوں کو مکہ معظمہ سے ہجرت کرنا پڑی، مگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت تک مکہ معظمہ پر جہاد نہ کیا، جب تک پوری طرح تیاری نہ کر لی اور اس میں آٹھ سال صرف ہوئے۔ اب مسلمان مسجد الاقصیٰ مسجد عمر، اور قبۃ الصخرہ کی واپسی کے لیے جہاد شروع کرنے سے پہلے تمام وسائل اور ذرائع فراہم کریں، تاکہ غلبہ اسلام میں کوئی شک نہ رہ جائے۔

بقیہ عالم اسلام کیلئے

منظم نہیں کریں گے؟ کیا اب بھی مختلف قسم کے 'ازم'، عرب ممالک کو ذہنی اخلاقی اور مادی انتشار میں مبتلا رکھیں گے؟

ان سوالوں کا جواب عرب ممالک کے لیڈر ہی دے سکتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ "عرب اسرائیل جنگ" کا زخم عرب لیڈروں کو حقیقت پسند بنا دے گا۔

بیان دکار الرحمن

دنیائے اسلام کیلئے چیلنج

مشہور امریکی ہفت روزہ "نیوزویک" نے ۳ جولائی ۱۹۶۷ء کے شمارے میں "عرب اسرائیل جنگ" کے نتائج پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"موت کیا ہے؟ جنت!"

"فتح کیا ہے؟ مال غنیمت!"

"شکست کیا ہے؟ جنگ جاری رکھنے کا ایک اور موقع!"

"یہ ہے محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا قدیم جنگی نعرہ۔"

"اسرائیل کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست کھانے کے بعد عرب ممالک کے لیڈر بڑے جوش وخروش سے اپنے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اس نعرے پر حرف بحرف عمل کرنے کے عزم کا اظہار کر رہے ہیں۔"

رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نام لے کر مسلمانوں کو نشانۂ تضحیک بنانے کی یہ ناپاک جسارت اسی دیرینہ تعصب کی بنا ہے جسے "انسانیت دوستی" اور "جمہوریت پسندی" کے مغربی علمبردار آج کے مہذب دور میں بھی اپنے دلوں سے نہیں نکال سکے۔ "نیوزویک" کے اس اشتعال انگیز تبصرے کا ایک مقصد تو اسلام کے فلسفۂ جہاد کا مذاق اڑانا اور دوسرا مقصد عربوں کی شکست کو مذہبی رنگ دے کر دنیا بھر کے مسلمانوں کو احساس کمتری میں مبتلا کرنا ہے۔ مغربی اخبارات اور جرائد نے "عرب اسرائیل جنگ" میں جو کردار ادا کیا ہے۔ اس سے ہمیں ایک واضح سبق ملتا ہے۔ دنیا کا کوئی بھی مسئلہ ہو اگر اس میں ایک فریق مسلمان ہے تو مغربی اخبارات اور جرائد اس کی مخالفت ضرور کریں گے۔ جب پاک بھارت جنگ ہوئی تھی تو مغربی اخبارات وجرائد کی اکثریت کی ہمدردیاں بھارت کے ساتھ تھیں۔ حالانکہ اس حقیقت میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ تھی کہ بھارت نے جارحیت کا ارتکاب کیا تھا۔ اور

پھر یہ ایک بڑے ملک کا ایک چھوٹے ملک پر حملہ تھا ۔ وہ بڑا ملک بین الاقوامی سیاست میں مغربی ممالک کو بلیک میل کرتا تھا ۔ اور یہ چھوٹا ملک مغربی ممالک کا حلیف رہ چکا تھا ۔ ان تمام حقائق کے باوجود مغربی اخبارات اور جرائد نے ایسا رویہ اختیار کیا جو بظاہر تو غیر جانبدارانہ تھا ۔ لیکن بباطن بھارتی مفادات کی حمایت میں تھا ۔ یہ مغربی اخبارات و جرائد کی بدقسمتی تھی کہ پاکستان نے ان کی توقعات کے برعکس سترہ دنوں کے اندر "دیو ہیکل بھارت" کو امن کی بھیک مانگنے پر مجبور کر دیا ورنہ اگر خدانخواستہ بھارتی جارحیت اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جاتی تو یہی اخبارات جنہوں نے پاکستان کی جیت کو کڑوا گھونٹ سمجھ کر پیا ہے مسلمانوں کی شکست پر اس انداز میں خوشی اور مسرت کا اظہار کرتے کہ شاید بھارت بھی شرما جاتا ۔

قبرص کے معاملے میں بھی مغربی پریس کا رویہ کچھ زیادہ مختلف نہیں رہا ۔ ترکی مغربی ممالک کا حلیف ہے ۔ لیکن ترکی اپنے اسلام کو ڈپلومیسی کے پردوں کے پیچھے نہیں چھپا سکتا ۔ قبرص کی عیسائی آبادی کئی بار قبرصی ترکوں کے خون سے اپنی پیاس بجھا چکی ہے ۔ قبرصی ترکوں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کی سازش کئی مرتبہ اہل ترکی کی قومی حمیت کو دعوت عمل دے چکی ہے ۔ ترکی کئی دفعہ قبرص کے مسئلے کا منصفانہ حل تلاش کرنے کی ضرورت پر زور دے چکا ہے ۔ لیکن ترکی کے مغربی حلیف اس لئے قبرص کے مسئلہ کو اہمیت نہیں دیتے کہ اس میں ایک فریق عیسائی اور دوسرا مسلمان ہے ۔ ایک موقع ایسا بھی آیا تھا جب قبرصی ترکوں کے وجود کو خطرے میں دیکھ کر ترکی حکومت طاقت کے استعمال کے امکانات پر غور کرنے پر مجبور ہو گئی تھی ۔ لیکن ترکی کے مغربی حلیفوں نے ڈپلومیسی کی زبان میں ترکی کو دھمکی دی تھی کہ اگر قبرص کے مسئلہ پر جنگ چھڑی تو نتائج کی ذمہ داری ترکوں پر ہوگی ۔ اس سلسلے میں امریکہ کے ایک موقر اخبار "نیویارک ٹائمز" نے لکھا تھا :۔

"ترکی ہمارا حلیف اور معاہدہ اوقیانوس کا رکن ہے ۔ ہماری اخلاقی ذمہ داری یہ ہے کہ ہم ترکی کو کوئی غیر دانشمندانہ قدم اٹھانے سے باز رکھیں ۔ ترکی اور یونان کو دوستوں کی طرح رہنا چاہیئے قبرص کا مسئلہ جنگ کے ذریعہ نہیں حل کیا جا سکتا ۔ کیوں کہ امریکہ ترکی کا دوست ہونے کے باوجود قبرص کی حکومت یا یونان کے خلاف ترکوں کے کسی فوجی اقدام کی حمایت نہیں کرے گا ۔ جنگ

کی صورت میں امریکی رائے عامہ کی ہمدردیاں میکاریوس کی حکومت اور یونان کے ساتھ ہو جائیں گی۔ امریکہ اور ترکی کی دوستی صرف اسی صورت میں قائم رہ سکتی ہے کہ ترک قبرص کے مسئلہ کو الجھانے کی کوشش نہ کریں۔ اور یونانیوں کے ساتھ دوستانہ روابط قائم کریں۔"

یہ ایک ایسے اخبار کا اندازِ فکر ہے جسے آزاد خیال اور انصاف پسند تصور کیا جاتا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں ایسے اخبارات اور جرائد بھی موجود ہیں جن میں قبرص کے عیسائی دہشت پسندوں کی ترک دشمن سرگرمیوں کی کھلم کھلا حمایت کی جاتی ہے۔ بعض اخبارات نے تو جنرل گریواس کی شان میں قصیدے بھی لکھے ہیں۔ جنرل گریواس قبرص کے عیسائی دہشت پسندوں کے لیڈر ہیں۔ اور یونان و قبرص کے الحاق کو اپنی زندگی کا مشن تصور کرتے ہیں۔ انھوں نے ایک امریکی اخبار نویس سے کہا تھا "قبرص یونان کا حصہ ہے قبرص کو زیادہ عرصہ تک خود مختار نہیں رکھا جا سکتا۔ اور نہ ہی اسے ترک اور یونانی باشندوں کے درمیان بانٹا جا سکتا ہے۔ اگر ضرورت پڑی تو ہم اپنے مقصد کے حصول کی خاطر ترکوں کے قتل عام سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔"

اسی جنرل گریواس کے متعلق امریکی ہفت روزہ "ٹائم" نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ "وہ اہل یونان کے ہیرو ہیں۔ جنرل گریواس جو بھی مطالبات کر رہے ہیں وہ اگر پورے نہ ہوئے تو ممکن ہے کہ قبرص کے ترک باشندوں کا قتل عام شروع ہو جائے۔ ترکی کو چاہیے کہ وہ اپنی پالیسی میں ذرا لچک پیدا کرے۔ کیوں کہ آج کے دور میں مذہبی بنیادوں پر کوئی مسئلہ حل نہیں کیا جا سکتا۔"

مغربی پریس کی منطق ہمیشہ یہی ہے کہ پوری دنیا سیکولر معاشرے کے تصور کو قبول کر چکی ہے یا کر رہی ہے۔ ایسی صورت میں مذہب کو بین الاقوامی سیاست میں کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ مغربی پریس کی یہ منطق اگر قبول کر لی جائے تو اس کے مسلم دشمن رویہ کی وجوہ کیا ہیں!

مغربی ممالک کا سیکولرزم دراصل مسلم قومیت کے رجحانات کے خلاف ایک ڈپلومیٹک ہتھیار ہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ کئی مسلم ممالک مغرب کے اس مہلک ہتھیار کو اپنے تمام مصائب کا حل تصور کرتے ہیں۔

بھارت کے سیکولرزم اور مغربی سیکولرزم میں کوئی بنیادی فرق

نہیں ہے۔ دونوں کا مقصد ایک ہی ہے۔ مسلمانوں کو اپنے "احساس قومیت" سے محروم کرنا۔ بھارت اپنی مسلم آبادی کو طاقت کے ذریعے ختم نہیں کر سکتا۔ لیکن سیکولرزم کا نعرہ لگا کر وہ بآسانی ۹ کروڑ مسلمانوں کو ۴۰ کروڑ ہندوؤں میں جذب کر سکتا ہے۔ بھارتی سیکولرزم کا ایک مقصد اور بھی ہے۔ اور وہ ہے پاکستان اور دنیا کے دوسرے مسلم ممالک کے باہمی رشتۂ اخوت کو کمزور بنانا اور مسلم اتحاد کے تصور کو سبوتاژ کرنا۔

مغربی سیکولرزم کے مقاصد بھارتی سیکولرزم سے مختلف نہیں ہیں۔ مغربی سیکولرزم کا بیج اس وقت بویا گیا تھا جب افریقہ اور ایشیا کے بیشتر مسلم ممالک مغربی سامراج کی چکی میں پس رہے تھے۔ مغرب جانتا تھا کہ مسلمان کبھی بھی اپنا مذہب نہیں چھوڑتے۔ اس لئے جو کام عیسائی مشنریوں کے ذریعہ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ سیکولرزم کے رجحانات کو فروغ دے کر کرایا گیا۔ مغربی ممالک نے اپنی مسلم نوآبادیات میں جو نظام تعلیم جاری کیا۔ اس کا مقصد مسلمانوں کو اپنی زبوں حالی اور پسماندگی کا احساس دلانا اور یہ تاثر دینا تھا کہ اسکا سبب "اسلام" ہے مغربی سامراج مسلمانوں میں احساس کمتری پیدا کرنے میں کتنا کامیاب ہوا۔ اسکا اندازہ سیکولرزم کی ان تحریکوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ جو مسلم ممالک میں قوم پرستی کا لبادہ اوڑھ کر شروع ہوئیں۔

مسلم قومیت کے تصور پر سیکولرزم کا سب سے شدید حملہ مشرق وسطیٰ میں ہوا۔ لیکن برصغیر پاک و ہند کے مسلمان بھی اس حملے سے محفوظ نہ رہ سکے۔ سیکولرزم کی اس یلغار کے خلاف جن مسلم مشاہیر نے صدائے احتجاج بلند کی ان میں علامہ اقبالؒ پیش پیش تھے۔ اقبالؒ نے اپنی تقاریر، اپنے مضامین اور اپنی شاعری میں مسلمانانِ عالم کو اس خوفناک طوفان کے خطرے سے آگاہ کیا۔ جو سیکولرزم کی شکل میں ابھر رہا تھا۔

"خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر
لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئیگا الحاد بھی ساتھ
گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ"

شیریں کا مطلب تعلیمی ترقی تھا۔ اور تیشۂ فرہاد سے مراد وہ نظریاتی تنزل تھا جو اس تعلیمی ترقی کے دامن میں چھپا ہوا تھا۔ یہ نظریاتی تنزل اس احساس کمتری کا نتیجہ تھا جو مسلمانوں میں

بڑی شدت سے جڑ پکڑ رہا تھا۔ اقبال کا نظریہ "خودی" اسی احساس کمتری کے خلاف ایک اخلاقی اور نظریاتی حصار تھا۔

دنیائے عرب میں جو قوم پرست تحریکیں شروع ہوئیں وہ اسی احساس کمتری کا نتیجہ تھیں ان قوم پرست تحریکوں میں سیکولرزم کو بڑا دخل تھا۔ سیکولرزم کی وجہ سے مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک میں جو نظریاتی خلاء پیدا ہوا اسے پُر کرنے کے لئے خارجی تصورات درآمد کئے گئے۔ کسی تحریک نے سوشلزم کا لیبل لگا لیا اور کسی نے نیشنلزم کا کسی طبقہ نے فرانس اور برطانیہ کے مفکروں کو اپنی مسیحائی کے لئے منتخب کر لیا۔

اس نظریاتی انتشار کا نتیجہ یہ نکلا کہ عرب اپنی نسلی اور عملی صلاحیتوں کو کسی ایک مرکز پر جمع نہ کر سکے، ایک مضبوط مرکز دنیائے عرب کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اور یہ مرکز سیکولرزم یا اسی قسم کا کوئی اور مغربی "ازم" مہیا نہیں کر سکتا۔ اگر سیکولرزم اور اس سے ملتے جلتے تصورات عربوں کو مادی ترقی اور سیاسی قوت عطا کر سکتے تو مشرق وسطیٰ کی حالیہ جنگ میں اسرائیل، صیہونیت کو اپنی فکری اور عملی قوتوں کا محور بنا کر عربوں کے خلاف کامیابی حاصل نہ کرتا۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ عسکری نقطۂ نظر سے عربوں کو شکست اسی وجہ سے ہوئی کہ اسرائیل نے جنگ میں پہل کر کے ان کی فضائیہ کو مفلوج کر دیا لیکن اس عسکری شکست کے عقب میں گزشتہ چند برس کے تاریخی حقائق بھی ہیں۔

اسرائیل کا قیام کسی اتفاق کا نتیجہ نہیں بلکہ دنیائے عرب کے خلاف ایک سوچی سمجھی سازش کا نقطۂ عروج تھا۔ یہ سازش مغربی سامراج اور بین الاقوامی صیہونیت کے ذہنی سیاسی اور عملی اشتراک سے تیار ہوئی تھی۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران مغربی سیاستدانوں کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ نو آبادیاتی نظام کا خاتمہ قریب آ رہا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں مغربی سامراج کے اقتصادی اور سیاسی مفادات کے تحفظ کے لئے ضروری تھا کہ ایسے حالات پیدا کر دیئے جائیں جن میں عرب ممالک آزادی حاصل کرنے کے بعد سیاسی اور اقتصادی میدان میں اپنے پاؤں پر کھڑے نہ ہو سکیں۔ مشرق وسطیٰ میں ایک غیر عرب اور غیر مسلم مملکت کا قیام اس ضرورت کو پورا کر سکتا تھا۔ چنانچہ مغربی سیاستدانوں نے بین الاقوامی صیہونیت کے لیڈروں سے کورٹ شپ کی تفصیلات یہودیوں کے سب سے بڑے لیڈر ویزمین نے اپنی مشہور کتاب "ٹرائل اینڈ ایرر" (AND ERROR)

(TRIAL) میں درج کی ہیں۔ وہ لکھتا ہے۔

"ہماری کامیابی کے لیے ضروری تھا کہ کوئی بڑی طاقت ہماری حمایت کرے۔ اس وقت دنیا میں دو بڑی طاقتیں تھیں۔ ایک جرمنی اور دوسری برطانیہ۔ جرمنی سے ہمیں کوئی امید نہ تھی۔ لیکن حکومت برطانیہ کو ہمارے ساتھ ہمدردی تھی اور وہ اس ہمدردی کا اظہار عملی طور پر کرنے کے لیے تیار تھا۔ برطانیہ واحد ملک تھا جو ہمیں ایک علیحدہ قومی حیثیت دینے کے لیے تیار تھا۔ جہاں تک امریکہ کا تعلق ہے وہاں ہمارا اثر و رسوخ اتنا تھا کہ ہم بآسانی اپنے لیے عملی حمایت حاصل کر سکتے تھے۔ ویسے اس زمانے میں مشرق وسطیٰ کی سیاست میں امریکہ براہ راست ملوث نہیں تھا۔ اس لیے ہم نے صرف برطانوی حکومت کی حمایت پر بھروسہ کیا۔"

آگے چل کر ویزمین لکھتا ہے۔

"برطانیہ میں سیاستدانوں کا ایک طبقہ ایسا تھا جو ہماری آزاد مملکت کے قیام کا تو حامی تھا لیکن فلسطین کو ہمارے حوالے کرنے کے لیے تیار نہ تھا اس طبقہ کی نمائندگی لارڈ ڈیبرٹسن کرتا تھا۔ لارڈ ڈیبرٹسن فلسطین کو براہ راست برطانوی حکومت کے تابع رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے ایک خط لکھا جس میں ہماری آزاد مملکت کے لیے یوگنڈا کا علاقہ تجویز کیا گیا تھا۔ میں نے اس تجویز کو مسترد کر دیا۔

اس کے بعد ہم نے ایک کمیٹی بنائی جس کا کام یہودیوں کی آزاد مملکت کے لیے مناسب علاقے کا انتخاب کرنا تھا۔ اس کمیٹی کے اراکین قاہرہ گئے تاکہ فلسطین اور صحرائے سینا کے علاقوں کا جائزہ لیا جائے۔ میں بھی اس کمیٹی میں شامل تھا قاہرہ میں ہماری ملاقات لارڈ کرومر سے ہوئی جس نے ہمارے عزم سے مکمل اتفاق کیا۔ لارڈ کرومر نے مجھے بتایا کہ فلسطین کو ہم عربوں کے حوالے نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ ہمارے مقدس مقامات فلسطین میں ہیں۔ اگر فلسطین میں یہودی ریاست قائم ہو جائے تو عیسائی ممالک کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ لارڈ کرومر کے بعد میں برطانیہ کے وزیر خارجہ بالفور سے ملا۔ لارڈ بالفور نے مجھ سے پوچھا کہ یہودیوں نے یوگنڈا میں اپنی مملکت بنانے کی تجویز کیوں مسترد کر دی۔ میں نے جواب دیا۔ یہ سچ ہے کہ صیہونیت ایک قوم پرست سیاسی تحریک ہے۔ لیکن اس کا روحانی پہلو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہم نے اپنی تحریک کے روحانی پہلو کو نظر انداز کر دیا تو ہم کبھی بھی اپنے سیاسی اور قومی مقاصد کو پورا نہیں کر سکیں گے۔"

ایک اور جگہ ویزمین لکھتا ہے۔

"۱۹۲۱ء میں جب برطانوی حکومت فلسطین

کے مستقبل کے متعلق اپنی تجاویز کو آخری شکل دے رہی تھی تو میں لندن پہنچا۔ لیگ آف نیشنز میں پیش کی جانے والی قرارداد کا مسودہ تیار ہو رہا تھا اس قرارداد میں فلسطین کو برٹش مینڈیٹ حیثیت دی گئی تھی۔"

"اس وقت لارڈ بالفور کی جگہ لارڈ کرزن برطانیہ کا وزیر خارجہ تھا۔ قرارداد کا مسودہ اسی کی نگرانی میں تیار ہو رہا تھا۔ لارڈ کرزن کے ساتھ ایک مسئلہ پر ہمارا معمولی اختلاف ہوا۔ ہم چاہتے تھے کہ قرارداد میں واضح بالفور ڈیکلریشن کی توثیق کی جائے اور یہودی مملکت کے قیام کی گنجائش کو قانونی شکل دی جائے۔ لارڈ کرزن کو اصرار تھا کہ قرارداد کی زبان ایسی ہونی چاہیئے کہ "عرب یہ نہ کہیں کہ ان کے ساتھ غداری ہوئی ہے" میں نے لارڈ کرزن سے کہا کہ "جلد یا بدیر فلسطین ہمارے قبضے میں آ جائے گا۔ پھر عربوں کی ناراضگی کو اتنی اہمیت کیوں دی جائے؟"

لارڈ کرزن نے میری تجویز کے جواب میں کہا۔ "ہماری کوشش یہ ہے کہ ہمیں مشرق وسطیٰ میں ایسے حالات پیدا کرنے کا موقع مل جائے کہ عرب متحد نہ ہو سکیں۔ کیونکہ عرب اتحاد یہودیوں کی آزاد مملکت کے وجود کے لیے خطرہ بنا رہے گا۔ اس سلسلہ میں ہم ایسے عرب لیڈر تلاش کر رہے ہیں جن پر ہم بھروسہ کر سکیں۔ اور جن کے حوالے چھوٹی چھوٹی عرب ریاستیں کر دی جائیں۔ مشرق وسطیٰ میں جتنی زیادہ حکومتیں ہوں گی ہمیں اپنے مقاصد کی تکمیل میں اتنی ہی آسانی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم بڑے محتاط طریقے سے کام کر رہے ہیں۔ اگر عربوں کو یقین ہو گیا کہ برطانیہ کھلم کھلا یہودی ریاست کے لئے کام کر رہا ہے تو وہ متحد ہو جائیں گے اور ہمارے خلاف تحریک چلائیں گے۔ امریکہ اور فرانس دونوں ہمارے اس نقطۂ نظر سے اتفاق کرتے ہیں۔"

"لارڈ کرزن کی منطق میری سمجھ میں آ گئی۔ ہم سب قرارداد کے اس مسودے پر متفق ہو گئے جو لارڈ کرزن نے تیار کیا تھا۔ یہ قرارداد سان ریمو کی کانفرنس میں پیش ہوئی اور بھاری اکثریت سے منظور ہو گئی۔"

وائیزمین کی یہ کتاب ایک تاریخی دستاویز ہے۔ عرب ممالک اس سے سبق حاصل کر سکتے تھے لیکن انھوں نے اپنے مشترکہ دشمن کو اچھی طرح سے پہچاننے کے وجود اپنی صفوں میں اتحاد پیدا نہ کیا قیادت کی کشمکش، محدود مفادات کے ٹکراؤ اور نظریاتی مرکز کے عدم وجود نے عرب ممالک کو ایک دوسرے سے الجھائے رکھا۔ اسرائیل عالم

وجود میں آگیا۔ فلسطین کے مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکال دیا گیا۔ وہ فلسطین جس کی حرمت پر لاکھوں مسلمانوں نے اپنی جانیں قربان کی تھیں وہ فلسطین جسے مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھیننے کے لئے مغرب نے دو سو برس تک صلیبی جنگیں لڑیں تھیں۔ وہ فلسطین جسے فتح کرنے کی حسرت نہ جانے کتنے جان نثارانِ صلیب کے لئے پیغام اجل ثابت ہوئی تھی۔ اسی فلسطین کے مسلمان مغربی ڈپلومیسی کا شکار ہو کر غریب الوطن ہوگئے۔

مشرق وسطیٰ کی حالیہ جنگ کے بعد مغربی اخبارات نے صرف عربوں ہی کو نہیں دنیا بھر کے مسلمانوں کو تختۂ تضحیک بنایا ہے۔ اس جنگ سے پہلے مغربی پریس اپنے سیکولرزم کا بھرم رکھنے کے لئے مشرق وسطیٰ کے بحران کو "عرب ممالک" اور اسرائیل کی کشمکش کا درجہ دیتا تھا۔ لیکن جنگ کے بعد جب سے بیت المقدس پہ اسرائیل کا قبضہ ہوا ہے مغربی پریس اپنی "لغت" سے لفظ "عرب" خارج کرتا جا رہا ہے۔ اور اس کی جگہ بڑی شان سے لفظ "مسلم" استعمال کر رہا ہے یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ اس سے ایک خاص ذہنیت کی عکاسی ہوتی ہے۔

کیا اب بھی عرب ممالک ایک نظریاتی مرکز پہ جمع ہو کر اپنی فکری اور عملی صلاحیتوں کو متحد اور

بقیہ صـ ۲۰۶ پر

علامہ انور صابری

•

مصریوں پر یورشِ اشرار کی پروا نہ کر
قومِ اسرائیل کی یلغار کی پروا نہ کر

پیکرِ روحِ صلاح الدین ایوبی ہے تو
دشمنانِ خطۂ اغیار کی پروا نہ کر

ہے تری شمشیر پر تکبیر کے نعروں کی آب
مردِ مومن تو کسی تلوار کی پروا نہ کر

تیرے سینے میں اگر ہے حیدرانہ زندگی
شر پسندانِ جہاں کے وار کی پروا نہ کر

بڑھ کے سوئے بیت المقدس اپنا لہرا دے علم
اے مجاہد جادۂ دشوار کی پروا نہ کر

نیل کی موجوں میں کر دے غرق ہر فرعون کو
اب کسی مردودِ ناہنجار کی پروا نہ کر

ہے مداوا جس کا تیرے بازوؤں میں خود نہاں
ایسے ہمت آزما آزار کی پروا نہ کر

جذبۂ ہمدردیِ قلبِ جواہر کی قسم
گرمیِ ہنگامۂ پیکار کی پروا نہ کر

فتح و نصرت چوم لیگی خود بخود تیرے قدم
ناصر الملت، صفِ اغیار کی پروا نہ کر

شیخ سُرور الصبان
جنرل سکریٹری رابطۂ عالم اسلامی

مسلمان جہاد کیلئے اُٹھ کھڑے ہوں

اسرائیل نے سرکشی اور ظلم و زیادتی کی راہ اپنائی ہے۔ کسی حد پہ نہ رکنے والی اس کی حرص و طمع بے نقاب ہو چکی ہے، عالمی رائے عامہ کی مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس نے بیت المقدس کے پرانے شہر پر تسلط قائم کرکے اعلان کیا ہے کہ یروشلم کا اٹوٹ انگ ہے، مزید برآں اس نے مسجد اقصٰے پر اسرائیلی پرچم کو لہرایا اور مغاربہ کے محلہ کو جس کے دامن میں یہ مسجد ہے اور جس کے اندر دیوار گریاں واقع ہے، تباہ و برباد کردیا۔ اسی طرح اس نے عربوں کے محلہ کو جسے یہودی محلہ کے نام سے پکارا جاتا تھا، برباد کرکے مکانات کو زمین بوس کردیا۔

اسی طرح اسرائیل اپنے مجرمانہ ارادوں کو مکمل کرنا چاہتا ہے وہ مسجد اقصٰے کی بنیادوں پر ہیکل سلیمانی کی دوبارہ تعمیر کرنا چاہتا ہے اور اس مبارک سرزمین سے اسلام کے ہر نشان کو مٹا دینا چاہتا ہے۔ اسرائیل نے ابھی تک جو کچھ کیا ہے اسی پر اکتفا کرنا نہیں چاہتا ہے بلکہ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ بیت المقدس کے شہریوں کے تئیں اس نے خوف و ہراس پھیلانے، شدید دباؤ ڈالنے اور دہشت زدہ کرنے کی پالیسی اپنا رکھی ہے۔ تاکہ وہ مجبور ہوکر ترک وطن کرنے پر آمادہ ہو جائیں چنانچہ شہر کو اشیاء خورد و نوش سے خالی کردیا گیا ہے۔ کرفیو لگا دیا گیا ہے۔ اسرائیلی پولیس اور فوج کی گشت جاری ہے۔ یہ گشتی دستے ذخیروں، دکانوں اور گھروں پر اچانک چھاپے مارتے ہیں۔ اور تمام چیزوں کو لوٹ کر ان جگہوں کو ویران بنا دیتے ہیں۔ ہلکی اور دیہی صنعتوں کے مرکز کو تباہ کردیتے ہیں۔ تاکہ یہاں کے کاریگر زندگی کے ہر مادی سہارے سے محروم ہو جائیں۔

اسی کے ساتھ ساتھ ان لوگوں نے حمل و نقل اور مواصلات کے ان تمام سلسلوں کو بھی برباد کردیا ہے جو بیت المقدس کو دوسری آبادیوں اور پڑوس کے علاقوں سے ملاتے ہیں تاکہ اس مقدس شہر کے باشندوں کو ان جگہوں سے بھی کوئی غذائی امداد نہ پہونچ سکے۔

اسرائیل کے پس پشت صیہونیت جو کچھ کر رہی ہے ۔ اس کی جرأت اسے ہرگز نہ ہوتی اگر اس پر یہ بات واضح نہ ہو گئی ہوتی کہ چھ کروڑ عرب مسلمان ناکامی اور کمزوری کے گھیرے میں آ گئے ہیں ۔ ان لوگوں نے دنیا کے لئے دین کو فراموش کر دیا ۔ اللہ کو بھول گئے اور اب اللہ نے بھی انھیں فراموش کر دیا ۔ اور اپنی ذلیل ترین مخلوق کو ان پر مسلّط کر دیا ۔

اسلام کے نام لیواؤ

کیا دین کا سوتا دلوں میں سوکھ گیا ہے؟ کیا ایمان سینوں سے الگ ہو گیا ہے؟ کہ ہزیمت کو شیریں گھونٹ سمجھ کر پی لیا اور ناکامی اور عار پر رضامندی کی مہر لگا دی ۔ رابطہ عالم اسلامی بیت المقدس کے باشندوں کے ساتھ اسرائیل کے وحشیانہ اور درندانہ جرائم پر پوری شدت سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے اور پوری امت مسلمہ کو اس کے رہنماؤں اور سربراہوں کو اور مسلم انجمنوں کو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کے لئے آواز دے رہا ہے ۔ پس چل پڑو جس حال میں ہو اور مقدس جنگ کا اعلان کر دو ۔ اور اپنے دین اور اپنے عقیدے اور اپنے پہلے قبلہ اور تیسرے حرم اور معراج کی منزل اولین کی دفاع کے لئے جانوں اور مالوں کی قربانی کو سستی قربانی سمجھو تاکہ یہ مقدس شہر ناپاک صیہونیت کی نجاست سے پاک ہو سکے ۔

"اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ
تمہاری مدد کرے گا ۔ اور تمہیں ثابت
قدمی کی توفیق دے گا ۔"

مسلمانو! اسرائیل نے اپنی تازہ جارحیت کے روپ میں جو حرکت کی ہے وہ ایک خطرناک تمہید ہے ۔ اور یہ علامت ہے کہ وہ اسلام کے ان مقدس مقامات کو نگل جانا چاہتا ہے جو دوسرے اسلامی ممالک میں واقع ہیں ۔

کچھ ہوش بھی ہے تم کو عزیزانِ بے خبر
اٹھو کہ نعرہ زن ہیں نقیبانِ کفر و شر
ان ظالموں کی ارضِ نبیؐ پہ جھکی ہے نظر
اب جنگ فرضِ عین ہے جس سے نہیں مفر
سونے پڑے ہیں مسجد اقصےٰ کے بام و در

— عطا الرحمٰن وجدی

عراقی علماء کی اپیل

اللہ کی راہ میں لڑنا مقدس فریضہ ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ :-

"مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اس لئے تم اپنے بھائیوں میں امن وسلامتی رکھو اور اللہ کی طرف سے عائد کردہ فرائض کو بجالاؤ۔ تاکہ اللہ تبارک وتعالیٰ تم پر مہربانی اور رحم کرے"

اسی طرح اللہ کے رسولؐ کا ارشاد ہے۔

"مسلمان اپنے تعلقات میں ایک ہی جسم کے اعضا ہیں۔ اور آپس میں ایک دوسرے سے مہربانی اور محبت کا سلوک کرتے ہیں"

برادران اسلام!

خداوند قدوس کے دشمنوں نے جن میں عیسائی اصیہونی، یہودی اور برطانیہ وامریکہ کے سامراجی شامل ہیں، اسلام کے خلاف جنگ کا آغاز کردیا ہے، اور انھوں نے مقدس مقامات پر غاصبانہ اور غیر قانونی قبضہ کر لیا ہے۔ انھوں نے اس مقدس سرزمین پر قبضہ کیا ہے۔ جس کا پیغمبر اسلام سے گہرا تعلق ہے۔ اور مسلح جارحیت سے بیت المقدس کو غصب کرکے مسجد اقصےٰ پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور قُبَّۃُ الصخرا پر صیہونی پرچم لہرا دیا ہے۔ اور انہوں نے مسلمانوں کا قتل عام کیا ہے انھوں نے ننھے بچوں، عورتوں، ضعیف اور بے گناہ لوگوں پر بھی رحم نہیں کیا۔ رہائشی مکانوں اور ہسپتالوں کو زمین دوز کردیا ہے۔ اور دوسرے تباہ کن ہتھیاروں کے ساتھ نیپام بموں کا بے رحمی سے استعمال کیا ہے!

برادران اسلام!

دشمنان اسلام کی یہ کامیابی وقتی ہے اور ان کے وحشیانہ مظالم مسلمانوں کے حوصلہ کو پست نہیں کرسکتے مسلمانوں کی جد وجہد اس وقت تک جاری رہے گی جب تک وہ اپنے علاقہ کا ایک ایک اِنچ واپس نہیں لے لیتے اور بیت المقدس کو واگذار نہیں کرالیتے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

"ولا تہنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین" اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ وعدہ ضرور پورا ہوگا، بشرطیکہ ہم متحد ہوکر ایک دوسرے کے ساتھ پہلو بہ پہلو صف آرا ہوجائیں۔ ہم تیاریاں کریں اور کسی قسم کی جانی ومالی قربانیوں سے گریز نہ کریں۔

اسرائیل اور اس کے اتحادی مسلمانوں کی متحدہ فوجوں اور طاقت کے سامنے ایک لمحہ بھی نہیں ٹھہر سکیں گے۔

اس المیہ کے بعد مسلمانوں کے الگ الگ رہنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ اور وہ اپنے مقدس مقامات کی واگذاری کے لئے ایک ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے امتیو! آگے بڑھو، خدا کے سپاہیو! قدم بڑھاؤ، فرزندانِ اسلام! بڑھتے رہو حتیٰ کہ فتح تمہارے قدم چوم لے۔

برادرانِ اسلام۔ اب یہ عرب مسلمانوں کا مسئلہ نہیں رہا۔ بلکہ یہ سارے عالمِ اسلام کے حل کرنے کا مسئلہ ہے۔ اور کامیابی کے لئے دو لوازمات کی تکمیل ضروری ہے۔

(۱) یہودیوں نے ۵ رجون ۱۹۶۷ء کے حملہ کے بعد جن علاقوں پر قبضہ کیا ہے انھیں غیر مشروط طور پر خالی کرایا جائے اور اس سلسلے میں انھیں کوئی رعائت نہ دی جائے۔ جیسا کہ وہ مستقل معاہدہ امن اور بیت المقدس کو بین الاقوامی شہر قرار دینے کا مطالبہ کر رہے ہیں،

(۲) اسرائیل کو ختم کر دیا جائے کیوں کہ اسرائیل کا وجود خواہ وہ ایک بااختیار حکومت کی صورت میں ہو یا یہودیوں کے "ہوم لینڈ" کی صورت میں۔ قابلِ برداشت نہیں۔ یہ ان ہزاروں مسلمانوں کی زندگیوں کا قصاص چکانے کے لئے ناگزیر ہے اور یہ اسلامی فرض ہے۔

ان دونوں تجویزوں پر فوری عمل ہونا چاہیئے اور ان کے فوری اور کارآمد نتائج برآمد کئے جائیں۔ اگر مسلمان زندہ رہنا چاہتے اور اسلام کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو یہ ناگزیر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب کوئی جارح اور غیر مسلم طاقت مسلمانوں کے کسی ایک حصہ پر حملہ کر کے قبضہ کرلے تو ہر مسلمان پر جہاد فرض ہوتا ہے۔ اب جبکہ اللہ کے دشمن مقدس سرزمین میں داخل ہو چکے ہیں۔ عمل کا لمحہ آگیا ہے، اور جیسا کہ فرمانِ خداوندی ہے۔

"اور مشرکوں سے جنگ کرو جب وہ تم سے برد آزما ہوں اور یاد رکھو کہ اللہ ان کا ساتھ دیتا ہے جو اس کی عائد کردہ ذمہ داریاں ادا کرتے ہیں۔"

نیز یہ کہ:

اور اللہ کا وعدہ یقیناً پورا ہوگا۔ مسلمانوں کی فتح کا دن قریب آرہا ہے اور وہ لمحہ جلد آنے والا ہے۔ جب اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے دلوں کو کامیابی کی خوشیوں سے ہمکنار و لبریز کر دے گا۔

ہم عراقی، جو نبی اقدس کے خاندان اور ساتھیوں کی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں، آپ کو قدس شریف کے چھن جانے کا المناک واقعہ یاد دلاتے ہوئے، عرض کرتے ہیں کہ فرمان خداوندی کے مطابق "وتوصوا بالحق وتوصوا بالصبر"
"وذکر فان الذکری تنفع المومنین"
نیز درخواست کرتے ہیں کہ اس نازک لمحہ میں عرب بھائیوں کی مدد کے لیے آؤ۔

یہ اپیل کرتے ہوئے ہم آپ کی فوری توجہ اور بوقت ضرورت عمل کے لئے چند تجاویز پیش کرتے ہیں، یاد رکھو کہ جیسا اللہ تعالیٰ کے رسول نے فرمایا ہے۔

"اللہ کے لئے لڑنا مقدس فریضہ ہے"۔

تجاویز

(۱) تمام مسلمان حکومتیں فلسطینی مسئلہ کے حل کو ایک مذہبی فریضہ قرار دیں، جو بین الاقوامی مواعید سے کسی صورت متاثر نہ ہو۔

(۲) اسرائیل کے ساتھ تجارت، سیاست، یا ثقافت گویا کسی شکل اور کسی صورت میں بھی دوستانہ تعلقات قائم نہ کئے جائیں

(۳) فلسطین کو یہودی نوآبادیات سے نجات دلانے کے لئے پوری مدد دی جائے۔ اور ضروری تیاریاں کی جائیں سب سے اہم اقدام یہ ہے کہ روز مرہ زندگی کے تمام میدانوں میں اسلامی اصولوں کے مطابق خدا پر پورا اعتماد بحال کیا جائے اور مادی صورت میں ہر ممکن امداد دی جائے۔

(۴) اس مسئلہ کے منصفانہ اور فوری حل کے لیے اپنے تمام ذرائع کو مجتمع کرنے کی خاطر تمام مسلم ممالک بشمول عرب ممالک میں مسلسل گہرا اور موثر رابطہ قائم کیا جائے۔

(۵) مسلم ممالک کے نمائندے صیہونی جارحیت کے شکار فلسطینی مہاجرین کے کیمپوں کا معائنہ کریں۔ تاکہ وہ بچشم خود ان کی قابلِ رحم حالت اور صیہونی مظالم کا اندازہ کر سکیں۔

(۶) تمام اسلامی ممالک کے جملہ تدریسی اداروں اور کالجوں میں قضیۂ فلسطین کے تمام پہلوؤں بالخصوص صیہونی یہودیوں کی جارحیت اور مظالم سے روشناس کرانے کے لئے تدریسی پروگراموں کا انتظام کیا جائے۔

(۷) اسرائیلی جارحیت کا شکار ہونے والوں مہاجروں زخمیوں اور بے گھروں کو فوری طور پر مالی طبی اور ہر قسم کی مادی امداد فراہم کی جائے۔

(۸) قضیۂ فلسطین کے فوری اور قطعی فیصلے اور اسرائیلی جارحیت کے اثرات کو مٹانے کے لئے

ہر اسلامی ملک فوجی اور متحدہ اقدامات کے اخراجات کے لئے ایک مخصوص فنڈ قائم کرے۔

(۹) ہر ملک میں ایک فلسطین فی کس یا اس کے برابر کے نام ایک خاص ٹیکس وصول کیا جائے۔ یہ ٹیکس سرکاری ملازمین کی تنخواہوں سے مواصلات کے کرایوں یا ہوٹلوں میں غذا کے بل کے ساتھ وصول کیا جاسکتا ہے۔

(۱۰) تمام اسلامی ممالک میں فلسطین کے المیہ کی یاد میں ڈاک کے خصوصی ٹکٹ جاری کئے جائیں۔

(۱۱) طلبا کی تنظیمیں مسئلہ فلسطین کو آگے بڑھانے کے لئے خصوصی کمیٹیاں قائم کریں۔

(۱۲) مسلم ثقافتی انجمنیں اپنے مقاصد میں "آزادی فلسطین" کو بھی شامل کریں یہ تنظیمیں اس سلسلے میں اجتماعات منعقد کرنے اور لوگوں کو اس قضیہ سے روشناس کرانے کا اہتمام کریں۔ مسلم ممالک کے اخبارات اور رسائل قضیۂ فلسطین کی تشہیر کریں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن اپنے پروگراموں میں ایسے فیچر اور نظمیں شامل کریں، جن میں فلسطین کے مہاجرین پر مظالم ان کی جائیداد کی تباہی اور مقدس مقامات بالخصوص مسجد اقصیٰ کی بےحرمتی کے مناظر ہوں۔ تاکہ مسلمانوں کو ان کے مذہبی فریضہ کی یاد دلائی جائے۔

(۱۳) آئندہ جدوجہد میں حصہ لینے کے لئے نوجوانوں پر مشتمل دستے سرکاری نگرانی میں ترتیب دیئے جائیں۔

یہ تجاویز نہایت اہم ہیں۔ اور ان پر عمل ہماری کامیابی اور اللہ کی تائید و نصرت کا ضامن ہے۔

ایمان والے

"یہاں ایمان والوں سے وعدہ کیا گیا ہے کہ اگر وہ اللہ کے دین کی مدد کریں گے یعنی دین کو طریق زندگی بنائیں گے اور دین کے تمام تقاضوں کو پورا کریں گے تو اللہ بھی ان کی مدد کرے گا، اور وہ کبھی ذلیل نہ ہوں گے، تقاضوں میں طاقت کا حصول بھی ہے، اتحاد بھی ہے، اختلاف سے بچنا بھی ہے، کوشش اور جدوجہد بھی ہے۔ دشمنوں سے ہوشیار رہنا بھی ہے، جان پر کھیل کر اپنی حفاظت بھی ہے، ان تمام تقاضوں کو پورا کرنے کے بعد اللہ کی مدد بھی شامل حال ہوگی اور ایمان والے سربلند بھی رہیں گے۔" (۳۶ پ ۲۵)

مس سعدی عبداللہ
صدر انجمن خواتین شام

ہم بہنوں سے مخاطب ہیں

شامی خواتین اپنا یہ فرض سمجھتی ہیں کہ وہ نہ صرف عرب بلکہ ساری دنیا کی مستورات کو ان تازہ واردات سے باخبر رکھیں جن سے انہیں نوآبادیاتی نظام، سامراج اور ان کے پٹھو اسرائیل کے خلاف جدوجہد کے نتیجے میں سابقہ پڑا ہے

انیسویں صدی کی ابتداء سے سامراجی طاقتوں کی ملی بھگت اپنی مقصد برآری کے لئے عرب سرزمین پر طرح طرح کے چولے بدل کر حملے کرنے اور نفاق کے بیج بوتے کی سازش میں مبتلا ہے۔ اس سازش کی سب سے قاتل کڑی نام نہاد اسرائیلی حکومت کا قیام ہے جس کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ عرب کے دل یعنی انتہائی اہم حصے پر سامراجیوں کا قبضہ رہے۔ اور یہاں سے یہ لوگ ہمیشہ عرب ممالک کے خلاف کبھی اعلانیہ اور کبھی پس پردہ وہ تمام سرگرمیاں جاری رکھیں جو بیدار عرب کی رکاوٹ بن سکیں۔ اور انھیں اپنا مستقبل آپ سنوارنے کے حق سے محروم رکھ سکیں۔

اپنے اس منصوبے کو کامیاب بنانے کے لئے سامراجیوں کی ملی بھگت نے تمام انسانی اصول اور بین الاقوامی ضابطے کو نظر انداز کر دیا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لاکھوں عرب عوام جو اپنے گھروں میں پرسکون زندگی گذار رہے تھے انھیں اپنا گھر اور سرزمین چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اور ان کی جگہ چار دانگ عالم سے صیہونیوں کو سمیٹ کر یہاں آباد کر دیا گیا۔

پچھلے بیس برسوں سے شام اور دوسرے عرب ممالک میں پناہ گزین فلسطینی مہاجر اپنے وطن کو دشمنوں کے قبضے سے دوبارہ حاصل کرنے کے لئے تمام پرامن طریقے استعمال کر رہے ہیں۔ اور اس جائز مطالبے کے جواب میں انھیں اسرائیل کے مسلسل حملوں کا نشانہ اور جبر و ظلم کا شکار ہونا پڑ رہا ہے۔ دوسرے عرب ممالک کو جاتے دیجئے صرف شام کی سرزمین پر اسرائیلی حملوں کا حساب لگایا جائے تو ان کا شمار چار ہزار آٹھ سو تک پہنچتا ہے۔

آج دنیا کی تمام حریت پسند قوموں پر یہ اچھی طرح واضح ہو چکا ہے کہ فلسطین کا مسئلہ تمام عرب

کا مسئلہ ہے ۔ عرب طبعاً ایک صلح پسند قوم ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اسی سرزمین پر ان تمام مذاہب کا ورود ہوا جن پر آسمانی کتابیں نازل ہوئیں عرب ہونے کی حیثیت سے ہمارے لئے یہودیت زیادہ نزاعی مسئلہ نہیں ہے دراصل ہم اسرائیل کے خلاف ہیں اس لئے کہ اسرائیل سامراجیوں اور صیہونیوں کا آلہ کار اور اڈہ بنا ہوا ہے ہمارا یہ تجزیہ نسلی بنیاد پر نہیں ہے ۔ اس لئے آج بھی عرب سرزمین پر مختلف فرقے اور مذاہب کے افراد ایک ساتھ چین کی زندگی بسر کر رہے ہیں دوسرے مذاہب کے سلسلے میں ہمارا یہ رویہ یقیناً ہمارے حقیقت پسند طرز عمل اور ہماری امن پسندی کی دلیل ہے ۔ اگر تاریخ عرب اٹھا کر دیکھی جائے تو یہ بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ عالمی تہذیب وتمدن کی تعمیر میں دور بہ دور ہم عربوں کی خدمات گراں قدر رہیں کیا ہم آج اسی ناطے تمام دنیا کے ترقی پسند عناصر اور آزادی سے محبت رکھنے والوں سے یہ سوال کر سکتے ہیں کہ ہماری خدمات کا یہی صلہ ہونا چاہیئے تھا کہ ہمارے سروں پر نازیوں کی بلا مسلط کر دی جائے ۔

ہماری عرب بہنو! اور ہماری تمام دنیا میں رہنے والی بہنو! آپ کو شاید معلوم ہو کہ دوسری جنگ عظیم کی ابتداء کے ساتھ عرب ممالک میں صرف سماجی نقطہ نظر میں ترقی پسند تبدیلی آئی بلکہ انقلابی تحریکوں کو بھی فروغ حاصل ہوا ۔ جس کے نتیجے میں بیشتر عرب ممالک میں ترقی پسند انقلابی حکومتیں قائم ہوئیں ان حکومتوں کے قیام پر تمام استعمار پسند طاقتیں چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح تلملا اٹھیں انھوں نے عرب سرزمین میں اس خوش آئند تبدیلی کو اپنی سیاسی اور اقتصادی اجارہ داری کے خلاف ایک خطرہ تصور کیا ۔ ان کا یہ ردِ عمل متوقع تھا ۔

اور اس حقیقت سے بھی آپ کی نگاہیں آشنا ہوں گی کہ عرب تیل کے استحصال کے لئے سامراجی ہاتھ آج کھلے ہوئے ہیں ۔ بہ الفاظ دیگر عرب کی واحد دولت پر مختلف معاہدات کے روپ میں ایسا غاصبانہ قبضہ ہے کہ عرب عوام اپنی اس دولت کے سراغ اور حصول کے حق سے بھی محروم ہیں ۔ اور ان کی اس زمین دوز سرمائے کے مالک کل ہونے کی خواہش بھی سزا کے قابل سمجھی جاتی ہے ۔

عرب تیل پر اپنا غاصبانہ قبضہ جاری رکھنے کے لئے سامراجیت ایک طرف تو نئی انقلابی حکومتوں کے خلاف سازش کا جال پھیلا رہی ہے ان کا تختہ الٹ دینا چاہتی ہے دوسری طرف سامراج کی پیدا کردہ صیہونیت کو اسرائیل میں قوی تر کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور اپنے ان مقاصد میں کامیابی کے لئے مسلسل اور باقاعدگی سے اسرائیلیوں کو نہ صرف اسلحہ فراہم کر رہی ہے بلکہ ہر طرح کی اقتصادی

اور اخلاقی مدد پہنچا رہی ہے۔ ان تمام تر امداد کے پس پردہ سامراجیوں کا بس ایک ہی مقصد ہے وہ یہ کہ مشرق وسطیٰ میں موقع بموقع اپنی جارحانہ کارروائیوں کے لئے اسرائیلی فوجی قوت استعمال کرتا ہے۔

سامراجیوں کے ایماء اور مدد کی یقین دہانی کے بل بوتے اسرائیلیوں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ یعنی تمام عرب ممالک سے چھیڑ چھاڑ شروع کردی اور انھیں جارحانہ کارروائیوں کی دھمکی دینے لگے۔ مئی ۱۹۶۷ء کے آخر میں یہ سلسلہ اس وقت اپنے عروج پر پہنچا جب اس نے شام کی انقلابی حکومت اور عرب کی دوسری حکومتوں کے تختے الٹنے کی سازش سوچی اور ان پر بڑے حملے کرنے کا برملا اظہار کرنے لگا۔

اس حملے کا مقابلہ کرنے کے لئے عرب ممالک کے پاس سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ یہ لوگ اپنے مشترکہ دشمن کے خلاف آپس میں متحد ہو جائیں۔ اور حفاظتی اقدامات کے تحت عرب جمہوریہ کی حکومت نے خلیج عقبہ میں متعین اقوام متحدہ کی فوجوں کو یہ علاقہ خالی کرنے کے لئے کہا تاکہ حکومت یہاں کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لے۔ عرب جمہوریہ کا یہ فیصلہ قطعی جائز تھا۔ پھر بھی سامراجی قوتیں اس پر در پردہ بھڑک اٹھیں اور پانچ جون کو صیہونیت کے علمبردار اسرائیل کے ذریعے عرب سرزمین پر چوری سے حملہ کرادیا۔

اسرائیل کی طرف سے جس کثیر تعداد میں تمام عرب محاذوں پر ایک ساتھ لڑاکا اور بمبار طیارے استعمال کئے گئے تھے وہ اس بات کا کھلا ثبوت ہیں کہ اس کے ساتھ سامراجی گٹھ جوڑ تھا۔ جہازوں کی کثرت کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ دشمن نے مسلسل پانچ دن اور پانچ رات عرب زمین پر بم برسائے یہ بمباری صرف محاذ تک محدود نہ رہی بلکہ اس کی زد میں ہزاروں پر سکون شہری بھی آئے

جن شواہد کی بنا پر یہ کہا جا رہا ہے کہ اسرائیل کے اس سازشی حملے میں امریکہ اور برطانیہ برابر کا شریک تھا وہ حسب ذیل ہیں۔

ہم سب اس سے باخبر ہیں اور یہ صحیح ہے کہ کہ اسرائیل کی فوجی طاقت کسی طرح کم نہیں ہے ایسے خاص مقصد کے لئے سامراجیوں نے منظم کیا ہے لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ تنہا اسرائیل کی مجال اور جرأت نہیں تھی کہ وہ بیک وقت تمام عرب ممالک پر حملہ آور ہوتا اور اس حملہ میں بار بار ایک ساتھ اتنے سارے جہاز استعمال کرتا۔ جب کہ پہلے دن کی فضائی جنگ میں اسرائیلی فضائیہ اپنی ایک تہائی قوت کھو چکی تھی۔ کیا یہ تعجب خیز بات نہیں کہ بجائے اس کے کہ اسرائیلی فضائیہ اس سے کسی تعطل کا شکار ہوتی۔ دوسرے دن

پہلے سے دوگنے ہوائی جہازلے کر حملہ آور ہوئی یہ اعداد وشمار اس بات کی کھلی نشاندہی کرتے ہیں کہ اسرائیل کے پاس جہازوں کے نہ ختم ہونے والے ذرائع موجود ہیں۔

صرف شام کے محاذ پر روزانہ پانچ سو سے ایک ہزار تک حملے ہوائی حملے ہوئے۔ اگر دشمن کے اس حملے کو سامنے رکھ کر اس کی فضائی قوت کا اندازہ لگائیں تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ دشمن کے پاس آٹھ سو سے لے کر ایک ہزار ہوائی جہاز اور کم وبیش اتنے ہی اعلیٰ تربیت یافتہ ہواباز تھے۔ واضح رہے کہ ایک ہواباز ایک دن میں زیادہ سے زیادہ تین پروازیں کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس حقیقت حال یہ ہے کہ اسرائیل کے پاس اتنی بڑی فضائی طاقت نہ تھی۔

دو سے زیادہ مواقع پر اسرائیلی ہوابازوں نے خود اپنے ہی محاذوں پر بمباری کر دی یہ واقعات اس بات کی دلالت کرتے ہیں کہ یہ وہ ہواباز تھے جو رضاکارانہ طور پر باہر سے بھیجے گئے تھے۔ اور یہاں کی فضا سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے اسرائیلی اور مصری پوزیشن کی تمیز بمشکل کر سکتے تھے۔

ایک اسرائیلی ہواباز جسے ہوائی حملہ کے دوران میں شامیوں نے گرفتار کر لیا تھا۔ اس نے بتایا کہ ایک اسرائیلی ہوائی اڈہ پر اس نے خود برطانوی ہوابازوں کی ہوشیاری اور اعلیٰ کارکردگی کے بہت چرچے سنے۔ جنگ کے زمانے میں ہوابازوں اور ہوائی جہازوں کی بہت بڑی تعداد اچانک قبرص کے ہوائی اڈہ پر پہنچی اور وہاں وہ مشکوک نقل وحرکت اور مشتبہ پرواز کرتے دیکھی گئی۔

ایک انگریز ساخت کا کینبرا بمبار شام کی سرحد پر گرا لیا گیا۔ واضح رہے کہ شام کے پاس کینبرا قسم کا کوئی جہاز نہیں تھا۔ پھر اس کینبرے کی موجودگی سے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ یہ کس ذریعے سے استعمال ہوا تھا۔

اسرائیل کے دوسرے بہت سے وہ جہاز جو ہماری گولیوں کا نشانہ بن گئے ان میں کچھ ایسے بھی تھے۔ جو سمندر میں "فضائیہ" کو ولہ سے پرواز کر سکتے تھے۔ اور اسرائیل کے پاس نہ تو کوئی فضائیہ بردار تھا نہ ہی اسے اس کی ضرورت تھی۔ اس لئے جن محاذوں پہ جنگ ہو رہی تھی اس صورت حال میں یہ نتیجہ نکالتے ہوئے دیر نہیں لگتی کہ یہ تباہ شدہ جہاز ان فضائیہ بردار طیاروں سے اڑے ہوں گے جو بحیرہ روم میں پہلے ہی سے اس مقصد کے لئے متعین کئے گئے تھے۔

اپنی اس کارروائی پر پردہ ڈالنے کے لیے امریکہ نے جنگ بندی کے فوراً بعد ہی اسرائیل کو سی ہاک ہوائی جہاز حوالے کر دیئے۔ جو فضائیہ بردار جہاز سے استعمال ہونے کی تمام سہولتوں سے لیس تھے۔ اس

اچانک فراہمی کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ لڑائی میں استعمال ہونے والے اسرائیلی اور امریکی ہاک جہاز کی شناخت میں الجھاؤ پیدا ہو جائے۔ اور یہ امریکی جنگ باز دنیا کو کہہ سکیں کہ "سی ہاک" پہلے سے اسرائیل کے پاس موجود تھے۔

اوپر کے واقعات اور میدان جنگ میں روز روز کے انکشافات اور مشاہدات سے یہ بات اب پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ اسرائیل کی اس فتح کے پیچھے سامراجیوں کی مشترکہ کوششیں کارفرما تھیں اور یہ فتح اسرائیل کی اپنی طاقت کا مظاہرہ نہیں ہے بلکہ اسرائیلی اور سامراجی سازشوں کا نتیجہ ہے جو برسوں سے عرب حریت پسندوں کے خلاف منظم طور پر رچائی جا رہی ہے۔ اس طرح ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ عربوں نے یہ لڑائی صرف اسرائیلیوں سے نہیں لڑی بلکہ انہیں اسرائیل کے پردے میں سامراجیوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ جن کی مجموعی ہوائی طاقت سے عربوں کا کوئی موازنہ نہ تھا۔

تینوں طاقتوں کی ملی بھگت کا ایک شرمناک پہلو یہ ہے کہ اسرائیلیوں نے ۶ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ میں بے دریغ آتشیں بموں یعنی نیپام کا استعمال کیا۔

اس بم کا نشانہ فوجیوں اور غیر فوجیوں دونوں کو بنایا گیا۔ اس طرح اس نے اس بین الاقوامی ضابطہ کی خلاف ورزی کی جس کے ذریعے فوجی ضرورت کے لیے بھی نیپام کا استعمال ممنوع ہے۔ دشمنوں نے جنگ بندی کے بعد بھی شام کے محاذ پر اس مجرمانہ فعل کو مسلسل روا رکھا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں فوجی اور پرامن شہری نیپام کا نشانہ بنے اور جل بھن کر رہ گئے۔ ان کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ انہیں ہسپتالوں میں رکھنے کے لیے جگہ نہیں ہے۔ اس سلسلے میں جو تصاویر اور فلمیں دکھائی جا رہی ہیں وہ اس بات کی مظہر ہیں کہ ہزاروں مرد عورتیں اور بچے "مسخ چہرے، جھلسے ہوئے بدن اور کٹے پھٹے اعضا لیے حیات و موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔

ان آتشیں بموں کے استعمال سے اسرائیل کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ وہ عرب سرزمین پر تباہی مچا دیں۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ عربوں کے اندر سراسیمگی پیدا کریں تاکہ ان کا عزم متزلزل ہو جائے۔ لیکن اسرائیل کا یہ ناپاک حربہ کارآمد نہ ہو سکا۔ ان تمام نامساعد حالات یعنی آگ کی بارش کے باوجود ہماری فوجوں کے عزائم بلند رہے۔ اور اب بھی ہمارے یہ جوان مرد سپاہی اور عام باشندے اس بات پر اٹل ہیں کہ انھیں دشمن سے اپنی سرزمین کا وہ حصہ بہر حال واپس لینا ہے جس پر ان کا غاصبانہ قبضہ ہے۔

حالیہ اسرائیلی جارحیت نے مسجد بیر آباد دیہات کو ل

کے ہزاروں ہزار خاندانوں کو سنگین کی نوک پر بے گھر کیا۔ ان پر نت نئے مظالم توڑے اور ناقابلِ بیان مجرمانہ حملے کیے اور اس طرح انہیں مجبور کر دیا کہ وہ اپنے گھر بار اپنی سرزمین چھوڑ کر شام کے کسی اور حصے میں پناہ لیں، آج دمشق میں پناہ گزینوں کے بیشتر مراکز دشمن کی بدترین جارحیت اور سفاکی کے آئینہ دار ہیں۔

ہماری عالمی خواتین انجمنوں میں شریک بہنو!

ہم شامی خواتین جنہوں نے حالیہ جنگ میں اپنی بہادر فوجوں کے دوش بدوش اسرائیلی جارحیت کا مقابلہ کیا اور جو تہیہ کر چکی ہیں کہ عرب موقف کے حصول میں اپنی تمام تر ذمہ داریوں کو خندہ پیشانی سے قبول کریں گی۔ اب آپ سے لاکھوں عرب بہنوں، ماؤں اور بچیوں کے نام پر درخواست کرتی ہیں کہ آپ اس جارحیت کے خلاف آواز اٹھائیں۔ ہم آپ کو اس عورت ذات کا واسطہ دیتے ہیں جو ہمیشہ سے انسانی حقوق اور ذمہ داری کو اچھی طرح سمجھتی ہے۔ باطل کے خلاف دو بدو نبرد آزما ہونے کی جس کی اپنی ایک شاندار تاریخ ہے اور جو اس بات کی صلاحیت رکھتی ہے کہ دنیا کی رائے عامہ کو ہموار کر سکے۔

ساری دنیا کی خواتین!

ہم آپ سے اپیل کرتے ہیں کہ آپ اس سازش کے خلاف آواز بلند کریں۔ جو سامراجیوں اور صیہونیوں نے عرب سرزمین پر پھیلائی ہے۔ ہم یہ اپیل اس یقین کے ساتھ کر رہے ہیں کہ ساری دنیا کی انصاف پسند قومیں اور روشن خیال اور ایماندار خواتین ہمارے ساتھ ہیں اور وہ ہمارے ان مطالبات کا کھل کر ساتھ دیں گی جو حسب ذیل حقائق پر مبنی ہیں۔

عرب سرزمین پر اسرائیلیوں کے جارحانہ حملہ کی مذمت کی جائے۔ اسرائیل کے اس مجرمانہ فعل کو قابلِ ملامت تصور کیا جائے جس کی وجہ سے لاکھوں پُرامن خاندانوں کو پل بھر کی اطلاع میں گھر سے بے گھر ہونا پڑا ہے۔ اس مسئلہ میں ہم کسی بھی ایسے حل کو قابل قبول نہ سمجھیں جس کا دائرہ عمل محض ان لاکھوں عرب مہاجرین کو توراک پہنچانے اور ان کے سر چھپانے کے عارضی انتظام تک محدود ہو۔ اور نہ ہی ہم اس سلسلے میں ان سامراجیوں کی مداخلت برداشت کریں گے۔ جو دراصل ہم پر یہ آفت اور تباہی لانے کے ذمہ دار ہیں۔

ہزار بار مخالف کی یورشیں ہوں مگر
مصیبتیں جو پڑیں گی خوشی سے جھیلیں گے
رہِ وفا کے مسافر نہ اب رکیں گے کہیں
حصولِ حق کے لیے جان پر بھی کھیلیں گے

رام پوری

قاری محمد طیب؛

اسلام کا دفاعی نظام

اسلام حق کو برپا کرنے کے لئے آیا ہے۔ وہ حق پرستی کا علمبردار، حریت ضمیر کا نقیب ہے اور تعلیم اسلامی کا یہ تقاضا ہے کہ اہل ایمان اپنے جائز حقوق کے تحفظ کے لئے اپنی ہر متاع عزیز قربان کرنے کے لئے آمادہ رہیں۔ اسلام ان سے آرام و راحت کی قربانی کا مطالبہ کرتا ہے وہ اولاد کی قربانی چاہتا ہے۔ اور وہ مال ومنال کا طلب گار ہے۔ اس کا یہ شدید مطالبہ ہے کہ جب باطل کی قہرمانی طاقتیں اس کے مقابل ہوں تو وہ اپنے ضعف و بے بضاعتی کے باوجود اس کے سامنے سرنیازمندی نہ جھکائے قہار قوتوں کے آگے جو پیشانیاں جھکتی رہی ہیں وہ جسم و دماغ کے اعتبار سے طاقتور سہی لیکن ایمان و عقائد کے لحاظ سے یقیناً کمزور رہی ہیں۔ ایمان اگر کمزور نہیں تو ظاہری کمزوری و ناداری کے تمام احساسات خود بخود مٹ جاتے ہیں۔ جسم کی غلامی بدترین قسم کی غلامی ہے۔ یہ انسانی روح کو مجروح کر دیتی ہے اور اس سے قلب مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔ غلامی ایک ایسا لباس ہے جس پر ذلت وحقارت کے سیاہ دھبے ہوتے ہیں۔ اس لباس سے عزت نفس کا احساس اور حریت ضمیر کا جوہر فنا ہو جاتا ہے۔ جس قوم میں غلامانہ ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے وہ بزدلی اور نکمی بن جاتی ہے۔ وہ اپنے بنیادی حقوق کے تحفظ کا جذبہ اور طاقت کھو دیتی ہے اور وہ دنیا کی ہر طاقت کے آگے سر اطاعت خم کرنے کے لئے آمادہ رہتی ہے۔ پھر صورت یہ ہوتی ہے کہ دنیا کی طاغوتی قوتیں اسے اپنا محکوم بنانے کے لئے ہر طرف سے نرغہ میں لے لیتی ہیں۔ پھر یہ اس کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے قومی شعار۔ قومی روایات اور قومی تہذیب و مدنیت پر آزادی سے قائم رہ سکے۔ پھر جہاں یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ تو وہاں یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک قوم ہو تو باطل کی طاقت کے زیر نگیں اور اطاعت و بندگی اختیار کرے حق کی۔ قرآن نے اپنے آپ کو کمزور سمجھ کر غیر حق کی اطاعت و تابعداری اختیار کرنے کو ظالمانہ فعل قرار دیا ہے۔ ایسا شخص اللہ کا مطلوب نہیں۔ وہ اسلام کا علمبردار نہیں کہلا سکتا۔

وہ حق کا باغی اور دینِ حنیف کا غدار کہلاتا ہے ۔ ایسے مایوس کن اور حوصلہ شکن حالات میں اسلام نے جو حکیمانہ رہبری کی ہے ۔ وہ یہ ہے کہ غلامی کی ذلت آمیز زندگی قبول کرنے کی بجائے ہجرت کرنا چاہئیے ۔ اس نے کسی قیمت پر ایمان سے دست بردار ہونے اور ضمیر کی آواز کو دبانے کی تعلیم نہیں دی ۔ اس کے برعکس ایسے رجحان کو صریحاً ظالمانہ حرکت قرار دیا ہے ۔ اور حکم دیا ہے کہ جو طاقتیں تمہارے دین کی دشمن ہوں تمہاری متاعِ آزادی کو لوٹنا چاہتی ہوں ۔ اور تمہیں محکوم بنا کر رکھنا چاہتی ہوں ۔ تم ان کے خلاف تلوار اٹھاؤ اور جدال وقتال سے دریغ نہ کرو ۔ یہاں تک کہ تم یا تو ان پر غالب آجاؤ یا ہتیار ہو جاؤ ۔ فقہ کی معتبر و مستند کتاب "بدائع الصنائع" میں ہے :۔

"اگر جب اعلان عام ہو جائے کہ دشمن نے ایک اسلامی ملک پر حملہ کیا ہے تو پھر جہاد فرضِ عین ہو جاتا ہے ۔ اور ہر مسلمان پر جو جہاد کی قدرت رکھتا ہو ۔ فرداً فرداً اس کی فرضیت عائد ہو جاتی ہے ۔"

مسلمانوں کے لئے آزادی ایک متاع بے بہا ہے ۔ جب یہ کھو جاتی ہے تو ان کا شرعی نظام بھی معطل ہو جاتا ہے اس لیے اسلامی حکومت پر حملہ کرنا دراصل اسلام پر حملہ کرنے کے مترادف ہے ۔ اور مسلمانوں کی سیاست ان کے دین سے مربوط ہے ۔ اس لئے ان کی سیاسی قوت کو مٹانا ان کے دین کو مٹانے کے برابر ہے ۔

اسلام کا نظام تو اس امر کی رہنمائی کرتا ہے کہ اگر کسی شہر یا ملک پر باطل کی قوتیں حملہ آور ہوں تو محض اس شہر یا ملک کے باشندوں پر اس کا دفاع فرض نہیں بلکہ اگر ان میں دفاع کی پوری قابلیت موجود نہ ہو اور شعائرِ اسلامی کے مٹنے کا اندیشہ ہو تو پھر دنیائے اسلام پر متحدہ قوت کے ساتھ اس ملک کا دفاع کرنا بمنزلۂ فرض کے ہو جاتا ہے ۔ اور ایسے دفاع کو عبادت و بندگی کا درجہ حاصل ہے ۔ اور اس کی فضیلت روزہ اور نماز جیسے اہم ارکانِ اسلام سے زیادہ ہو جاتی ہے اس باب میں قرآن حکیم نے مسلمانوں کو جو چراغِ ہدایت دکھایا ہے وہ یہ ہے ۔

"اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور حد سے نہ بڑھ جاؤ ۔ کیوں کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ۔ اور ان کو مارو جہاں پاؤ ۔ اور ان کو نکالو جہاں سے انھوں نے تم کو نکالا ہے ۔ کیوں کہ فتنہ قتل سے زیادہ بری چیز ہے" ان احکام ربانی سے صاف ظاہر ہے کہ جب مسلمان پر ظلم کیا جائے اور ان پر جنگ مسلط کی جائے تو انھیں اپنی دفاع ضرور کرنی چاہئیے یہی نہیں بلکہ ایسی صورت میں بھی مقابلہ کرنا لازمی ہے جبکہ دشمن مسلمانوں کے وطن یا ان کی کسی زمین کے ٹکڑے پر بھی قابض ہونا چاہتا ہو ۔ اور ان کے جائز حقوق غصب کرنے کی نیت رکھتا ہو ۔ یہ کام یہ بھی بتاتے ہیں کہ اگر کسی ملک میں دشمن مسلمانوں کی حکومت مٹا دے اور انھیں وہاں سے نکال دے تو مسلمانوں کو چاہیئے کہ جب بھی انہیں طاقت میسر آئے وہ اپنا کھویا ہوا ملک اور اقتدار حاصل کریں ۔

مولانا عبد الرشید ارشد

جہاد

علم اللغات میں جد وجہد، محنت ومشقت اور سعی وکوشش کا نام جہاد ہے اور دین کی دعوت کے لئے کوشش کرنا، اعلائے کلمۃ الحق کے لئے قربانی وایثار سے کام لینا، اصلاحِ نفس ومعاشرہ کے لئے مجاہدہ وریاضت کرنا حصولِ رضائے الٰہی کے لئے خلوصِ نیت کے ساتھ سراپا زہد وعبادت بن جانا۔ ملک ووطن کی حفاظت وصیانت انتہائی کاوش وکاوشی کے ساتھ کرنا، حفاظتِ خود اختیاری اور دشمن ملک کے حملوں کا قلع قمع کرنے کے لئے اس پر بھرپور بری، بحری اور فضائی حملے کرنا، اسلام کی نشر واشاعت کے لئے اپنا سب کچھ بیچ دینا عظمتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پرچم بلند کرنے کے لئے بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنا اور اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی کی تبلیغ وترغیب کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دینا اسلامی اصطلاح میں جہاد کہلاتا ہے۔

جہاد، فریضہ جہاد اور عبادت جہاد تمام مسلمانوں اور عالم اسلام کے ہر کلمہ گو متنفس پر فرض ہے صرف معذور ومجبور اور بےکس وبےبس حضرات اس سے مستثنیٰ ہیں۔ جہاد ایک جامع عبادت ہے۔ اور اپنے وسیع مفہوم اور اہم تقاضوں کے ساتھ تمام مسلمانوں کے لیے سبب خیر وبرکت اور باعثِ اجرِ عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سراپا خیر وبرکت اور اجر عظیم کے حصول کی دعوت دی اور جہاد کو فرض قرار دیتے ہوئے فرمایا:۔

(۱) یاایھا النبی جاھد الکفار والمنٰفقین واغلظ علیھم (التحریم آیت ۲۶ اور التوبہ آیت ۹)

ترجمہ: اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد کیجئے اور ان پر سختی سے کام لیجئے۔

(۲) فلا تطع الکٰفرین وجاھدھم بہ جھادا

کبیرا ۵ (الفرقان آیت ۵۲)

ترجمہ: "اے نبیؐ! آپ کافروں کا کہنا نہ مانئیے اور اس (قرآن) کے ساتھ ان کافروں سے بڑا جہاد کیجیے۔"

(۳) یاایھا النبی حرض المومنین علی القتال ط ان یکن منکم الخ (الانفال آیت ۶۵)

ترجمہ: "اے نبیؐ! آپ مسلمانوں کو (کافروں کے خلاف) لڑائی پر ابھاریئے۔ اگر آپؐ کے بیس ثابت قدم مسلمان ہوں گے تو وہ دوسو (کافروں اور دشمنوں) پر غالب آجائیں گے اور اگر آپؐ کے سو ثابت قدم مسلمان ہوں گے تو وہ ہزار کافروں پر غالب رہیں گے۔ کیوں کہ کفار ناسمجھ قوم ہیں۔

(۴) فقاتل فی سبیل اللہ لا تکلف الا نفسک وحرض المومنین ج (النساء آیت ۸۴)

ترجمہ: پس آپؐ اللہ کی راہ میں لڑیئے اور آپؐ ذمہ دار نہیں مگر اپنی جان کے اور مسلمانوں کو لڑائی پر ابھاریئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فریضہ اور عبادت جہاد کا حکم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے تمام امت محمدیہ کو بھی مخاطب فرمایا اور جہاد کی اہمیت و فرضیت کی طرف مکمل طور پر توجہ دلائی اور تمام مسلمانوں کو مجاہد، غازی بننے کا بار بار حکم دیا۔ چنانچہ مصحف مقدس اور قرآن مجید میں ارشاد فرمایا۔

(۱) یاایھا الذین امنوا اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ وجاھدوا فی سبیلہ لعلکم تفلحون ۰ (المائدہ۔ آیت ۳۵)

ترجمہ:۔ اے مسلمانو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اس تک پہنچنے کا (وسیلہ تلاش کرو اور اس کی راہ میں (کافروں سے) جہاد کرو تاکہ تم فلاح اور نجات حاصل کرلو۔

(۲) وجاھدوا فی اللہ حق جہادہ ط (الحج آیت ۷۸)

ترجمہ: اور (اے مسلمانو!) جہاد (محنت) کرو اللہ کے واسطے جیسی اس واسطے محنت کرنا چاہیئے۔

(۳) انفروا خفافا و ثقالا وجاھدوا باموالکم وانفسکم فی سبیل اللہ۔ (التوبہ۔ آیت ۴۱)

ترجمہ: (اے مسلمانو!) ہلکے اور بوجھل (جس طرح) نکلو اور اپنے مال اور اپنی جان سے۔ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرو۔

(۴) کتب علیکم القتال وھو کرہ لکم ج وعسیٰ ان تکرھوا شیئا وھو خیر لکم۔ الخ

(البقرہ آیت ۲۱۶)

ترجمہ: (اے مسلمانو!) تم پر لڑائی فرض کی گئی اور وہ تمہیں بُری لگتی ہے۔ اور شاید کہ تم کو ایک چیز بری لگے۔ اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو اور شاید کہ تم کو ایک چیز بھلی لگے اور وہ تمہارے حق میں بُری ہو۔ اور اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے

(۵) وقاتلوا فی سبیل اللہ۔ (البقرہ آیت ۲۴۴)

ترجمہ: اور (اے مسلمانو!) اللہ تعالیٰ کی راہ میں (کافروں سے) لڑو۔

(۶) وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ط (البقرہ - آیت ۱۹۰)

ترجمہ: اور (اے مسلمانو!) اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور حد سے تجاوز نہ کرو۔

(۷) وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین للہ ط (البقرہ - آیت ۱۹۳)

ترجمہ: اور (اے مسلمانو!) ان (کافروں) سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو جائے اور دین اللہ تعالیٰ کے لئے ہو جائے۔

(۸) وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ (انفال - آیت ۳۹)

ترجمہ: اور (اے مسلمانو!) ان (کافروں) سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو جائے اور دین سارا اللہ تعالیٰ کے لئے ہو جائے۔

فرضیت جہاد اور احادیث

قرآن مجید کی طرح احادیث نبوی میں بھی فرضیت جہاد کا بلا واسطہ اور بالواسطہ حکم ملتا ہے پر سچ تو یہ ہے کہ عبادت جہاد کی ادائیگی کے بغیر مومن کی زندگی ناقص و نامکمل رہ جاتی ہے۔

اسی لئے عہد نبوی اور قرون اولیٰ کے تمام مسلمان سراپا جہاد تھے اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجاہد اعظم حضور کی مقدس زندگی اور آپ کی احادیث اس دعوے کی بیّن دلیل ہیں۔

۱۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "(اے مسلمانو!) مشرکوں کے ساتھ، اپنے مالوں اور اپنی جانوں اور زبانوں سے جہاد کرو" (مسند امام احمد اور نسائی شریف)

۲۔ حضرت مجاشع رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے بھتیجے کو لے کر حاضر ہوا اور میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ہم سے ہجرت پہ بیعت لیجئے۔ آپ نے فرمایا "ہجرت تو اہل ہجرت (مہاجرین) پر ختم ہو چکی ہے" میں نے درخواست کی "پھر آپ ہم سے کسی بات پر بیعت لیں گے؟!" تو

آپؐ نے فرمایا۔ "اسلام اور جہاد پر"۔
(بخاری شریف)

(۳) حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ احد کے دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مجھے اپنے ترکش سے تیر نکال کر عنایت فرمائے اور حکم دیا "اے سعد! تیر چلائے جا تجھ پر میرے ماں باپ قربان ہوں"۔ (بخاری شریف)

(۴) حضرت مسلم بن اکوع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سات مرتبہ جہاد کیا ہے اور نو مرتبہ آپؐ کے بھیجے ہوئے لشکر کے ساتھ رہ کر میں لڑا ہوں۔ ایک بار حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ہم پر امیر تھے۔ اور ایک مرتبہ جناب اسامہ رضی اللہ عنہ ہمارے امیر تھے۔ (بخاری شریف)

(۵) حضرت عبداللہ ابن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تلوار کے زخم کا نشان تھا۔ انھوں نے کہا کہ یہ زخم جنگ حنین کے دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ میرے ہاتھ میں لگا تھا۔ (بخاری شریف)

ہمارا فرض :

مذکورہ بالا مقدس آیات اور متبرک احادیث کی روشنی میں مسلمانانِ عالم کا فرض ہے کہ کشمیر و فلسطین، نائیجیریا اریٹیریا اور قبرص کی آزادی لئے مکار ہندو، ملعون یہودی سفاک انگریز، ظالم ہیل سلاسی اور درندہ صفت میکاریوس اور اہلِ یونان سے فیصلہ کن جہاد کریں۔ بیت المقدس کو واگذار کرنے کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دیں۔ عربوں کے چھینے ہوئے علاقوں کو واپس لینے کے لئے بڑی سے بڑی قربانی پیش کریں۔

مرہ حسنِ کامل ہے بیت المقدس
کہ جلوہ گہہِ دل ہے بیت المقدس

جہاں انبیاء نے پڑھی ہیں نمازیں
یہ وہ کعبۂ دل ہے بیت المقدس

ہر سانس ہے موجِ فصلِ بہاراں
نوائے عنادل ہے بیت المقدس

فلسطین آنکھوں کا تارا ہے زیبا
تو اک مادہِ کامل ہے بیت المقدس

ثریا زیبا

پاکستان اور قضیہ فلسطین

بانیٔ پاکستان بابائے قوم قائداعظمؒ

فلسطین اس وقت ایک تاریک اور نازک دور سے گذر رہا ہے، جب ۱۹۱۴ء کی جنگ شروع ہوئی تو برطانوی حکومت نے انتہائی سنجیدگی سے عربوں کیساتھ وعدے کئے کہ اگر وہ اس کی مدد کریں تو ان کے ممالک میں جنگ کے بعد خود مختار اور آزاد حکومتیں قائم کی جائیں گی، ان ملکوں میں فلسطین بھی تھا۔ ان تمام ملکوں نے اپنا خون بہا کر اور اپنی جانیں نچھاور کر کے انگریزوں کی مدد کی، مسلمان جو وعدہ کر لیں پھر اس کو دنیا کی کوئی طاقت توڑ نہیں سکتی۔ وہ جان دے دیتے ہیں، مگر اپنے الفاظ کو نہیں دیتے۔ جب جنگ ختم ہوئی اور برطانوی حکومت کو فتح حاصل ہوئی تو ان ملکوں نے اپنی آزادی اور خود مختاری کا مطالبہ کیا مگر وہ مواعید اور پیمان شرمندہ وفا نہ ہوئے۔ ان سادہ لوح عربوں کے حصے بخرے کر دیئے گئے کچھ فرانس نے سنبھال لیے اور کچھ انگریزوں نے ۔۔۔ وقت گذرتا گیا عرب اپنے کئے پر پشیمان تھے لیکن انکی جدوجہد برابر جاری رہی ۱۹۳۹ء میں حکومت برطانیہ نے ایک اعلان شائع کیا۔ جس میں فلسطینی عربوں سے کہا گیا تھا کہ ہمیں فلسطین میں یہودیوں کی کچھ تعداد آباد کرنے دو، چونکہ ہٹلر اور اس کے رفقاء کار نے یہودیوں کو اپنے ملک سے مار کر نکال دیا ہے اور برطانیہ اور امریکہ میں یہودی کافی تعداد میں آباد تھے۔ جو نہایت مالدار اور بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز تھے۔ ان کی درخواست پر برطانیہ نے یہودیوں کو اپنے مقبوضہ فلسطین میں آباد کرنے کی اسکیم تیار کی تھی۔ آخر میں برطانوی اور امریکی حکومتوں نے باہمی گٹھ جوڑ سے ایک قرطاس ابیض شائع کیا۔ جس کی رو سے مارچ ۱۹۴۵ء تک یہودی قوم کی ایک خاص تعداد کو فلسطین میں آنے کی اجازت دی گئی تھی ۳۱ مارچ کو شرائط نامہ کی میعاد ختم ہو جانا چاہیے تھی مگر دوسری عالمگیر جنگ کے خاتمہ پر جب اتحادیوں کو اٹلی پر فتح حاصل ہوگئی تو نئے امریکی صدر ٹرومین کی درخواست پر حکومت برطانیہ نے قرطاس ابیض کی میعاد بڑھا دی تاکہ یہودیوں کا داخلہ فلسطین میں بند نہ ہونے پائے۔

یہودیوں کو آباد کرنے کے لیے کرۂ ارض میں فلسطین کا چھوٹا سا ٹکڑا ہی رہ گیا ہے۔ صدر ٹرومین، اسرائیلی حکومت اور برطانیہ انھیں امریکہ یا کینیڈا میں کیوں آباد نہیں کرتے وہ ممالک تو فلسطین کے مقابلہ میں

کئی گنا بڑے ہیں اگر ان کو ہمدردی ہے تو امریکہ میں انھیں با آسانی آباد کیا جا سکتا ہے آسٹریلیا کا اتنا بڑا براعظم بنجر پڑا ہے وہاں آباد کرنا چاہیئے ۔ سارا نزلہ صرف فلسطین پر کیوں گر رہا ہے ۔"

ان مجرموں کے یہ ناپاک ارادے کبھی پروان نہیں چڑھ سکتے ہم برصغیر کے مسلمان بحیثیت مجموعی فلسطینی عربوں اور عرب لیگ کے ساتھ ہیں ۔ ہم اس مقدس جنگ میں اپنے مال اور جانیں قربان کر دیں گے امریکی و برطانوی سامراج کو کان کھول کر سن لینا چاہئیے کہ وہ حق و انصاف کا خون کرنے سے باز نہ آئے تو دیکھیں گے کہ برصغیر کا بچہ بچہ عالم اسلامی کے چھوٹے بڑے مسلمان اپنی جانیں دے کر ان سے ٹکرا جائیں گے ۔ اور فرعون دماغوں کو پاش پاش کر دیں گے ۔

—— بمبئی ۔ ۸ اکتوبر ۴۵ء

برصغیر کے مسلمان حتی المقدور عربوں کی امداد کریں گے وہ اس سلسلے میں سب کچھ کر گزریں گے کیونکہ ہم یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتے کہ فلسطین مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جائے ۔

دسمبر ۱۹۴۵ء

—— نیویارک ٹائمز سے انٹرویو ۔ ۱۳ نومبر

انیگلو امریکی کمیٹی نے ایک لاکھ یہودیوں کو فلسطین میں داخلے کی اجازت دینے کی جو سفارش کی ہے وہ قابل مذمت ہے یہ نہایت بے ایمانی کا فیصلہ ہے اور اس میں انصاف کا خون کیا گیا ہے ۔ عربوں کو چاہیئے کہ وہ ان سفارشات کا مقابلہ کریں اور ایک یہودی کو بھی فلسطین میں داخل نہ ہونے دیں ہم برصغیر کے مسلمان ان کی ہر ضروری امداد کریں گے

—— دہلی ۵ جون ۱۹۴۶ء

فلسطین کے بارے میں ہمارے موقف کی صراحت اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کے سربراہ نے کر دی ہے، مجھے اب بھی امید ہے کہ تقسیم کا منصوبہ مسترد کر دیا جائے گا، ورنہ ایک خوفناک ترین اور بے مثال چپقلش کا شروع ہونا ناگزیر اور لازمی امر ہے یہ چپقلش صرف عربوں اور منصوبہ تقسیم کو نافذ کرنے والے اختیار کے مابین نہ ہوگی بلکہ پوری اسلامی دنیا اس کے خلاف بغاوت کر دے گی ۔ کیونکہ ایسے فیصلہ کی حمایت نہ تاریخی اعتبار سے کی جا سکتی ہے اور نہ سیاسی و اخلاقی طور پر ۔ ایسی صورت میں پاکستان کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ ہوگا کہ عربوں کی کھل کر اور غیر مشروط حمایت کرے اور خواہ مخواہ کے اشتعال اور ناجائز کارروائیوں کو روکنے کے لیے جو کچھ اس کے بس میں ہے پورے جوش و خروش اور طاقت سے بروئے کار لائے ۔

—— رائٹر سے انٹرویو ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۷ء

اس برصغیر کے مسلمان تقسیم فلسطین کے متعلق اقوام متحدہ کے ظالمانہ، ناجائز اور غیر منصفانہ فیصلے کے خلاف شدید ترین لب و لہجہ میں شدید ترین احتجاج کرتے رہے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ برصغیر کے مسلمان امریکہ یا کسی اور ملک کی دشمنی مول لینا

نہیں چاہتے ۔ لیکن ہماری حسِ انصاف ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم فلسطین میں اپنے عرب بھائیوں کی ہر طریقے سے مدد کریں ۔

سے انٹرویو - ۱۹ دسمبر ۴۷ ۱۹ء

شہیدِ ملت خان لیاقت علی خاں

فلسطین میں عربوں کا خون جس طرح بے دریغانہ بہایا جا رہا ہے ، پاکستان اس سے بے تعلق نہیں رہ سکتا ، پاکستان اس کے خلاف شدید ترین احتجاج کرتا ہے ۔ پاکستان نے تقسیم فلسطین کے منصوبے پر واضح کر دیا تھا کہ اس کے نتائج سنگین ہوں گے اور آج ہمارا یہ خدشہ پورا ہوا ہے ۔ پاکستان غیر مشروط طور پر عربوں کی مکمل حمایت کا اعلان کرتا ہے اور وہ عربوں کے شانہ بشانہ لڑنے سے بھی گریز نہیں کرے گا ۔

۲۰ مئی ۴۸ ۱۹ء

یہودیوں نے ایک مرتبہ پھر اپنے ان داناؤں کی شہ پر عربوں کے خلاف ظلم و تشدد کا حشر بپا کر رکھا ہے ، پاکستان کی حکومت اور عوام کو اس سے سخت تشویش ہے ، ہم یہودیوں اور اس کے حامیوں پر واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ اگر یہودیوں کو باز نہ کیا گیا تو اس کا انجام المناک ہو گا ، اور اس کی زد سے یہودی اور ان کے ساتھی بھی نہیں بچ سکیں گے ۔

۱۳ جولائی ۴۸ ۱۹ء

میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اقوام متحدہ نے امریکہ اور برطانیہ کی شہ پر جس "ناجائز بچے" اسرائیل کو جنم دیا ، پاکستان اسے کبھی تسلیم نہیں کرے گا ۔ اس کی پیدائش اس کا وجود ناجائز اور سراسر ناانصافی ہے ۔ میں واشگاف الفاظ میں کہتا ہوں کہ اسرائیل کو عرب اگر تسلیم بھی کر لیں تو بھی پاکستان اسے تسلیم نہیں کرے گا ۔ کیونکہ فلسطین کی ارضِ مقدس صرف عربوں کی سرزمین نہیں بلکہ سارے عالمِ اسلام کی ہے ۔ اسی سرزمین میں مسلمانوں کا قبلۂ اوّل ہے اور پاکستان اسے کبھی برداشت نہیں کر سکتا کہ اس ارضِ مقدس پر ناپاک یہودیوں کے غاصبانہ قبضہ کو جائز تسلیم کیا جائے ۔ میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر اقوام متحدہ نے اس ناانصافی پر اصرار کیا تو اس کے نتائج انتہائی سنگین ہوں گے ۔

اکتوبر ۴۸ ۱۹ء

صدرِ پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں

" پاکستان نے بیت المقدس کے اسرائیل میں ناجائز انضمام کے خلاف اقوام متحدہ میں جو قرار دادیں پیش کی ہیں اور جنہیں عالمی ادارے کی بھاری اکثریت حاصل ہے ، اگر اسرائیل نے ان پر عمل نہ کیا تو عرب ممالک ہمیشہ صف آرا رہیں گے اور مشرقِ وسطیٰ کے حالات مخدوش رہیں گے ۔"

" عرب ممالک کو اپنی منصفانہ جدوجہد

میں پاکستان کی مکمل حمایت اور ہمدردی حاصل ہے، ہم اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ فلسطین میں اسرائیل کا قیام ایک ناپاک سازش کا نتیجہ ہے اور اس نے ہمیشہ عربوں کے خلاف جارحیت کا ارتکاب کیا ہے، ہم اس منصفانہ جدوجہد میں عربوں کے ساتھ ہیں "

"عالمی طاقتوں کو اس امر کا احساس کرنا چاہیئے کہ اگر اسرائیل اپنی ہٹ پہ قائم رہا تو نتائج کسی کے لیے خوشگوار نہیں ہوں گے"

میاں ممتاز محمد دولتانہ صدر پاکستان (کونسل مسلم لیگ)

"اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ مشرق وسطی میں اسرائیلی جارحیت کے باعث جو سانحہ پیش آیا ہے وہ مغربی طاقتوں کا ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا جس کے لیے وہ عرصہ سے کوشش کر رہے تھے۔ عربوں پر حملہ اسرائیل کی طرف سے نہیں بلکہ سامراج کی طرف سے ہوا تھا اس سانحہ کے بعد عربوں ہی کو نہیں بلکہ تمام عالم اسلام کو متحد ہو کر مغربی سامراج کی سازش پر غور کرنا چاہیئے اور ہمیں عربوں کے مسئلہ کو اپنا مسئلہ بنا لینا چاہیئے۔ آئندہ جو بھی اقدام ہو مشترکہ اور مربوط ہونا چاہیئے کیوں کہ الگ الگ رہ کر کوئی بھی اقدام درست نہیں ہو سکتا۔ اس طرح تمام ممالک ایک ایک کر کے مارے جائیں گے۔

پاکستان اس پوزیشن میں ہے کہ عربوں اور اسلامی دنیا کے درمیان رابطہ بن کر ترجمانی کے فرائض انجام دے سکتا ہے۔ پاکستان کے تعلقات عربوں اور دوسرے اسلامی ممالک سے دوستانہ ہیں اس لئے سب کو اکٹھا کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے"

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (امیر جماعت اسلامی)

فوری توجہ طلب مسئلہ یہ ہے کہ ان اثرات ونتائج کا مقابلہ کیا جائے جو اس جنگ میں اسرائیل کی کامیابیوں سے رونما ہوتے ہیں اور جن کے آئندہ رونما ہونے کا خطرہ ہے اسرائیل نے قدیم بیت المقدس پر قبضہ کر لیا ہے اور وہ کھلم کھلا کہہ رہا ہے کہ یہ شہر جس میں ایک یہودی بھی موجود نہ تھا، اب اس بنا پر اسی کے قبضے میں رہنا چاہیئے کہ اس نے لڑ کر اسے حاصل کیا ہے وہ پورے باقیماندہ فلسطین پر بھی قابض ہو گیا ہے جہاں ایک یہودی بھی نہ تھا اور دس لاکھ مسلمان آباد تھے۔ اب وہ مار مار کر مسلمانوں کو وہاں سے نکال رہا ہے اور ان کی جگہ یہودیوں کو لا کر بسا رہا ہے۔ اس کے رہنما اعلانیہ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم نے جو علاقے فتح کیے ہیں، انہیں واپس نہیں کریں گے وہ سلامتی کونسل اور جنرل اسمبلی کی قرار دادوں کو مسترد کر چکے ہیں جن میں بیت المقدس اور مقبوضہ عرب علاقوں سے اسرائیلی فوجوں کے انخلا کا مطالبہ کیا گیا تھا ...

معاملہ صرف فلسطین اور سینا پر ختم نہ ہوگا

بلکہ مزید قدم وہ اردن، شام، مصر اور سعودی عرب کی طرف بڑھائے گا۔ اور اس کی فتوحات کے معنی صرف اتنے ہی نہیں کہ ایک ملک پر وہ قابض ہو جائے بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ وہ اس ملک کے اصل باشندوں کو فنا کر کے یا جلاوطن کر کے ان سے زمین خالی کرائے اور ان کی جگہ دنیا بھر کے یہودیوں کو لا بسائے۔

ان خطرات کا مقابلہ اس کے بغیر نہیں کیا جا سکتا کہ تمام مسلمان حکومتیں اس وقت پورے عزم اور پورے اتفاق کے ساتھ آگے بڑھ کر عربوں کا ساتھ دیں۔ اور دنیا کی دوسری تمام انصاف پسند حکومتوں کی تائید بھی اس ایک اصولی بات کو تسلیم کرانے میں صرف کر دیں کہ کسی جنگی کارروائی کے ذریعے سے ایک قوم کو دوسری قوم کے ملک پر قبضہ کرنے اور تلوار کے زور سے سرحدوں میں رد و بدل کرانے کا حق نہیں ہے اس معاملے میں اگر مسلمان حکومتوں نے ذرا برابر بھی غفلت کی تو اس کا بہت بڑا خمیازہ ایک نہ ایک دفعہ ہم سب کو بھگتنا پڑے گا۔

چودھری محمد علی صدر نظام اسلام پارٹی

عالم اسلام کو درپیش مسائل مسلمان قوموں کے اتحاد کی طاقت ہی سے حل ہوں گے۔ اقوام متحدہ یا بڑی طاقتوں کی اعانت کے ذریعے ان مسائل کا حل ڈھونڈنا بیکار ہے اقوام متحدہ کے ذریعے فلسطین اور مسئلہ کشمیر حل ہونے کی اس لیے امید نہیں کہ اس ادارے کے پاس انصاف کو نافذ کرنے کی کوئی طاقت نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اسرائیل کی جارحیت کے نتیجہ میں مسلمانوں کے علاقے ہاتھ سے نکل گئے ارض مقدس اور قبلۂ اوّل پر اسرائیل کا قبضہ ہو گیا، لیکن شدید رنج و غم کے باوجود ہمت ہارنے کی ضرورت نہیں وہ کمزوریاں دُور کرنا ہوں گی جو اس ذلت و رسوائی کا سبب بنیں اس ضمن میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ مسلمان ملکوں میں جو اختلافات ہیں انہیں طے کیا جائے، عالم اسلام کو متحد کر کے مسلم ممالک کو مضبوط بنایا جائے پھر مسلمان علاقے غاصبانہ قبضہ سے آزاد کرانے کی جدوجہد کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم کامیاب نہ ہوں۔

نوابزادہ نصر اللہ خاں صدر پاکستان عوامی لیگ،

"عرب اسرائیل جنگ کے نتائج ایک بہت بڑا المیہ ہیں، اس شکست کے اثرات صرف مشرق وسطیٰ ہی تک محدود نہیں رہیں گے، بلکہ تمام افریشیائی ممالک بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ عرب ملکوں کا کچلا جانا مغربی سامراج کی دیرینہ مساعی و عزائم کی تکمیل ہے۔ یہ ایک خطرناک صورت حال ہے اس موقعہ پر پاکستان کے لیے اور بھی ضروری ہو گیا ہے کہ ہر موڑ پر، ہر میدان میں عربوں کی وکالت اور ترجمانی کرے اور بہر صورت عرب علاقوں سے اسرائیلی فوجوں کے انخلاء کی کوشش میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کرے۔

اب یہ مسئلہ دوبارہ سلامتی کونسل میں جا رہا ہے اور اگر سلامتی کونسل نے اس معاملہ کو حسب عادت سرد خانہ میں ڈالنے کی کوشش کی تو اس کے نتائج

خطرناک ہوں گے ۔۔۔۔۔۔ یہ لڑائی عربوں اور یہودیوں کے درمیان نہیں تھی بلکہ عربوں کا براہ راست امریکی اور برطانوی سامراج سے مقابلہ تھا جو اسرائیل کی پوری طرح پشت پناہی کر رہے تھے ۔ ایک بات اور واضح ہو گئی ہے کہ عرب قومیت کو ترک کر کے صرف اسلام ہی کو اتحاد کی بنیاد قرار دیا کیوں کہ اسلام ہی انہیں متحد کر اور متحد رکھ سکتا ہے ۔

میاں محمود علی قصوری صدر نیشنل عوامی پارٹی

مشرق وسطیٰ کی صورت حال سے اتنا صدمہ ہوا ہے کہ جو کہ وہیاں کی قوتیں مجروح ہو کر رہ گئی ہیں مسلمانوں پر تاتاریوں کی یلغار کے بعد یہ اتنی بڑی شکست ہوئی ہے کہ کسی اور میدان میں ایسی شکست کبھی نہیں ہوئی تھی کر ترکی سلطنت کو ختم کرنے میں بھی سو ڈیڑھ سو سال کا عرصہ لگا تھا ۔ لیکن اس جنگ نے جو نتائج مرتب کئے ہیں وہ انتہائی تکلیف دہ اور کرب انگیز ہیں ۔

یورپ اور مغربی ممالک کی اسلام دشمنی کھلم کھلا اس جنگ میں رونما ہوئی ، یہانتک کہ جو لوگ امریکہ اور برطانیہ کی سلطنت سے باہر مقابلتہً زیادہ معتدل سمجھے جاتے ہیں انہوں نے بھی جی بھر کر مسلمان دشمنی کا مظاہرہ کیا اور دل کھول کر یہودیوں کی امداد کی ” یہ جنگ عرب اور اسرائیل کی بجائے کفر و اسلام کی جنگ تھی ۔ اس سے تمام مسلمان خواہ وہ کہیں بھی ہوں متاثر ہوئے ۔ یہودی اگر بیت المقدس پر قبضہ کر سکتے ہیں تو مدینۃ النبی اور بیت اللہ شریف بھی ان کی دست برد سے محفوظ نہیں ۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ عرب و عجم کا امتیاز ختم کر دیں ۔“

رفقائے کار کی ضرورت

جامعہ محمدی میں ایسے رفقاء کی ضرورت ہے ! جو اعلیٰ تعلیمی قابلیت رکھنے کے ساتھ ساتھ ایثار پیشہ ہوں ۔ خود اسلامی جذبات رکھتے ہوں اور طلبہ میں اسلامی سیرت آفرینی کے جذبات پیدا کر سکیں ۔

جو ذاتی طور پر اس امر کے خواہاں ہوں کہ ایک آزاد اور اسلامی ملک میں اس کے شایان شان عصری ضروریات کے لیے مکتفی تعلیم جدید کے ساتھ ساتھ تعلیمات کا حسین امتزاج ناگزیر ہے ۔

جو اس کار خیر میں شمولیت کو ملازمت کے گھٹیا نظریہ سے نہیں بلکہ خدمت دین خدمت ملک و ملت اور محض رضاء الٰہی کی خاطر چاہتے ہوں ۔

ایسے ہی خواہان ملت اپنے اس عزم کی خوشخبری کے ساتھ مطلع فرمائیں کہ ان کے گذر اوقات کیلئے کس قدر وظیفہ (الاؤنس) کفایت کر سکے گا ۔ والسلام محمد ذاکر ناظم عمومی جامعہ محمدی جھنگ ۔

ڈاکٹر فاضل الجمالی

فلسطین کے لئے کیا کرنا چاہئیے؟

فلسطین کا مسئلہ عربوں کے لیے ان اولین اہمیتی مسائل میں ہے جو عربوں کے لیے مشرق وسطی کے امن کے لیے بلکہ پوری دنیا کی سلامتی کے لیے خطرہ بنا ہوا ہے اور یہ خطرہ اس وقت تک قائم رہے گا جب تک کہ حق حقدار کو نہ مل جائے۔ بیشک خدا پر ایمان رکھنے والے عربوں کے سینے میں جب تک دلوں کی دھڑکن باقی ہے تب تک یاس و ناامیدی کے تسلط کے لیے کوئی موقع نہیں ہے اور اگر پہلے مرحلہ میں عالمی طاقتوں کے مقابلہ میں عرب مغلوب نظر آرہے ہیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔

تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ فلسطین کئی بار اغیار کے ہاتھوں میں چلا گیا لیکن وہ پھر بھی اپنوں کے پاس آیا خواہ اس کی واپسی میں کچھ دیر ہی کیوں لگی ہو۔ ہم میں سے ہر شخص اسلامی تاریخ میں شجاعت کے اس دور سے واقف ہے جس کا عنوان صلاح الدین ایوبی ہے!

مسئلہ فلسطین کی مشکلات عرب قوم کے لیے ایک آزمائش کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایسی حالت میں عرب جب تک اپنی حالت پر گہری نظر ڈال کر جائزہ نہ لیں گے۔ اور جب تک اصلاح حال کے لیے پختہ عزم نہ کریں گے۔ جب تک اپنی صلاحیتوں کو راہ خدا میں خیر کی تعمیر پر نہ لگائیں گے تب تک ہمارے لیے فلسطین یا دوسرے عرب ممالک میں کامیابی کی امید نہیں کی امید نہیں کی جا سکتی۔

اصلاح حال کا یہ کام فرد سے شروع ہوگا۔ ہم میں سے ہر فرد چاہے وہ حاکم ہو یا محکوم شہری زندگی گذار رہا ہو یا عسکری اس پر لازم ہے کہ وہ پورے خلوص سے اپنی بنیادی اصلاح کی طرف متوجہ ہو اور شخصی اور تاریخی غلطیوں کا اعتراف کر کے اس سے بچنے کا عزم کرے۔

اور اپنی طرز زندگی کو اس طرح بدل دے گویا وہ از سر نو ایک ایسی نئی دنیا میں پیدا ہوا ہے جہاں بھائی چارہ اور رحم دلی ہے اور دوسروں کے ساتھ معاملات میں عزت کی روح ہے۔

پس لازم ہے کہ ہم دوسروں پر تنقید سے پہلے اپنا اپنا جائزہ لیں اور جو اخلاقی اور روحانی امراض ہم میں پیدا ہو گئے ہیں انہیں درست کریں۔ دوسروں کا محاسبہ کرنے سے پہلے اپنا محاسبہ کریں۔ یہی آج ہمارے لئے ضروری امر ہے۔

صادق جامعی

اور اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑ لو

دورِ حاضرہ میں مسلمانوں کی زبوں حالی، نکبت اور بربادی کی داستان محتاجِ وضاحت نہیں۔ چشم فلک نے قوموں کے عروج و زوال اور حادثات والمیے اَن گنت دیکھے مگر اس دور میں مسلمانوں پر جو بیت رہی ہے اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملے گی ایک طرف کشمیر کے مسلمان مظالم مجبور و مقہور ہیں دوسری طرف قبرص کے مسلمان خون کے آنسو رو رہے ہیں۔ قبلۂ اوّل بیت المقدس چھن گیا۔ روحِ عمر رضی اللہ عنہ تڑپ تڑپ گئی، صلاح الدینؒ کے نام کو بٹہ لگا۔ ان ان گنت مجاہدین، غازیوں اور شہیدوں کی روحیں بے چین ہو گئیں جنھوں نے اپنے خون سے اس عظیم الشان عمارت کو تعمیر کیا تھا۔ یہود اور نصاریٰ نے صدیوں کا بدلہ چکا لیا۔ مسلمانانِ عالم کے سر ندامت سے جھک گئے مسلمانانِ عالم کے ماتھے پر کلنک ٹیکہ لگا۔

مسلمان اپنی اس حالت زار پر جس قدر آنسو بہائیں کم ہیں، لیکن یہ داغ اور کلنک کا ٹیکہ آنسوؤں سے نہیں دھلے گا۔ اس زبوں حالی اور نکبت کا درماں، یاوسی و اضطراب نہیں بلکہ اس کے لیے خونِ جگر صرف کرنا پڑتا ہے۔ خاک و خون میں تڑپے بغیر یہ سیاہی دور نہیں ہو سکتی اور سوئی ہوئی قسمت کو جگانے کا بس ایک ہی نسخہ ہے ؎

چراغ زندہ مے خواہی در شب زندہ داراں زن
کہ بیداری بخت از بخت بیداراں شود پیدا

اب ہمارے سامنے اپنی صفوں کو منظم کر کے قومیت و وطنیت کے بت توڑ کر اسلام کے ایک جھنڈے تلے ۔۔۔ قرآن کریم کی ہدایات کے مطابق ۔۔۔ سالارِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرامین کے ماتحت سچے مسلمان اور صرف مسلمان کی حیثیت سے میدانِ عمل میں کود پڑنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ۔۔۔ اور شب زندہ دار اسلاف اور مجاہدین کی پاک زندگیوں کو مشعلِ راہ بنا کر منزلِ مقصود کی طرف بڑھنے کے لیے تن من دھن کی بازی لگا دینا ہی ایک علاج ہے۔

اختلافات کا بہانہ خواہ وہ جزوی ہوں یا بزعم بعض اصولی ۔۔۔ اسلام نے ان کی کبھی اجازت نہیں دی۔ اختلافات کا لفظ ہی اسلام کے لیے غیر مانوس ہے۔ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ

فریب کاری ہے اور اس بات کو کبھی نہ بھولیئے کہ ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن ہے اس کا وہ مذہب کا کفن ہے

یاد رکھیے اگر رب العزت، قادرِ مطلق کے بجائے کسی اور سے امید رکھی گئی تو اصل سہارا ٹوٹ جائے گا۔ اور پھر مادّی دنیا کی جنگ میں پلڑا اسی کا بھاری رہے گا جو اس دوڑ میں سبقت لے جائے گا۔

قرآن مجید نے صاف الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے "یا ایھا الذین آمنوا لا تتخذوا الیھود والنصاریٰ اولیاء بعضھم اولیاء بعض" اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو دوست مت تصور کرو، یہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ ہم نے حالیہ جہادِ فلسطین میں دونوں اصولوں کو آزما لیا۔۔۔۔ یہود و نصاریٰ یکجا ہو گئے اور باہمی تفرقہ بازی کے نتائج بھی دیکھ لیے۔ اگر ہم واضح آیات سے نصیحت حاصل نہیں کر سکتے تو کم از کم پیش آمدہ واقعات سے عبرت ہی حاصل کر لیں۔

کشمیر ہو یا قبرص، فلسطین ہو یا بھارتی مسلمانوں کا مسئلہ عالمِ اسلام کا مشترک مسئلہ ہے۔ وطنیت اور قومیت کے تصور کی اسلام میں کبھی گنجائش رہی ہے نہ ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھ لینے کے بعد عربی عربی نہیں اور عجمی عجمی نہیں بلکہ محض مسلمان ہے۔ اس کا رشتہ ایک اور صرف ایک ہے اور وہ ہے اسلام کا رشتہ۔۔۔۔ اسی لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مسلمان ایک جسم کی حیثیت رکھتے ہیں اور افراد کی حیثیت اعضاء کی ہے۔ جب ایک عضو مجروح ہوتا ہے تو سارا جسم بے خوابی اور بخار سے بے قرار ہو جاتا ہے۔ جس طرح اعضاء درد کی ٹیس محسوس کرنے میں کوئی امتیاز نہیں رکھتے ایسے ہی مسلمانانِ عالم میں عربیت اور عجمیت یا ذات پات کا امتیاز کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ جذبہ ہمدردی کو بیدار کرنا اتحاد و اخوتِ اسلامی کا پیدا کرنا خالص روحانی، مذہبی اور دینی معاملہ ہے۔

علماء کرام مشائخ عظام اور دینی حلقوں کے سربراہوں کو اس کے لیے متحد و متفق ہو کر کوئی موثر لائحہ عمل تجویز کرنا چاہیئے۔ اور چونکہ ممالک اسلامیہ میں پاکستان عظیم سلطنت ہے بنابریں اس مبارک۔ بنیادی اور اہم تحریک اٹھانے کی زیادہ تر ذمہ داری پاکستان پر عائد ہوتی ہے۔ اور یہ اللہ جل جلالہ کا احسانِ عظیم ہے کہ مملکتِ خداداد پاکستان کے عوام اور حکومت اس جذبہ سے عاری نہیں ہر فرد بشر میں یہ احساس بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے جس کے شواہد بیسیوں موجود ہیں۔۔۔ کمی صرف یہ ہے کہ یہ کوششیں انفرادی سطح پر ہو رہی ہیں اور جذبات سینوں میں ابھرتے ہیں مگر اپنی راہیں مسدود پا کر سینہ ہی میں دفن ہو جاتے ہیں۔ بلاشبہ بارش کا ایک قطرہ سوائے اس کے کچھ نہیں کر سکتا کہ کسی راہ گذار میں گر کر اپنی ہستی کھو دے مگر اجتماعی

انداز میں یہی قطرات طوفان بپا کر سکتے ہیں۔

جامعہ محمدی آغاز کار ہی سے اس تحریک کا داعی ہے اس سے قبل بھی متعدد دفعہ اتحاد و اخوت اور اعتصام بحبل اللہ کی دعوت دے چکا ہے اور بدستور اسی راستہ پر گامزن ہے آج پھر یہ سانحے پے در پے قہر الٰہی کی طرح نازل ہو رہے ہیں ان کے پیش نظر نہایت وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ اسلام میں اسقدر سنگین حالات کبھی پیش نہیں آئے اور پوری تاریخ میں مسلمانوں کو کبھی ایسی زبوں حالی سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔ حالات کا رخ ایسا ہے کہ اگر اب بھی نہ سنبھل سکے اور تشتت وافتراق کی (معاذ اللہ) فضا باقی رہی تو وہ دن دور نہیں کہ :

ع تمہاری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

خدارا حالات کی نزاکت کا اندازہ کیجئے وقت کی نبض پر ہاتھ رکھیئے وقت کے تقاضوں کو پہچانیئے اور سر جوڑ کر بیٹھئے ۔ ۔ ۔ اور امت مسلمہ کی نشأۃ ثانیہ کے لیے موثر ترین اقدام کیجئے ۔ ۔ ۔ ۔ اس یقین کے ساتھ قدم اٹھایئے کہ جس خدائے قدوس نے اپنی نعمت خاص سے قرون اولیٰ کے مسلمانوں کو جوڑا تھا آج بھی جوڑ سکتا ہے۔ جس قادر مطلق نے اُن تین سو تیرہ سپاہیوں کو ہزاروں کے لشکر پر فتح مند کیا تھا آج بھی اپنے جاں نثاروں کو فتح یاب کر سکتا ہے ۔ ۔ ۔ بھروسہ ہو تو بس اسی ذات پر ــ اعانت طلب کرو تو اسی سے اس کے ہو رہو اس کے فرمائے ہوئے اصولوں کو پیش نظر رکھو اور اس کے منع کئے ہوئے امور سے اجتناب کرو تو غیب سے وہ طاقت وہ قوت اور وہ اسباب و ذرائع پیدا کر دے گا کہ دین کے دشمن کبھی تمہاری طرف آنکھ نہ اٹھا سکیں گے۔ وہ غیور ہے اس کی غیرت کبھی گوارا نہیں کرے گی کہ اپنے ماننے والوں کو شکست دلوائے اس کے قبضۂ قدرت میں وہ طاقت ہے کہ دورِ حاضرہ کے میزائلوں، ایٹموں اور مہلک ہتھیاروں پر غالب آ جائے۔

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؑ ابتدا ہے اسماعیل

قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں
گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات (اقبالؒ)

ملّی اسلامی یونیورسٹی

صدرِ مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی عظیم قیادت میں ہمارے اربابِ اختیار تعلیمی ترقی کو نہایت اہمیت دے رہے ہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ہمارے معاشرے کی تعمیر ایسی نہج پر کرنا چاہتے ہیں کہ معاشرے کے تمام افراد اپنی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھا سکیں اور باوقار زندگی بسر کر سکیں ۔

ایک ایسی قوم بھی جو نسل یا وطن کی اساس پر قائم ہوئی ہو ۔ زندگی اور اس کے مقاصد کو ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھنے پر مجبور ہوتی ہے ۔ ایک خاص طرزِ فکر و کردار سے آئندہ نسلوں کو آراستہ کرتی ہے لیکن ایک واضح اور جامع نظریۂ حیات رکھنے والی قوم کی بقاء خطرے میں پڑ جاتی ہے اگر وہ اپنے اعتقاد اور مزاج کے مطابق نظامِ تعلیم تشکیل دے کر اپنی ضروریات کے انسان تیار کرنے کا اہتمام نہ کرے ۔

پاکستان کا وجود ایک خاص نظریۂ حیات اور اعتقاد پر استوار ہے لہٰذا اسے اپنے اعتقاد اور مزاج کے مطابق ایک مخصوص طرزِ تعلیم کی ضرورت ہے جو افراد میں اساسی اعتقاد کے مطابق زندگی اور اس کے تمام مسائل کے متعلق ایک خاص طرزِ فکر پیدا کرے جو ایسے انسان تیار کرے جو ملت کی عزت و بقاء ، استقلال ، ترقی اور اس کے بین الاقوامی پیغام کی توسیع کے لیے مستقل جدوجہد میں بھرپور حصہ لیں جن کا ایمان شکوک و شبہات کے سایوں میں الجھا ہوا نہ ہو ۔ بلکہ وہ اپنے اصولوں کو دنیا بھر کے سامنے پیش کرنے اور غالب کرنے کا ولولہ اور حوصلہ رکھتے ہوں وہ اسلامی نظامِ حیات میں روح بن کر کام کرنے والی اقدار کو پہچانتے ہوں ۔ مادی لحاظ سے ملت کو خوشحال اور مستحکم بنانے کے لیے مادی علوم کی ضرورت بھی مسلمہ ہے ۔ لیکن اس وقت ہمارے ملک میں جو مختلف نظامِ تعلیم رائج ہیں ۔ انہوں نے معاشرے کو کم از کم مولوی اور مسٹر کے دو طبقوں میں تقسیم کر رکھا ہے اور ہم ابھی تک ان دو طبقوں کے درمیانی بُعد کو دور نہیں کر سکے ۔

جامعہ محمدی ضلع جھنگ کی بنیاد ۱۹۳۱ء میں اس عزم کے ساتھ رکھی گئی تھی کہ مذہبی اداروں اور جدید نظامِ تعلیم کے تربیت یافتہ افراد میں بعد کی خلیج کو ختم کیا جائے اور اس مقصد کے لیے جامعہ نے اپنے زیرِ تحویل اداروں میں مذہب کے ساتھ ساتھ جدید علوم سکھائے اور تعلیمی کانفرنسوں کی سرپرستی کی پہلی تعلیمی کانفرنس " قرار دادِ پاکستان " کے منظور ہونے کے فوراً بعد ستمبر ۱۹۴۰ء میں جامعہ محمدی شریف

میں مولانا ظفر علی خان مرحوم کی قیادت میں منعقد ہوئی قیام پاکستان کے متصل بعد مارچ ۱۹۴۸ء میں چنیوٹ میں ملک بھر کے نمائندے ماہرین تعلیم اور علماء کرام کی کانفرنس میں طے پایا کہ ملک میں عصری علمی تقاضوں کے مطابق اعلیٰ معیاری، ملی اسلامی یونیورسٹی قائم کی جائے۔ ۱۹۵۷ء ۱۹۶۲ء میں جامعہ کی تعلیمی کانفرنسیں لاہور میں منعقد ہوئیں جن کا افتتاح بالترتیب اس وقت کے گورنر جناب اسماعیل چندریگر مرحوم اور سابق وزیر خارجہ جناب ذوالفقار علی بھٹو نے کیا۔ اس اثنا میں جامعہ نے اپنی پوری کوشش جامعہ کو اسلامی یونیورسٹی میں تبدیل کرنے پر مرکوز رکھی۔ لیکن یہ معاملہ انفرادی کوششوں کا نہیں بلکہ اس ادارے کا قیام حکومت کی مدد اور تعاون کا محتاج ہے چنانچہ ۱۹۶۲ء میں جامعہ کی طرف سے رائے منصب علی خاں ایم پی اے نے صوبائی اسمبلی میں "اسلامی یونیورسٹی محمدی شریف بل" پیش کیا۔ بل سیلکٹ کمیٹی کے زیر غور تھا کہ صوبائی اسمبلی کی میعاد ختم ہو گئی اب رائے منصب علی خاں صاحب دوبارہ اس بل کا نوٹس دے چکے ہیں اور بل وزارت قانون کے زیر غور ہے۔

آزاد اسلامی یونیورسٹی کا نظریہ کوئی نیا نہیں بلکہ قرون اولیٰ میں مسلمان علمی، مادی ترقیوں کی منتہیٰ پر تھے ان کے تمام عالمی ادارے آزاد تھے اور آج بھی بعض عالم گیر شہرت کی حامل یونیورسٹیاں اپنے نظام کار تعلیمی پالیسیوں اور نظام تعلیم میں آزادانہ کام کر رہی ہیں۔ آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیاں خودمختار ہیں اور مسلمان ممالک میں انڈونیشیا اور اردن اس پالیسی پر گامزن ہیں۔

ہم صدر پاکستان اور گورنر مغربی پاکستان سے عرض کریں گے کہ قوم کے ایک دیرینہ اور بنیادی ضرورت کی تکمیل کیلئے رائے منصب علی خاں ایم پی اے کے پیش کردہ اسلامی یونیورسٹی محمدی شریف بل کو شرف قبولیت بخشیں۔ ہم اس سلسلے میں صوبائی اسمبلی کے ممبران سے جو قوم کے جذبات کی ترجمانی اور ماشاء اللہ اپنی ذمہ داریوں سے بطریق احسن عہدہ برآ ہونے کی سعی کرتے ہیں۔ امید رکھتے ہیں کہ وہ اس بل کی منظوری میں جامعہ اور رائے منصب علی خاں سے پورا پورا تعاون کریں گے۔

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر

کرتے ہیں خطاب آخر اٹھتے ہیں حجاب آخر

نہ ہو نومید۔ نومیدی زوال علم وعرفاں ہے

امید مرد مومن ہے خدا کے رازدانوں میں

کوائفِ جامعہ

شیخ الجامعہ کا تقرر

جامعہ محمدی کا نصب العین "دین و دنیا" ہے اسی نقطۂ نظر سے "اسلامی یونیورسٹی" کے قیام کا تعلیمی منصوبہ خدام جامعہ کی مساعی کا مرکز بنا ہوا ہے۔ جامعہ کے مرتبہ نصاب تعلیم میں علوم عالیہ اسلامیہ کے ساتھ ساتھ مروجہ علوم و فنون کو شامل کیا گیا ہے۔ اس سے نصاب تعلیم کی تدریس کا اعلیٰ سطح پر اہتمام کیا گیا ہے۔

مولانا منظور حسین خاں صاحب نعمانی ایم اے اُردو۔ ایم۔ اے فارسی۔ ایم۔ اے فلاسفی درس نظامی کا تقرر بحیثیت شیخ الجامعہ کیا گیا ہے۔ جناب نعمانی صاحب اس سے قبل جامعہ کے انٹر کالج کے پرنسپل رہ چکے ہیں۔ آپ نے جامعہ کا نصاب تعلیم مرتب کیا جس کو ملک کی اہم علمی شخصیتوں نے بہت سراہا اور نظریۂ قیام پاکستان کی طرف اہم اقدام قرار دیا۔ علاوہ وازیں اس اہم شعبہ "دارالعلوم" میں مولانا حافظ محمد یوسف صاحب (بی۔ اے فاضل عربی، فاضل فارسی فارغ التحصیل درس نظامی) کا تقرر عمل میں لایا گیا۔

ڈگری کالج کا اجراء

کلیہ عربیہ اسلامیہ (انٹر کالج) کو اس سال بتوکل الٰہی ڈگری کالج کا درجہ دیا جا چکا ہے۔ اور تیرہویں جماعت کا داخلہ شروع ہے اس سال انٹرمیڈیٹ کا نتیجہ بفضلہ تعالیٰ شاندار رہا اور محمد مظہر اللہ نے وظیفہ حاصل کیا۔

پرنسپل کا تقرر

چودھری برکت علی صاحب شمیم ایم۔ اے کا تقرر بحیثیت پرنسپل کلیہ عربیہ اسلامیہ (ڈگری کالج) کیا گیا ہے موصوف اعلیٰ علمی اور انتظامی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ آپ محکمہ تعلیم میں تدریسی خدمات کے علاوہ مختلف دیگر مناصب پر فائز رہے اور مخلصانہ قومی خدمات آپ کی زندگی کا نصب العین رہا۔ موصوف اپنے تدریسی فرائض کے ساتھ ساتھ متعدد رسائل کے ادارتی فرائض اور اصلاحی انجمنوں کی سرپرستی فرماتے رہے۔ اسی مخلصانہ جذبۂ خدمت کے تحت آپ نے جامعہ محمدی شریف کے ساتھ مستقل رفاقت اختیار فرمائی۔

تعمیر مسجد

جامعہ محمدی کی وسیع جامع مسجد کی تعمیر بفضلہ تعالیٰ نہایت حسن تدبیر کے ساتھ تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے اس کی تعمیر پر مصارف کا تخمینہ پانچ لاکھ روپیہ ہے۔ تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپیہ کے خرچ سے مسجد کے شمالی اور جنوبی کمروں کی تعمیر ہو چکی ہے درمیانی وسیع ہال کی دیواریں

مکمل ہو چکی ہیں۔ چھت پر مصارف کا تخمینہ دس ہزار روپیہ ہے۔

گذشتہ دنوں مسجد کے فنڈز کی کمی کے باعث کام میں تعطل پیدا ہو گیا تھا تو نوابزادہ میاں محمد ذاکر قریشی اور ان کے عزیزوں نے سترہ ہزار روپیہ یکمشت مسجد کی تعمیر کے لیے عنایت فرمایا۔ جس سے تعمیر کے کام میں خاص تقویت حاصل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ موصوف کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ رب العزت نے مساجد کی تعمیر میں ہر ممکن حصہ لینا ہر مومن کا شعار قرار دیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے جنت کی بشارت دی ہے۔ امید ہے حساس صاحب دردِ مخیر توجہ فرما کر اس اہم ترین اور مبارک کارِ خیر میں زیادہ سے زیادہ حصہ لے کر اپنے لیے صدقہ جاریہ قائم کریں گے۔

افسر مال جھنگ جامعہ میں مورخہ ۲۵ ستمبر ۶۷ء کو چودھری امجد علی صاحب سی۔ ایس۔ پی ایڈمنسٹریٹر اوقاف جامعہ میں تشریف لا رہے تھے۔ چنیوٹ پہنچے مگر کسی ضروری سرکاری کام کی وجہ سے واپس لاہور تشریف لے گئے۔ دوبارہ اکتوبر کے دوسرے ہفتے میں جامعہ تشریف لائے۔ انہوں نے جامعہ کی کارگذاری کو سراہا اور پورے تعاون کا یقین دلایا

اس سے قبل افسر مال جھنگ ۲۵ ستمبر کو جامعہ میں تشریف لائے آپ کی آمد پر جامعہ کے طلبہ و عملہ کا اجلاس منعقد ہوا طلبہ نے متعدد زبانوں میں تقریریں کیں دار الرحمت کے دو طلبہ نے عربی زبان میں مکالمہ پیش کیا۔ معزز مہمان کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ آپ نے جامعہ کی تعلیمی سکیم کو بہت سراہا اور ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔

طبیہ کالج جامعہ میں عرصہ دراز سے طب اسلامی کی تدریس کا پروگرام پیش نظر تھا۔ بعض وجوہ کی بنا پر شروع نہ کیا جا سکا۔ اب توکل الٰہی ۲۳ اکتوبر ۱۹۶۷ء کو طبیہ کالج کی کلاسیں شروع کر دی گئی ہیں جس کی نگرانی کے لیے جامعہ کے دیرینہ مخلص رفیق حکیم عطا محمد صاحب قریشی نے اپنی اعزازی خدمات پیش کی ہیں۔

قبل ازیں طبی بورڈ کے متعدد ذمہ دار ارکان ۔۔ ۔۔ مثلاً حکیم نیر واسطی صاحب حکیم عبد المجید صاحب عتیقی۔ حکیم عبد المالک وغیرہم جامعہ میں تشریف لا کر موزونیت کا جائزہ لے چکے ہیں اور طبیہ کالج کے سلسلہ میں ہر ممکن تعاون کا وعدہ فرما چکے ہیں۔

زندگی کشت است و حاصل قوت است

شرح رمزِ حق و باطل قوت است (اقبالؒ)

جامع مسجد کی تعمیر

جامع محمدی کے صدر دروازے سے داخل ہوتے ہی ایک عظیم الشان (زیر تعمیر) عمارت دامن دل کھینچتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ عظمت اسلام کی آئینہ دار جامع مسجد ہے جو چھ کنال (۱۷۰×۱۷۵) میں تعمیر ہو رہی ہے اس کی تکمیل پہ ماہرین تعمیرات کے تخمینہ کے مطابق پانچ لاکھ (۵۰۰۰۰۰) روپیہ صرف ہوگا۔ مسجد کا ہال ۱۰۰×۴۴ فٹ ہے جس کی بلندی ۴۴ فٹ ہوگی۔ تین اطراف کی دیواریں چھت تک اٹھ چکی ہیں۔ ہال کے دونوں جانب ۴۴×۳۵ کمرے تعمیر ہو چکے ہیں اور وسیع صحن کے تینوں جانب دو منزلہ برآمدہ ہوگا جس کی بنیادیں بھری جا چکی ہیں اور دو سیڑھیوں والے ۱۵۵ فٹ کی بلندی کے مینار ہوں گے۔ مسجد کے ہال پر خوبصورت گنبد ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مسجد کی تعمیر حوصلہ افزا تدریج کے ساتھ تعمیر کے مراحل طے کر رہی ہے۔

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو مومن رضائے الٰہی کی خاطر مسجد کی تعمیر میں حصہ لے گا۔ اللہ تعالیٰ جنت میں اس کے لئے محل تعمیر فرمائیں گے۔ اس مسجد کی تعمیر میں الحاج میاں محمد صدیق ودھیان (کراچی) کا نام سر فہرست رہے گا کہ انھوں نے ایک لاکھ اینٹ مسجد کے لیے خرید کر دی جس سے اس کا آغاز ہوا تھا۔ بریگیڈیر فضل الرحمٰن کلو خان کا نام اس عظیم الشان اسلامی یادگار کے ساتھ ہمیشہ قائم رہے گا کہ انھوں نے اپنی مساعی جمیلہ سے مسجد کی خاطر کافی فنڈ جمع کیا اور ہر دم انہیں اس کا فکر دامن گیر رہتا ہے حال ہی میں الحاج میاں مظہر الحسن صاحب نے پانچ صد روپیہ مسجد کے شایان شان سنگ مرمر کا منبر بنوانے کے لئے دیا ہے۔ الحاج میاں کرم بخش (سرگودھا) کی مخلصانہ اعانت رب تعالیٰ کے ہاں مقبول ہوگی کہ انھوں نے مسجد کی خاطر بھٹہ کے لئے کوئلہ فراہم کرنے میں ہر ممکن اعانت فرمائی۔ ایس اے رحیم (نیشنل فینز لاہور) نے مسجد کی خاطر اپنی فرم کی طرف سے ۴ پنکھے عطا کئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جملہ معاونین کی اعانتیں منظور و قبول فرمائے۔ آپ بھی اس سعادت لازوال میں حصہ لے کر سفر آخرت کیلئے زاد راہ مہیا کریں۔

صدر تعمیر مسجد کمیٹی

جامعہ محمدی شریف (جھنگ)

اپیل

جامعہ محمدی ضلع جھنگ مغربی پاکستان کا اولین تعلیمی ادارہ ہے جس نے جدید عصری تقاضوں کے مطابق اپنے نصاب تعلیم میں اہم تبدیلیاں کر کے نظریۂ پاکستان کے مطابق از سر نو مرتب کیا اور اس علمی تحریک کو عوامی سطح پر اس قدر روشناس کرایا کہ آج ملک کے کونہ کونہ میں علوم دین و دنیا کے امتزاج کی صدائے بازگشت سنائی دے رہی ہے۔

جامعہ محمدی کے زیر اہتمام اس وقت دس تعلیمی، رفاہی اور اصلاحی شعبہ جات مصروف کار ہیں جامعہ کے شعبہ دار العلوم۔ مدرسہ الحفاظ اور دار الرحمت (یتیم خانہ) کے کم و بیش دو صد طلبہ کے قیام و طعام، کتب علاج ہر قسم کے مصارف کی کفالت جامعہ کے ذمہ ہے، کل تعلیمی شعبہ جات میں ۹۵۰ طلبہ زیر تعلیم ہیں۔

جامعہ کے سالانہ مصارف تقریباً دو لاکھ روپیہ ہیں جن کا بیشتر حصہ مخیر حضرات کی فراخدلانہ اعانت کا مرہون منت ہے۔ علاوہ ازیں جامعہ کی موجودہ عمارات ضرورت کے لحاظ سے بہت کم ہیں دار العلوم مدرسۃ الحفاظ کی تین شاخیں، ہائی سکول، کالج، دار الرحمت کے لیے تدریسی و اقامتی ضروریات کے لیے کم و بیش ۲۵ نئے کمروں کی ضرورت ہے۔ اہل خیر حضرات سے استدعا ہے کہ اس عظیم تعلیمی تحریک میں خصوصی حصہ لے کر سفر آخرت کے لیے زاد راہ مہیا فرمائیں۔

ہمدردان جامعہ کی سہولت کے لیے درجہ ذیل بنکوں میں جامعہ کا گرانٹ اکاؤنٹ کھولا جا چکا ہے۔

مسجد فنڈ ... مسلم کمرشل بنک لمیٹڈ جھنگ

جامعہ محمدی فنڈ ... آسٹریلیشیا بنک لمیٹڈ چنیوٹ، جھنگ، لائل پور، سرگودھا، لاہور اور کراچی مذکورہ بنکوں میں اپنے عطیات جمع فرمائیں یا براہ راست ناظم عمومی جامعہ محمدی کے نام دفتر میں بھیجیں۔

الداعی

ناظم عمومی جامعہ محمدی جھنگ

Regd. L. No.

Monthly AL-JAMIA

JAMIA MUHAMMADI (Distt. Jhang)